زوالِ حیدرآباد
کی اَن کہی داستان
اُمّتِ مسلمہ کا ایک دلخراش المیہ
از: مشتاق احمد خان
ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

زوالِ حیدرآباد

کی اَن کہی داستان

اُمّتِ مُسلمہ کا ایک دلخراش المیہ

از ـــــــ مشتاق احمد خان

طبع اول ــــــــــ جون ۱۹۸۶ء

تعداد ــــــــــ ۱۲۵۰

ناشر و مصنف ــــــــــ مشتاق احمد خان
فخر منزل ۱۰۸ ۔ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور

طابع ــــــــــ سید عبدالسلیم

مطبع ــــــــــ آفتاب عالم پریس
۱۳ ہسپتال روڈ لاہور

قیمت ــــــــــ پچھتر روپے

ملنے کا پتہ

ایس اے علیم اینڈ سنز ــــــــــ ۱۳ ہسپتال روڈ لاہور

زوال حیدر آباد کی ان کہی داستان

خاکۂ کتاب

انتساب

اُن جری مردوں اور غازیانِ اسلام کے نام جنہوں نے اپنے خُون اور پسینے سے دکن میں مسلم اقتدار کی راہ ہموار کی۔

اور

اُن اولیائے کرام کے نام جنہوں نے کُفرستانِ دکن میں اللہ کے دین کی شمع روشن کی۔ غارہائے ایلورا کی گھاٹیوں میں اذانیں دیں اور جنوبی ہند کے سب سے بڑے بُت خانے کی چھت پر خُلد آباد، کی بستی آباد کی جسمیں اللہ کے سینکڑوں نیک بندے آبدی نیند سو رہے ہیں۔

اور

نظام المُلک آصفجاہ اوّل کے نام جس نے مُغلیہ سلطنت کے بچے کُھچے اقتدار کو سمیٹ کر نربدا سے راس کُماری تک ایک متحدہ اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

اور

آصف سابع کے نام جسکے روشن دور میں مملکت آصفیہ نے ہمہ جہتی ترقی کی۔ علم و فضل کی ایک فرحت بخش فضا قائم ہوئی۔ جس نے قومی زبان کو وہ مقام اور مرتبہ عطا کیا جس سے وہ وطنِ عزیز پاکستان میں ابتک محروم ہے۔ جسکی معارف پروری سے ملک کا ہر قومی ادارہ فیضیاب ہُوا۔ جس نے پاکستان کے نازک لمحات میں اُس کی پکار پر لبیک کہا۔ مگر وہ بخیل کا بخیل ہی رہا۔ وہ غدار کہلایا اور ابتک کہلایا جاتا ہے۔ اُسی غدار کے نام جو حیدرآباد کے المیے کے کئی برس بعد تک اپنے نمائندے کو مسلسل اور واضح ہدایات دیتا رہا کہ آزادی کے موقف پر سختی سے ڈٹے رہو!

اور

اُن بیشمار مردوں۔ عورتوں کے نام جو ناکردہ گناہ ظُلم اور قتل و غارت کا نشانہ بنے۔ اُن بُڑھوں کے نام جو بھوک پیاس اور تشدد کی تاب نہ لاکر سِسک سِسک کر مر گئے۔ اُن نوجوانوں کے نام جو بلاوجہ گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ اُن ماؤں۔ بہنوں اور بیٹیوں کے نام جن کی لاشیں کنوؤں اور نہروں میں اُنکی عصمت اور ناموس کی شہادت دیتی تھیں۔ اُن معصوم بچوں کے نام جنکو

زوال حیدر آباد کی ان کہی کہانی کا راوی

کرپانوں اور نیزوں میں پرو دیا گیا۔

اور

آخر میں اس منفرد تہذیب و تمدن کے مرکز اور اسلامی طرز معاشرت کے گہوارے کے نام جسے حیدر آباد کہتے تھے۔

رہے نام اللہ کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے یہ کتاب کیوں لکھی

۱- حیدرآباد کے المیے کے بعد مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے۔ کہ آخر وہ کیا اسباب تھے جو اُمتِ مسلمہ کے اس المناک حادثے کا باعث بنے۔ یہ ایک طویل اور دلخراش داستان ہے جسے چند الفاظ میں یا احباب کی ایک دو نشستوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس بار بار پوچھے جانے والے سوال نے مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا۔ کہ مسلمانوں کے اس دوسرے غرناطے کے زوال کے عوامل اور محرکات کو پردہ خفا میں نہیں رہنا چاہیئے۔ برصغیر کی آزادی سے چند برس پہلے حیدرآباد کے معاشرے کا کیا رنگ تھا اور سیاسی حالات کیا رُخ اختیار کر رہے تھے اعلان آزادی کن وجوہ کی بنا پر کیا گیا اور اس موقف کو کامیاب بنانے کے لئے کیا سیاسی اور دفاعی تیاریاں اور عملی اقدامات کئے گئے۔ بیرون ملک حیدرآبادی سفارت خانوں نے اس موقف کی تشہیر اور اُسکے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کیا کردار ادا کیا۔ مملکت آصفیہ کی افواج کی میدان کارزار میں ناکامی کی کیا وجوہات تھیں اور پھر جب بھارتی استبداد نے مسلمانوں کی اس ساڑھے سات سو سالہ آزادی کا گلا گھونٹ دیا۔ تو حیدرآباد کے مسلمانوں پر کیا بیتی۔ سرزمین پاکستان میں حیدرآباد کے سفارت خانے نے اللغظمت اللہ کا پرچم اتنے برس کیسے بلند رکھا اور پھر اچانک اُسکا کیا حشر ہُوا۔ یہ سب ڈھکی چھپی باتیں ہیں اس طرح ہماری ملی تاریخ کے اس دور میں ایک طرح کا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جسے میں سمجھتا ہوں کہ اب پُر ہونا چاہیئے،

۲- میں نے اپنی کتاب کاروانِ حیات، میں حیدرآباد کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ مگر یہ ذکر واقعاتی اعتبار سے تشنہ ہے۔ اہل دانش کی نظر سے یہ بات چھُپی نہیں رہی چنانچہ کارواں حیات، کی تعارفی تقریب میں صدر جلسہ مرحوم جسٹس ایس۔ اے رحمٰن نے اپنے تبصرے میں بہت صحیح فرمایا کہ حیدرآباد کی حد تک مُصنف نے اپنا قلم روک کر لکھا ہے میں نے اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا۔ کہ میری کتاب المیہ حیدرآباد کی رُوداد نہیں ہے بلکہ وُہ شاہراہ حیات کے ایک مسافر کی داستان ہے جسکے سفر کا ایک پڑاؤ حیدرآباد بھی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اس میں حیدرآباد کا تفصیلی ذکر شاید بے موقع ہوتا۔ ایک اور سوال کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ حیدرآباد کے سقوط کے وقت بہت سی ایسی باتیں

تھیں جو قومی مفاد کے تحت بیان نہیں کی جا سکتی تھیں حُبّ الوطنی کا یہی تقاضا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہی جائے۔ جس سے سیاسی اُلجھاؤ یا بین الاقوامی پیچیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ اب جبکہ بہت سے ذمہ دار حضرات ان مصلحتوں کو نظر انداز کر کے بہت سی باتیں منظر عام پر لے آئے ہیں اور اس سانحہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گذر چکا ہے جب کہ کوئی راز کا واقعہ بھی راز نہیں رہتا۔ اس بات کا جواز پیدا ہو گیا ہے کہ اس المناک داستان کو اپنے علم اور واقفیت کی حد تک بلا کم وکاست بیان کر دیا جائے۔ مجھے اس بات کا بھی قوی احساس ہے۔ کہ جو تاریخی مواد میری تحویل میں ہے اگر اُسے محفوظ نہ کیا گیا تو وہ میرے بعد ضائع ہو جائے گا یا اس کی تشریح اور سیاق و سباق کی وضاحت ممکن نہ رہیگی۔ میری نظر میں یہ مواد ایک قومی امانت ہے۔ جسکی حفاظت اور اُس سے مناسب استفادہ ایک قومی فریضہ ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ جو بھی تاریخی مواد میری تحویل میں ہے یا وہ واقعات اور باتیں جو سفارتی فرائض کی وجہ سے میرے علم میں آئیں انہیں ترتیب دے کر تاریخ کے سپرد کر دیا جائے۔

۳- یہ کتاب تین حصّوں میں ہے، پہلے حصّے میں جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار اور اُنکے عروج و زوال اور سلطنت آصفیہ کے قیام کا ذکر ہے اُس کے بعد اُن محرکات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو ہمیں اُس راستہ پر لے گئے جو بالآخر حیدرآباد کی بربادی پر منتج ہوا۔ دوسرے حصّے میں بھارت سے سیاسی مذاکرات۔ حیدرآباد کے سفارت خانوں کا قیام اور اُنکی ذمہ داریوں کا ذکر ہے آخری حصّے میں سقوط حیدرآباد کا سانحہ۔ اقوام متحدہ میں اُسکا مقدمہ اور ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد حیدرآباد کے باسیوں پر کیا گذری اُس کی تفصیل درج ہے۔ اسکے علاوہ حیدرآباد کے مسئلہ میں پاکستان کا موقف۔ حیدرآباد کے مہاجرین کی آمد اور اُنکی آباد کاری۔ سقوط حیدرآباد کے بعد کراچی کے سفارت خانے کی ذمہ داریاں اور اُن واقعات کا ذکر ہے۔ جس کی وجہ سے وہ قبل از وقت اور اچانک ختم ہو گیا۔

۴- اس کتاب کو مرتب کرنے کا محرک چونکہ میری کتاب "کاروان حیات" پر عوامی ردعمل تھا اس لئے اس میں اکثر واقعات کا دہرایا جانا ناگزیر تھا البتہ ان میں تفصیلات کا رنگ بھر دیا گیا ہے۔ قارئین کو شاید بعض واقعات کو پڑھ کر یہ تاثر ہو۔ کہ اُنہیں بیان کرنے میں غیر ضروری تفاصیل میں چلا گیا ہوں۔ میری نظر میں یہ "غیر ضروری باتیں" اس لئے ضروری ہیں۔ کہ اگر میں ایسا نہ کرتا۔ تو اور بہت سے جواب طلب سوالات پیدا ہو جاتے میں نے ہر واقعہ سے متعلق اپنے علم اور واقفیت کی حد تک

سب پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ تاکہ کوئی بات تشنہ نہ رہ جائے۔

۱۵۔ میری خواہش ہے۔ کہ اس داستان کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہو۔ میں نے اُسے بیان کرنے میں سُنی سنائی باتوں اور زبان زدعام کہانیوں ... کا سہارا نہیں لیا۔ جہاں اس قسم کی کسی روایت کا ذکر ناگزیر سمجھا گیا اُس کی حقیقت کو ہر پہلو سے جانچنے کی کوشش کی گئی۔ تو یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ راوی معتبر ہے۔ اس کے ماخذ کی نشاندہی کرا دی گئی ہے، اس داستان کو قلمبند کرنے میں میری نظر سے بہت سی کتابیں اور دستاویزات گذری ہیں۔ اس کی تفصیل کتاب میں درج کر دی گئی ہے۔ اُن سے میں نے حسب ضرورت استفادہ کیا ہے جس کے لئے ان کے مصنفین کا میں تہ دل سے ممنون ہوں۔ اُن کی روایتوں سے مسئلے کے بہت سے پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ جہاں سرکاری کاغذات۔ مراسلات اور پیغامات کا ذکر ہے ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ قائداعظم اور نظام سے میری جو ملاقاتیں ہوئیں ان کا میں خود راوی ہوں۔ میں نے ہمیشہ سے ڈائری رکھنے کا التزام رکھا ہے ان ملاقاتوں کی روداد میری ڈائری میں درج شدہ یادداشتوں پر مبنی ہے اُن اکابر سے گفتگو کے اصل الفاظ تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس لئے ان ملاقاتوں میں جو کچھ کہا اور سُنا گیا اس کی صحت کا میں اپنے آپ کو ذمہ دار گردانتا ہوں جہاں میں نے کسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ مجھے اپنی سفارتی ذمہ داریوں کیوجہ سے حق پہنچتا ہے اُسے کسی کے خلاف پروپاگنڈا نہ سمجھا جائے۔ جو کچھ میرے قلم سے نکلا ہے۔ اُسے میں نے دل کو ٹٹول کر اور اس احساس کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ میں اب زندگی کے اُس دور میں ہوں جب مجھے عنقریب باری تعالےٰ کے حضور میں اپنے قول و فعل کا جواب دینا ہو گا اگر میری تحریر سے کسی سے ناانصافی ہوئی ہو تو مجھے اُس کی بھی جوابدہی کرنی ہو گی اگر کسی کے سیاسی کردار کا ذکر آیا ہے۔ تو یہ نہ سمجھیے۔ کہ معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر میں اپنے آپکو فروگزاشتوں سے بری سمجھتا ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ مجھ سے کہاں اور کس موقعہ پر غلطیاں ہوئی ہیں اور اپنے کام میں غلط آدمیوں پر اعتماد کر کے میں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ اپنی سوجھ بوجھ کی خامی کی وجہ سے میں اپنے عزیز وطن کے لئے وہ سب کچھ نہ کر سکا۔ جس کی کہ بجا طور سے مجھ سے توقع کی جا سکتی تھی۔

۱۶۔ بعض احباب نے مجھے مشورہ دیا تھا۔ کہ "میں گڑے مُردے نہ اکھیڑوں" اب اُن ناخوشگوار

گئی گزری باتوں کے ذکر سے کیا حاصل؟ اپنے ان احباب کے پرخلوص مشورہ پر میں نے اس لئے عمل نہیں کیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ کے عمل کو میرے یا کسی دوسرے کے راز کو چھپانے سے نہیں روکا جا سکتا۔ اگر ہر دور میں خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات کے بارے میں مورخین "گڑے مُردے اکھیڑنے والے" انداز میں سوچتے تو پھر تاریخ کیسے لکھی جاتی۔ تاریخ کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ وہ کسی حالت میں کسی کو معاف نہیں کرتا، چاہے وہ میں ہوں یا کوئی اور۔ سقوط حیدرآباد کے بعد جو بیتا مجھ پر پڑی اُس کو بیان کرنے میں اگر میں کہیں ذرا جذباتی ہو گیا ہوں۔ تو قابل معافی سمجھا جائے۔ کمزور انسان سے ایسی کمزوری کا اظہار عین فطرت ہے۔

۱۷۔ اس داستان میں جہاں بھارت کی چالبازیوں۔ سازشوں اور غلط بیانیوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہاں مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس آئینہ میں ہمیں اپنا چہرہ بھی بڑا ہی گھناؤنا اور بھیانک نظر آتا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے۔ کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ اگر واقعات حقائق پر مبنی نہ ہوں۔ تو وہ داستان گوئی تو ہو سکتی ہے۔ تاریخ نہیں رہتی۔ میں نے کوشش کی ہے۔ کہ داستان گوئی سے احتراز کرتے ہوئے حقائق بیان کر دوں۔ حیدرآباد مٹ گیا۔ وہ مشیت ایزدی تھی اور مکافات عمل بھی لیکن اسکی دلخراش داستان مملکت پاکستان کے لئے بھی ایک عبرت ہے۔ ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں، ان کا ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ہماری غلطیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے "من نہ کردم شما حذر بکنید" کے مقولے کے مطابق آپ اُن سے پرہیز کیجیے۔

۱۸۔ میری حیات مستعار کا یہ آخری دور ہے۔ اگر میں اس دستاویز کو اپنی زندگی میں مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو فبہا اگر مجھے ایسی مہلت نہ مل سکی۔ تو میں اپنے ورثا اور متعلقین سے توقع کرونگا۔ کہ وہ اس مسودے اور اس سے متعلقہ کاغذات کو ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن یا کسی اور مستند ادارے کو جسے تاریخی حقائق کو جانچنے اور پرکھنے میں دلچسپی ہو۔ حوالے کر دیئے جائیں تاکہ ملی تاریخ کے اس دور سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس سے استفادہ کا موقع مل سکے۔

وما علینا الا البلاغ

حصہ اوّل

پہلا باب

مملکت حیدرآباد

محل وقوع ۔ آبادی ۔ وسائل وغیرہ

حیدرآباد کا جب کبھی ذکر آتا ہے۔ تو عام طور پر پاکستان میں عام تاثر یہی ہے کہ ہندوستان کی بیشمار چھوٹی بڑی ریاستوں کی طرح وہ بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہوگی۔ جو انگریز ان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے معرض وجود میں آگئی تھی یا کوئی بڑی زمینداری ہوگی۔ پاکستان کیطرح دوسرے ممالک میں بھی یہ تاثر پایا جاتا ہے۔ جو حقائق سے بالکل خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حیدرآباد مالیر کوٹلہ۔ پٹیالہ یا کپورتھلہ جیسی ریاست نہیں بلکہ وہ ایک عظیم مملکت تھی۔ جو اپنے رقبے۔ وسائل اور آبادی کے لحاظ سے اقوام متحدہ کے رکن ممالک میں بہتوں سے مملکت کہلائے جانے کی زیادہ مستحق تھی۔ برّ اعظم ہند کے عرض البلاد ۱۵.۵۶ اور ۲۰.۴۰ شمالی اور طول البلاد ۷۴.۴۰ اور ۸۱.۰۵ مشرق کے مابین واقع اس مملکت کا رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل تھا یعنی انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ سے زیادہ تھا۔

آبادی اور اس کی تقسیم کل آبادی ۱۶۴۰۰۰۰۰ (ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ) کے لگ بھگ تھی جو مندرجہ ذیل عناصر پر مشتمل تھی۔

۱۔ ڈراوڈین پست اقوام (غیر آریہ)	۶۰ لاکھ	یہ بالکل غیر آرین تھے۔ اور شمالی ہندوستان کے برہمنوں سے اپنے آپکو بالکل الگ سمجھتے تھے
۲۔ ویراسوامی اور لنگائیت	۴۰ لاکھ	
۳۔ ہنود و برہمن	۲ ½ لاکھ	

۴۔ ہندو تلنگے و مرہٹے	۲۴ لاکھ	
۵۔ مسلمان	۳۰ لاکھ بشمول مہاجرین	
۶۔ متفرق عیسائی سکھ پارسی وغیرہ	۷ لاکھ	

ان اعداد سے واضح ہوگا۔ کہ نان برہمن طبقہ جو زیادہ تر پست اقوام پر مشتمل تھا کی اکثریت تھی اور ہندو برہمنوں کی آبادی قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی کہ مسلمانوں کی۔[۱]

وسائل مملکت حیدرآباد کی سالانہ آمدنی ۲۶ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔[۲] جنوبی ہندوستان کے دو بڑے دریا گوداوری اور کرشنا اس کے علاقے میں سے گذرتے تھے۔ دریائے گوداوری کی مملکت کے اندر ۴۰۰ میل کی مسافت تھی اس کے معاون پین گنگا اور وردھا شمال میں اور مانجرا اور مانیر جنوب میں تھے دریائے کرشنا ۴۰۰ میل کی مسافت طے کرتا تھا۔ بھیما۔ موسیٰ اور تنگبھدرا اُس کے معاون دریا تھے ان دریاؤں پر آبپاشی کے لئے بند باندھ کر بڑے بڑے آبی ذخائر تعمیر کئے گئے تھے جن میں نظام ساگر۔ حمایت ساگر۔ عثمان ساگر۔ علی ساگر بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ سنگارینی اور کوٹاگرام کی کوئلہ کی کانوں کے علاوہ حیدرآباد میں مختلف قسم کی معدنیات ملتی تھیں خام لوہے کے ذخائر بھی تھے ابرک ضلع ورنگل میں اور گریفائٹ ضلع کریم نگر میں۔ سیلو کا پتھر شاہ آباد میں اور سنگ مرمر کی چٹانیں ضلع ورنگل میں واقع تھیں۔ ضلع رائچور میں سونا بھی ملتا تھا۔ اناج کے معاملہ میں حیدرآباد بالکل خود کفیل تھا کپاس وہاں کی خاص پیداوار تھی جو ہندوستان کی کل پیداوار کی ۱۵ فیصدی تھی اسطرح روغنی اجناس کی پیداوار کا تناسب ہندوستان کی کل پیداوار کا ۴۰ فیصدی تھا۔

صنعتیں قدرتی وسائل کی فراوانی کیوجہ سے حیدرآباد میں چھوٹی بڑی صنعتیں قائم ہوگئی تھیں بودھن ضلع نظام آباد میں شکر سازی کا کارخانہ۔ سرپور (کاغذ نگر) میں کاغذ کی صنعت قائم ہوگئی تھی۔ سیمنٹ اور پارچہ بافی کے کئی کارخانے تھے انکے علاوہ کئی قسم کی گھریلو صنعتیں بھی کامیابی سے چل رہی تھیں۔ ذرائع حمل ونقل میں ضرورت کے مطابق توسیع ہوتی رہتی تھی ۷ ہزار میل سے زیادہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا اور حیدرآباد شہر کی سیمنٹ کی سڑکیں اپنی نفاست اور پائیداری کیوجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور تھیں۔

---

[۱] مملکت آصفیہ جلد اول صفحہ ۵
Hyderabad at a glance by a Dravidian Patriot published by Mr. Khawja Chakwal (Punjab)

[۲] بدر شکیب۔ حیدرآباد کا عروج و زوال صفحہ ۱۰۷۔

آخری دور میں ۴۰۰۰ میل لمبی ریل تھی۔ اور روڈ ٹرانسپورٹ کو ملک میں ایک قومی صنعت کی طرح استوار کرنے میں تمام ہندوستان پر برتری حاصل تھی۔ تمام مملکت میں روڈ ٹرانسپورٹ کو سرکاری ملکیت میں لے لیا گیا تھا حیدرآباد شہر میں ڈبل ڈیکر بسوں کی اجرائی ٹرانسپورٹ کے میدان میں ایک انقلابی اقدام تھا ریل اور ٹرانسپورٹ کی سواریوں میں ایک مربوط نظام کے تحت مکمل تعاون عمل کی صورت پیدا کر دی گئی تھی ریلوے کی آوٹ ایجنسیوں میں اور سامان کی باربرداری کی قومی سروس کے ذریعہ تجارتی مال واجناس کی نقل و حمل میں بڑی آسانیاں ہو گئی تھیں۔ محکمہ ریلوے کی ایک اضافی ذمہ داری دکن ایرویز کا انتظام بھی تھا۔ یہ ایک بہت کامیاب سروس تھی۔ جو بمبئی۔ مدراس۔ بنگلور۔ دہلی جیسے شہروں سے حیدرآباد کا فضائی رابطہ مہیا کرتی تھی۔

ڈاک کرنسی وغیرہ حیدرآباد کا اپنا ڈاک کا انتظام تھا۔ اسی طرح اسکی اپنی مخصوص کرنسی تھی اور قومی زبان میں نوٹ چھاپے جاتے تھے اور سکے بنانے کے لئے ایک بڑا ٹکسال بھی تھا۔ حیدرآباد کا اپنا قومی پرچم تھا جو قومی تہواروں کے موقعہ پر لہرایا جاتا تھا۔ اسکی اپنی فوج بھی تھی جو اپنی تعداد اور معیار کے اعتبار سے ہندوستان کے مقابلہ میں یقیناً کم تھی مگر پھر بھی ایک آزاد مملکت کا اہم تقاضہ پورا کرتی تھی اندرون ملک ٹیلیفون۔ اور لاسلکی رسل و رسائل کی سہولتیں بھی موجود تھیں۔

حیدرآباد کا انتظامی ڈھانچہ مملکت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ (۱) دیوانی کا علاقہ (۲) صرف خاص (۳) جاگیرات اور پائگاہ وغیرہ۔ دیوانی اصل ریاست کا علاقہ تھا۔ صرف خاص حضور نظام کی ملکیت تھی۔ پائگاہ۔ جاگیرات دستان کے علاقے اپنی وسعت کے اعتبار سے ہندوستان کی بہت سی ریاستوں سے بڑے تھے وہاں متعدد ہندو مسلمان جاگیریں ایسی تھیں جن کی آمدنی ۱۵ سے ۵۰ لاکھ سالانہ تھی اس سے کم وسعت اور کم آمدنی کے علاقے دار ہندوستان میں ہز ہائی نس کے لقب سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ ہز ہائی نس مہاراجہ اندور حیدرآباد کے ایک موضع کے موروثی پٹیل تھے۔ ہز ہائی نس سلطان سلطان پور کے ایک محدود مختار حکمران تھے، جنہیں برطانوی ہند میں توپوں کی سلامی ملتی تھی۔ لیکن حیدرآباد میں وہ نظم جمعیت (فوج بے قاعدہ) کے ایک جمعدار تھے اور امرا میں شمار ہوتے تھے اسی طرح راجہ میسور اور مہاراجہ بڑودہ حیدرآباد کے بعض مواضعات کے زمیندار تھے

---

۱ مرقع آصفی تالیف شدہ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ لاہور صفحہ ۲۱ سے ۳۲ حبیب اظہر اوج - دکن کا آخری شہریار۔
شائع شدہ جہاں نما مورخہ ۴ مارچ ۱۹۷۸ء

تعلیم مملکت حیدرآباد میں تعلیم عام ہے تقریباً چھ ہزار مدارس ہے جن میں ۶۵ ہزار مدارس کام کرتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام جسمیں قومی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک انقلابی اقدام تھا۔ جسے قومی زبان کو عروج اور مرتبہ عطا کیا جس کی کہ وہ بجا طور پر مستحق تھی

نظم و نسق نظم و نسق کا معیار برطانوی ہند سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ بلکہ بعض شعبوں میں بہتر تھا۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل الگ کرایا گیا تھا۔ عدلیہ آزاد اور معیاری تھی۔ شادی بیاہ، طلاق کے مقدمات دارالقضاء میں طے پائے تھے جس کا سربراہ صدر الصدور کہلاتا تھا۔ تمام مساجد کا انتظام حکومت کی ذمہ داری تھی۔ امور مذہبی کا محکمہ مذہبی نوعیت کے مسائل کو حل کرتا تھا۔

حصہ اوّل

دُوسرا باب

دکن میں مُسلمانوں کا وُرود

دریائے نربدا کے جنوب میں وِندھیاچل اور ست پُڑا کی گھنی چھتری کے نیچے کا علاقہ دکن یا دکشنا کے نام سے موسوم تھا۔ اِن پہاڑی سلسلوں اور اُن کی دُشوار گذار وادیوں نے اس علاقہ کو شمالی ہندوستان سے بالکل الگ تھلگ کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اُس کی تاریخ۔ رہن سہن اور معیشت شمالی ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ اُس کی تاریخ کا ابتدائی دور گمنامی میں پڑا ہُوا ہے۔ یوں بھی اُس کی قدیم تاریخ کا میرے موضُوع سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ برعظیم کے اس خطے میں مسلمانوں کا وُرُود ہی ہمارے موضُوع سے قریب ہے۔ مسلمان اِس علاقے میں علاؤالدّین خلجی کے زمانے میں داخل ہوئے ۱۲۹۴ء میں دکن پر اُس کے حملے کے وقت تین خود مختار سلطنتیں قائم تھیں مہاراشٹر۔ کرناٹک اور تلنگانہ ۱۵-۱۶ برس کے عرصے میں علاؤالدّین خلجی نے اوّل الذکر دو سلطنتوں کو یکے بعد دیگرے زیر کر لیا اور یوُں دکن میں اِسلامی دَور کی ابتداء ہوئی۔ تغلق خاندان کے عہد میں تلنگانہ کی سلطنت جس کا دارالخلافہ ورنگل تھا پر بھی قبضہ ہوگیا اور مالابار تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آگیا اِن علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے محمد تغلق نے دیوگری (دولت آباد) کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہ اقدام سیاسی اعتبار سے بالکل ناکام ہوگیا مگر دہلی سے ہجرت کرنے والی کچھ آبادی اس علاقے میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئی محمد تغلق کے بعد جنوبی ہند میں اُس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

بہمنی دور

اس وقت تک اس علاقے میں مُسلمانوں کی اتنی آبادی ہوگئی تھی

کہ انہوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی ایک نئی سلطنت قائم کر لی۔ دو سال کے عرصے میں علاؤالدّین حسن گنگو بہمنی ایک ایرانی نژاد نوجوان نے اقتدار سنبھال کر گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ یہ سلطنت چار صوبوں برار، بیدر۔ دولت آباد اور گلبرگہ پر مشتمل تھی شمال میں برار مشرق میں تلنگا اور جنوب مغرب میں دریائے کرشنا اور سمندر تک پھیل گئی تھی۔ بہمنی سلطنت ۱۵۲۵ء یعنی قریب دو سو سال قائم رہی اور ہر شعبہ زندگی میں ہمہ جہتی ترقی کی۔ اِس دَور میں محمود گاوان جیسے مُدبّر سیاستدان نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کے گہرے نقوش چھوڑے۔

بہمنی سلطنت کے حِصّے بخرے

بہمنی سلطنت کے آخری دَور میں اُس کی کمزوری کی وجہ سے وجیانگر کی ہندو سلطنت نے اپنے آپ کو مستحکم کر لیا اور اُس کے لئے ایک خطرہ بن گئی۔ بالآخر جب اُس میں اتنا اضمحلال پیدا ہو گیا۔ کہ اُس کے پانچ صوبے برار۔ بیدر۔ احمدنگر۔ بیجاپور۔ گولکنڈہ علی الترتیب عماد شاہی برید شاہی۔ نظام شاہی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی کے نام سے خود مختار سلطنتیں بن گئیں ان کی آپس کی ریشہ دوانیوں اور رقابت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وجیانگر نے اُن پر بھرپور حملہ کر دیا۔ خوش قسمتی سے مُشترکہ غنیم کے خلاف اِن سلطنتوں میں عارضی طور پر اتحاد ہو گیا اور تالیکوٹہ کے مشہور معرکے میں ہندو عزائم ایسے ناکام ہوئے کہ مرہٹوں کے عرُوج تک انہیں مسلمانوں کی طرف نظر اٹھانے کی جراُت نہیں ہوئی۔ تالیکوٹہ کے معرکے کے بعد ان میں پھر اتنے اختلافات پیدا ہو گئے کہ مُغلوں نے انہیں ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب کے دَور میں قُطب شاہی حکومت کا خاتمہ ہُوا اور سارا دکن مُغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

میر قمرالدین خان نظام الملک

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اُس کے نااہل جانشینوں کے آپس کے جھگڑوں اور خانہ جنگی کی وجہ سے مُغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور پڑ گئیں۔ گولکنڈے کے محاصرے میں مُغلیہ فوج کے کمانڈر ایک تورانی بزرگ خواجہ عابد تھے۔ جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے اورنگ زیب کے دربار میں

آتنا رسوخ حاصل کر لیا تھا کہ وہ شاہی انعامات سے نوازے گئے اور قلیچ خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے اُن کے بعد بیٹے غازی الدین فیروز جنگ اور پھر پوتے قمرالدین خان نظام الملک نے بھی دربارشاہی میں اعلیٰ مدارج حاصل کئے۔ قمرالدین خان نظام الملک کو پہلے بیجاپور اور پھر دکن کی صوبہ داری پر بھیجا گیا۔ اپنی سیاسی سُوجھ بُوجھ اور معاملہ فہمی کی وجہ سے وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس لئے انہیں دربار کے اندرونی حالات کو سدھارنے کے لئے کئی بار طلب کیا گیا۔ چنانچہ نادرشاہ کے حملے کے موقعہ پر انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

سلطنت آصفیہ کا قیام

نادرشاہ کی واپسی کے بعد مغلیہ دربار کا اندرونی خلفشار جاری رہا۔ ناسازگار حالات کو دیکھ کر نظام الملک نے شاہی دربار سے علیحدگی اختیار کرنا مناسب خیال کیا اور پھر دکن کی صوبہ داری پر چلے گئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ انہوں نے سوائے نام کے ہر لحاظ سے دکن کو مرکز سے علیحدہ کر کے خود مختار سلطنت کی شکل دے دی۔ اگر وہ علی الاعلان اپنی خودمختاری کا دعویٰ کر دیتے تو مرکزی حکومت میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کوئی مزاحمت کر سکتی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اُس کی وجہ اُن کا تدبر اور سیاسی پیش بینی تھی۔ خود مختاری کے اعلان نہ کرنے سے انہیں کئی فوائد حاصل ہوئے جس کی وجہ سے انہیں اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں بڑی مدد ملی۔ پہلا فائدہ تو یہ تھا کہ ناسازگار حالات میں اپنے بادشاہ سے وفاداری کا رشتہ قائم رکھنے سے وہ ہندو مسلمانوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے یہ جذبہ مملکت کے استحکام میں ایک بڑی قوت بن گیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہُوا کہ اعلان آزادی نہ کرنے سے وہ اُن بے شمار مُشکلات اور سیاسی رقابتوں اور مخالفتوں سے بچ گئے جن سے بصورت دیگر انہیں مقابلہ کرنا پڑتا۔ یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ آصفیہ خاندان کا حکمران وقت جب اورنگ زیب عالمگیر کے مقبرے پر حاضری دیتا تھا تو اُسے صوبہ دار دکن کہہ کر خطاب کیا جاتا تھا۔ ایک موقعہ پر یہ رسم میں نے خود بچشم خود دیکھی ہے آصف جاہ اوّل کا انتقال ۱۷۴۸ء میں ہُوا۔ اُس وقت اُنکی سلطنت نربدا سے ترچناپلی تک

دکن کی سیاسی تاریخ۔ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تک اور کوکن سے مدراس تک پھیلی ہوئی تھی۔

آصفجاہ اوّل کے جانشینوں میں خانہ جنگی

آصف جاہ اوّل کے انتقال کے بعد اُن کے جانشینوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ غازی الدین فیروز جنگ اُن کے بڑے بیٹے دہلی میں تھے انہوں نے مُغلیہ دربار سے صوبہ داری دکن کی سند حاصل کر لی لیکن دوسرے بیٹے ناصر جنگ نے جن کے پاس فوج کا کنٹرول تھا اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ ناصر جنگ کی جانشینی کے دعویٰ کو اُنکے بھانجے مظفر جنگ نے چیلنج کیا اُس وقت انگریز اور فرانسیسی اپنے اثر ورسوخ بڑھانے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور دخل در معقولات کیا کرتے تھے اُنہوں نے یہ موقعہ غنیمت جانا۔ ناصر جنگ کے دعوے کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی اور مظفر جنگ کو فرانسیسوں کی۔ اُنہوں نے اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے بہت سی مراعات بھی حاصل کر لیں۔ مگر جانبین کا وہی حشر ہوا جو ایسے حالات میں ہُوا کرتا ہے۔ یعنی پہلے ناصر جنگ مارے گئے اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد مظفر جنگ بھی ختم ہو گئے اُس کے بعد صلابت جنگ نے اقتدار حاصل کیا اِس زمانہ میں بھی فرانسیسوں اور انگریزوں کی سازشیں جاری رہیں اسی کھینچا تانی میں صلابت جنگ کے چھوٹے بھائی نظام علی خان اقتدار کا مُہرہ بن کر سامنے آئے اور ۱۷۶۳ء میں اپنے بھائی کو معزول کر کے قتل کر دیا۔ اور خود آصف جاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہو گئے۔ یہ بات وضاحت طلب ہے۔ کہ ناصر جنگ۔ مظفر جنگ اور صلابت جنگ کو تاریخ میں نظام الملک آصف جاہ کا جانشین کیوں تسلیم نہیں کیا گیا اور نظام علی آصف جاہ خامس کے بجائے آصفجاہ ثانی کیوں سمجھے گئے۔

نظام علی خان اور اُنکے جانشین

نظام علی خان ۴۲ برس تک حکمران رہے۔ اُن کا بڑا ہنگامہ خیز دور تھا صلابت جنگ کے بعد فرانسیسوں کا ستارہ کچھ گردش میں آ گیا اور اُن کے حریف انگریزوں نے اُن کی جگہ سنبھال لی۔ اقتدار کی ہوس نے انہیں نظام علی خاں اور اُن کے جانشینوں کے ہر دور میں

مختلف انداز اور بہانوں سے مملکت آصفیہ کو کمزور بنانے میں اثر انداز ہوتی رہی نظام علی خان کے بعد یکے بعد دیگرے سکندر جاہ - ناصر الدولہ - افضل الدولہ - محبوب علیخان اور عثمان علی خان سریر آرائے سلطنت ہوئے انگریزوں کی چھینا جھپٹی کبھی دوستانہ اور حلیفانہ تعلقات کے پردے میں اور کبھی کھُلم کھُلا دھمکیوں سے ان تمام ادوار میں برابر جاری رہی - عثمان علی خان آصف سابع نے اپنے دور میں کچھ مزاحمت کی۔ اور اُن کی خوش دلی حاصل کرنے کے لئے نازک لمحات میں فراخدلی سے اُن کی مدد بھی کی - مگر جب عثمان علی خان کو اُن کے تعاون اور مدد کی ضرورت پڑی تو اس بے وفا قوم نے سب معاہدوں اور یقین دہانیوں کو بالائے طاق رکھ کر نا قابل یقین بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ اور اپنی منافقانہ پالیسی سے بھارت کو موقعہ دیا کہ وہ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر چڑھ دوڑے اور اُس کا خاتمہ کر دے۔ اگلے باب میں انگریزوں کی سازشوں کا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

حصہ اوّل

تیسرا باب

انگریزوں کی چیرہ دستیوں کی داستان

بیرونی تجارتی کمپنیاں

مُغلیہ دور میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تجارتی کمپنیوں نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں کسی نہ کسی بہانے سے اپنے ادارے قائم کر لئے تھے اور بھولے بادشاہوں اور اُنکے سازشی درباریوں کی خوشامد کر کے اور لالچ دے کر بہت سی تجارتی مراعات بھی حاصل کر لی تھیں۔ مُغلیہ سلطنت میں انتشار - افراتفری اور زوال پذیر حالات سے فائدہ اُٹھا کر ان بیرونی کمپنیوں نے سیاست میں بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ اُن کا طریق کار وہی پرانا حربہ تھا کہ ایک فریق کو دوسرے سے لگائی بجھائی کر کے لڑاؤ اور اپنا اُلّو سیدھا کرو۔ دکن میں نظام الملک آصفجاہ اول کے زمانے ہی میں اُن کے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات اُستوار ہو چکے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اقتدار کے حصُول کے لئے خانہ جنگی میں انگریز اور فرانسیسی دونوں بڑی طرح ملوّث ہو گئے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ناصر جنگ کی انگریزوں نے حمایت کی۔ اور مظفر جنگ کی فرانسیسیوں نے صلابت جنگ کے عہدِ حکومت میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی چپقلش کے نتیجہ میں صلابتِ جنگ کو مچھلی بندر اور نظام پٹن سے ہاتھ دھونے پڑے اُنکے عوض انگریزوں نے فوجی امداد کا وعدہ کیا۔ جس کے بعد فرانسیسیوں کا اثر و رسُوخ ختم ہو گیا۔

نظام علی خان آصف جاہ ثانی

نظام علی خان کے دور میں انگریزوں نے شہنشاہ دہلی سے بالا بالا ہی جب شمالی سرکار کی سند حاصل کر لی۔ تو اُن کی اس حرکت پر نظام علی خان بہت برافروختہ ہوئے - لیکن پھر ۱۷۶۶ء میں انہوں نے ایک نئے مُعاہدے سے اس سند کی توثیق کر دی اور راجا مندری - سیکا کول - مصطفےٰ نگر اور ایلور کے علاقہ جات سات لاکھ خراج کے عوض انگریزوں کے حوالے کر دیئے گئے - جنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بوقت ضرورت فوجی امداد مہیا

کریں گے جسکے اخراجات کی ادائگی خراج کی مقررہ رقم میں سے ہوگی۔ یہ پیشکش اس شاطر قوم کی نظام کو اپنے جال میں پھنسانے کی پہلی کوشش تھی معاہدے ہوتے ہی انگریزوں نے اپنے روایتی انداز میں اُسکی خلاف ورزی شروع کردی۔ اور جو فوج اس معاہدے کے تحت متعین کی گئی تھی۔ اُسے حیدر علی کے خلاف اور اپنے مقبوضات کی حفاظت کے لئے واپس بلالیا۔ اس طرح نظام علی خان اور انگریزوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی، اور انہوں نے حیدر علی سے راہ رسم بڑھانی شروع کردی۔

انگریزوں کو حیدر علی سے نظام علی خان کا قرب پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اپنے ایک پٹھو محمد علی والی کرناٹک کے واسطے سے کچھ ایسی چال چلی کہ نظام کا حیدر علی کے خلاف انگریزوں اور پیشوا سے معاہدہ ہوگیا۔ جسکی قیمت کرناٹک کے علاقہ کی شکل میں دینی پڑی۔ اس طرح گنٹور کا علاقہ بھی انگریزوں نے ہتھیا لیا۔ سات لاکھ کے خراج کے عوض انہوں نے نظام سے ایک ایسی فوج مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ جسکی اہم شرط یہ تھی۔ کہ وہ اُن حکومتوں کے خلاف استعمال نہیں کیا جائیگی جن کی انگریزوں سے دوستی ہو۔ یہی Subsidiary alliance کی ابتدا تھی۔ جس نے بالآخر یہی نواب ارکاٹ اور پیشوا مملکت آصفیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس معاہدہ کا واحد مقصد ٹیپو سلطان کے خلاف محاذ آرائی تھا لیکن پھر بھی جب کبھی فوجی مدد کی ضرورت پڑی تو کسی نہ کسی بہانے سے گریز کیا گیا۔ نظام علی خان نے تنگ آکر فرانسیسیوں کی مدد سے فوجی دستے بنانے شروع کردیئے مگر اتنے میں مرہٹوں سے جنگ چھڑ گئی اور نظام کو کھرولہ کے مقام پر شکست ہوئی۔ یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ کہ نظام اور ٹیپو سلطان میں صلح ہوجاتی۔ مگر انگریزوں نے پھر ایک چال چلی اور نظام اور ٹیپو سلطان میں کرنول کا جھگڑا کھڑا کردیا۔ جس سے نظام انگریزوں کے جال میں پھر پھنس گیا ایک اور معاہدہ ہوا جس سے میثاقی فوج Subsidiary force. مستقل کردی گئی۔ فرانسیسی دستوں کو ختم کردیا گیا اور فوجی مشیر رخصت کردیئے گئے۔ نظام علی خان کے دور میں بلاشبہ یہ انگریزوں کی حکمت عملی کی بڑی کامیابی تھی۔ اسی معاہدے کے تحت ٹیپو سلطان کے خلاف ۱۷۹۹ء میں نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد مال غنیمت میں نظام کو بلاری اور کڑپا کے علاقے ملے۔ مگر انگریز یہ بات کیسے پسند کرتے کہ اُنکے مفتوحہ علاقے میں سے کسی کو حصہ ملے۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء کے معاہدے کے تحت یہ علاقے پھر انگریزوں کے حوالے کردیئے گئے اور یہ طے پایا۔ کہ انگریزوں کی رضامندی کے بغیر نظام کسی بیرونی طاقت کے ساتھ معاہدہ نہیں کرینگے اور انگریز حیدر آباد کے داخلی معاملات میں

دخل نہیں دیں گے۔ معاہدہ کی یہ شق حیدر آباد کی خارجی آزادی پر ایک مہلک ضرب تھی۔ داخلی آزادی بھی ان کی چالبازیوں سے متاثر ہوتی رہتی تھی چنانچہ ۱۷۷۹ء ریزیڈنٹ کا تقرر ہوا۔ جسکا بظاہر مقصد یہی تھا کہ وہ حکمرانوں کی داخلی پالیسیوں پر نظر رکھے اگرچہ اُن اور ریزیڈنٹ کے مابین ظاہری تعلقات میں نمائشی رکھ رکھاؤ نظر آتا تھا ناصر الدولہ کے اقتدار تک نظام اپنے آپ کو "مابدولت اور گورنر جنرل کو نیاز مند" لکھتے تھے اور جو ریزیڈنٹ پہلی بار آتا تھا وہ ہاتھی گھوڑے عماری اور تحفے لیکر آتا تھا۔ ریزیڈنٹوں کو حشمت جنگ، ثابت جنگ، اور دولہ اور جنگ جیسے خطابات دیئے جاتے تھے جس کو وہ اپنے لئے سرمایۂ ناز سمجھتے تھے۔

سکندر جاہ کا دور

خارجی آزادی تو ختم ہی ہوچکی تھی[1]۔ اس دور میں اندرونی معاملات میں کھلم کھلا مداخلت شروع ہوگئی۔ چنانچہ میر عالم کو وزارت پر لانے اور چندو لعل کو پیشکار مقرر کروانے میں اُن کا ہاتھ تھا۔ ریاست کی مالی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ نظم ونسق کے اخراجات کی پابجائی کے لئے ساہوکاروں سے قرضے لینے پڑتے تھے انگریزوں نے اسی مقصد کے لئے ایک انگریز ساہوکار کمپنی ولیم پامر اینڈ کمپنی کو نظام پر مسلط کردیا۔ اس کمپنی کے قرضے کی ادائگی شمالی سرکار کے خراج کی رقم سے کی گئی۔ سب سے بڑا غضب یہ ہوا۔ کہ ریزیڈنٹ اور چندو لعل کی سازش سے اندرونی خلفشار کی روک تھام کے بہانے سے ایک اضافی فوج کا دستہ قائم کیا گیا حالانکہ یہ ذمہ داری پہلے معاہدوں کی رو سے برطانوی حکومت کی تھی۔

ناصر الدولہ کا دور

اُنہوں نے اُن برطانوی افسروں کو جو حکومت حیدر آباد پر مسلط کردیئے تھے رخصت کردیا۔ مگر انگریزوں نے سراج الملک جسے نظام پسند نہیں کرتے تھے وزیر بنانے پر اصرار کیا نظام نے انکار کیا تو قرضوں کی ادائیگی کے لئے دباؤ ڈالا جانے لگا بالآخر سراج الملک کو وزیر بنانا پڑا۔ قرضوں کی ادائیگی کے بہانے میثاقی فوج میں اضافہ کردیا گیا جس کے اخراجات کی پابجائی کے لئے برار اور ثولا پور تک کے سرحدی علاقے انگریزی حکومت کے حوالے کردینے پڑے اس معاہدے کے لئے ہر قسم کی دھمکیاں اور دباؤ کو جائز سمجھا گیا۔ اس ناجائز کارروائی کے باوجود جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں پر بپتا پڑی تو یہی نظام تھا جس نے اپنے ظالم حلیف کی ہر طرح امداد کی۔

[1] مشاہدات از ہوش یار جنگ صفحہ ۲۰۱۔ بدر شکیب۔ حیدر آباد کا عروج وزوال صفحہ ۴۷

افضل الدولہ کا دور اس دور میں سالار جنگ اول نے برار کے تفویض کئے جانے پر اپنے خاندان کی بدنامی کا داغ دھونے کی کوشش کی۔ اس مطالبے پر اس احسان فراموش قوم نے اس شخص کے خلاف بھی معاندانہ کارروائیوں سے گریز نہیں کیا جس کی کوشش سے ۱۸۵۷ء کے فسادات کی آگ حیدرآباد تک پہنچنے نہیں پائی۔

میر محبوب علی خان کا دور میر محبوب علی خان تین برس کے تھے جب ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کا انتقال ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں حکمران کے پورے اختیارات سنبھالے۔

اس وقت سرحد پر شورش کا خطرہ تھا انہوں نے بطیب خاطر تین برس کے لئے سرحد کے دفاع کے لئے تین لاکھ سالانہ کی امداد دی۔ برار کے بارے میں کئی برس تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن نے یہ تجویز پیش کی کہ ۲۵ لاکھ سالانہ خراج کے عوض برار کا دوامی پٹہ برطانوی حکومت کو دیدیا جائے محبوب علی خان نے مزاحمت کی۔ مگر دھمکیوں دھونس اور دباؤ کے تحت وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ اس طرح آصف جاہ کے انتقال سے محبوب علی خان کے دور حکومت تک انگریزوں کی چیرہ دستوں کی وجہ سے مملکت آصفیہ کی حدیں جس بری طرح سکڑ گئیں وہ منسلکہ نقشہ سے واضح ہوگا۔

میر عثمان علی خان آصف سابع ۱۹۱۱ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے اس وقت یورپ میں جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے، تھوڑے عرصے میں جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ نظام نے پرانی تلخیوں اور وعدہ خلافیوں کو نظر انداز کر کے حکومت برطانیہ کی ہر طرح کی مالی اور اخلاقی امداد کی اور اس کے لئے مسلمانوں میں اپنے اثر و رسوخ کو پوری طور پر استعمال کیا۔ مالی امداد کتنی دی گئی اس کے اعداد و شمار میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ مگر عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے، کہ خالص امداد ۴ کروڑ تھی اور ۲ کروڑ جنگی قرضے کی شکل میں تھی ——— اس کے علاوہ نظام نے اپنی جیب خاص سے ۲ کروڑ کی امداد دی تھی۔ اس کا اعتراف ہز اگزالٹڈ ہائینس اور یار وفادار سلطنت برطانیہ کے بھاری بھرکم خطابوں سے کیا گیا لیکن ابتک جو زیادتیاں ہوئی تھیں اُن کی تلافی نہیں کی گئی جنگ عظیم کے بعد برطانوی حکومت بڑی مشکلات میں گھری ہوئی تھی جب یہ دور ختم ہوا۔ تو ۱۹۲۳ء میں برار کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا اور لارڈ ریڈنگ کو ایک یادداشت بھیجی گئی جس نے اپنے جواب میں علی الاعلان اقتدار اعلیٰ کا نظریہ مستط کر دیا انہوں نے اس تصور کو بھی غلط قرار دیا کہ حکومت

D.F.Karaka The Fabulous Moghul 1.
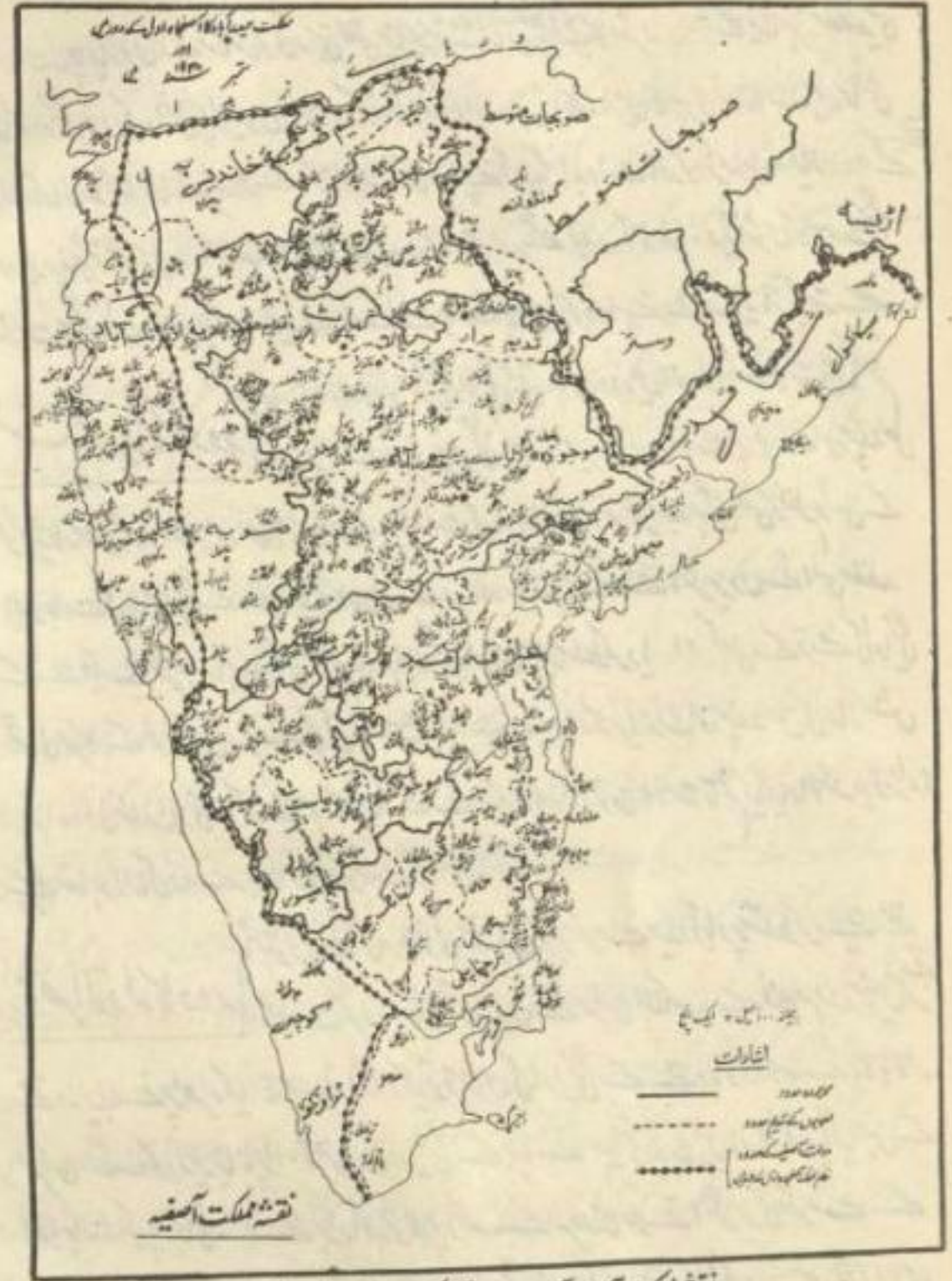
نقشہ مملکت آصفیہ آصف جاہ اول کے دور میں اور ستمبر ۱۹۴۸ء میں

سلطان العلوم میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع

برطانیہ اور نظام مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور ان مسائل پر مساویانہ حیثیت سے بات چیت کر سکتے ہیں اور صاف طور سے کہا کہ برطانوی حکومت کو جو بالادستی حاصل ہے وہ از روئے معاہدات نہیں بلکہ از روئے فرمانروائی ہے۔ اس کے بعد حیدرآباد کے ولیعہد کو پرنس آن برار کا خطاب دے کر آنسو پونچھنے کی کوشش کی گئی۔ جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء میں نظام نے پھر ہر قسم کی مالی اور فوجی امداد دی برطانیہ نے اپنے "یار وفادار" کو اس خوشدلانہ مدد کے صلے میں "رائل وکٹوریا چین" کی سنہری زنجیر میں جکڑ دیا۔ مگر اصل مسئلے کو ٹالتے رہے۔ اس کے بعد اس کی طرف سے کسی تعاون کی اُمید رکھنا بڑی زبردست خوش فہمی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کا برار سمیت جو حشر ہوا۔ وہ اس بے وفا قوم کی وعدہ خلافیوں اور بدعہدی کا نقطۂ عروج تھا۔ اس کا ذکر اگلے صفحات میں آئیگا۔

حصہ اوّل

چوتھا باب

سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے حیدرآباد کے سیاسی حالات

فرقہ وارانہ یکجہتی

مملکت حیدرآباد ہندو و مسلمان بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ یکجہتی کا ایک مثالی نمونہ تھا یہ خوشگوار صورت حال برسوں سے اسی طرح چلی آرہی تھی۔ مسلمان بادشاہوں کی وجہ سے سیاسی اقتدار مسلمانوں کے پاس تھا۔ اُن کا ذریعہ معاش زیادہ تر سرکاری ملازمت اور جاگیرداری تھی۔ لیکن تجارت، صنعت و حرفت اور مالی نظام سب اکثریت کے ہاتھ میں تھا جسکی آبادی کا تناسب ۸۵ فیصدی تھا۔ دیہاتی معاشی زندگی میں ہندو چھائے ہوئے تھے۔ حکومت کے اکابر میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر کے وقت بھی اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا حکومت کے ہر دور میں ہندو بڑی بڑی جاگیروں اور خطابات سے نوازے جاتے رہے۔ چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت محبوب علی خان اور عثمان علی خان دونوں کے دورِ حکومت میں ملک کے سربراہ تھے دونوں فرقوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں لباس، رہن سہن کے طریقوں، سوچ و فکر کے انداز اور حکمران سے جذبہ وفاداری میں حیرت انگیز یکسانیت تھی وہ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں خوشدلی سے شریک ہوتے تھے اور آپس میں رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ اسی لئے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے برعکس وہاں فرقہ وارانہ تلخیاں نہیں تھیں اور امن و آشتی کا دور دورہ تھا۔

ہندوؤں میں سیاسی شورش کا آغاز

ہندوستان کے چند صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت جب کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو انکی شہ پا کر بیرون ملک کی فرقہ وارانہ تنظیموں کے اکسانے پر حیدرآباد میں آریہ سماج تحریک نے جنم لیا۔ اس سے پہلے ضلع بیدر کے ایک قصبہ اودگیر میں ہندوؤں کی ایک تنظیم قائم ہو چکی تھی، جس کے قیام کا واحد مقصد سماجی اور فلاحی بتایا جاتا تھا۔ مگر وقت گذرنے[1] کے ساتھ دونوں فرقوں میں تنازعہ پیدا کرنا اور حکومت کے خلاف شورش پھیلانا اس نے اپنا پروگرام بنا لیا۔ مقامی لوگ جو برسوں سے

[1] حیدرآباد میں رضا کار تحریک ... مصنفہ محمود ... [illegible]

رواداری اور یگانگت کی فضا میں بس رہے تھے اندرون ملک میں باہر سے درآمد کئے ہوئے جراثیم سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے یوں بھی برطانوی ہند کے مسائل کی مقامی آبادی کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اس لئے بیرون ملک میں انتہائی مخالفانہ پروپاگنڈے کے باوجود شورش اور فساد کا اتنا امکان نہیں تھا۔ جتنا کہ باہر کی شورش پسند سیاسی تنظیمیں چاہتی تھیں۔ اس لئے مقامی شورش پسندوں کو سہارا دینے کے لئے باہر سے جتھے تیار کئے گئے۔ اور اُنکے ذریعے حکومت اور مسلمانوں کے خلاف تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سٹیٹ کانگریس ہندو مہا سبھا اور آریہ سماجیوں کے مشترکہ محاذ نے ستیاگرہ کا آغاز ہندوؤں پر مظالم کی فرضی داستانوں سے کیا۔ حکومت نے چشم پوشی اور درگزر کی پالیسی سے کام لیا۔ جس کی وجہ سے حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ مگر چونکہ مقامی تائید حاصل نہیں تھی، اس لئے یہ تخریبی کارروائی وقتی طور پر دب گئی۔ مگر فرقہ واریت کا زہر جو اس نے پھیلانا چاہا وہ سیاسی جسم میں برابر سرائت کرتا رہا۔ دلوں میں کینہ اور بغض پیدا ہونے سے وقتاً فوقتاً فسادات ہونے لگے۔ قصبہ اتور[1] میں جو ہندو مسلم فساد ہوا وہ حیدرآباد کی تاریخ میں سنگین ترین تھا۔ اس فضا میں اکثریت اور اقلیت کے حقوق کی بحثیں بھی شروع ہو گئیں۔

مسلمانوں کی تنظیم

ایک کروڑ ۶۴ لاکھ کی آبادی میں مسلمان ۱۵ فیصدی اقلیت تھے۔ مسلمانوں میں آبادی میں اضافہ کی تجویز سر اکبر حیدری اور قوم پرست ذہنیت رکھنے والوں اور ملکی عصبیت کے علمبرداروں کے گٹھ جوڑ سے ختم ہو چکی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اقلیتی فرقہ بھی اپنے دفاع اور اپنی تہذیب و ثقافت کے بچاؤ[2] کے لئے سوچنا شروع کردے۔ سب سے پہلے اتور کے قبضے میں ایک تنظیم انجمن دفاع المسلمین کے نام سے قائم ہوئی جو کچھ عرصے کے بعد اتحاد المسلمین کے نام سے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن گئی۔ اپنے اولین دور[3] میں اس تنظیم نے اپنے دائرہ کار کو مسلمانوں کے معاشرتی مسائل تک محدود کر دیا تھا۔ ایک کٹر ہندو لیڈر دامن ناتھ کے اس الزام کے جواب میں کہ حکومت مسلمانوں سے ترجیحی سلوک کرتی ہے۔ اس نے ایک کتابچہ تو شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس کے کسی سیاسی کام کا سراغ نہیں ملتا۔ نہ ہی اس نے سیاست میں کوئی حصہ

[1] ... [illegible] ... حیدرآباد ایک تہذیب کا نام تھا ... فروری ۱۹۹۶ء کو روزنامہ انجام میں شائع ہوا۔

[2] حیدرآباد میں رضا کار تحریک مصنفہ محمود ... شائع شدہ ... ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی۔

[1] لیکن بھارت میں دستوری اصلاحات کے نفاذ کے بعد اور عام سیاسی بیداری اور اس کے متوقع عواقب اور نتائج کو محسوس کر کے وہ بھی ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم بن گئی۔ اُس کا مُوقف یہ تھا۔ کہ ہندوؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو اُستوار کرتے ہوئے حکومت حیدرآباد کی اسلامی حیثیت اور خانوادہ آصفیہ کے فرمانروا کے اقتدار اور وقار کو برقرار رکھا جائے۔

اتحاد المسلمین نے اپنے اس مُوقف کو انجمن کے دستور میں اس طرح سمو دیا "مسلمانانِ مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے۔ کہ فرمانروائے ملک کی ذات اور تخت اُن ہی کی جماعت کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے اس بنا پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرمانروا کے اقتدار شاہانہ کی بقاو احترام مقدم رہے۔" یہ نقطہ نظر حقائق کی روشنی میں بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مسلمان اقلیت میں تھے اور جو بھی سیاسی برتری انہیں حاصل تھی وہ آبادی کی بنا پر نہیں بلکہ خاندان آصفیہ کی فرمانروائی اور اقتدار کی رہین منت تھی۔

بہادر یار جنگ

حیدرآباد کے مسلمانوں میں سیاسی احساس کو بیدار کرنے میں بہادر یار جنگ نے اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور بے مثال خطابت سے بڑا اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ حیدرآباد کے معاشرے میں ایک پشتینی جاگیردار خاندان میں ایک حریت پسند نوجوان کا ظہور ایک معجزہ سے کم نہیں تھا۔ بہادر یار جنگ نے اپنی دیوڑھی سے نکل کر ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کو اتحاد کی لڑی میں پرو دیا اور پھر انہیں ایک طاقتور سیاسی قوت بنا کر میدان میں لائے۔ اُنکی مساعی سے یہ تنظیم تھوڑے ہی عرصے میں اتنی مضبوط بن گئی۔ کہ حکومت وقت کو اُس کے سوچ و فکر اور رجحانات کا نوٹس لینا پڑا۔ وہ بڑے وسیع النظر تھے انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ہندو مسلمان دونوں فرقوں میں مفاہمت کی بھی کوشش کی۔ اور روائتی فرقہ یکجہتی کو جسمیں نمائندہ حکومت کے مطالبے زور پکڑنے سے رخنہ پڑ رہا تھا فروغ دینے کی بھی سعی کی۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوتی۔ یہ سیاسی پیش رفت اُن کی تنظیم کے بعض ساتھیوں کو ناگوار گذری کہ اس قسم کی کامیابی کا سہرا بہادر یار جنگ کو ہی ملے .... اور بعض حلقوں کی ناراضگی برداشت کرنی پڑی۔ اپنی خاندانی روایات کے

[1] مولانا مظہر علی کامل سابق صدر اتحاد المسلمین مضمون شائع شدہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء۔

مطابق انہیں نظام کے رُتبہ اور مقام کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا تھا اس لئے اپنے حریت پسند خیالات اور رُجحانات کے علی الرغم بہادر یار جنگ کے نظام سے تعلقات ایک معتدلانہ روش کے مطابق تھے۔

بہادر یار جنگ کے دورِ صدارت میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے حکومت کے وقار کو زبردست دھچکہ پہنچایا یعنی ہوا یوں کہ جامعہ عثمانیہ کے چند طالب علموں نے ریلوے سٹاف سے ایک معمولی سے جھگڑے پر ایک ریلوے سٹیشن کو تہ و بالا کر ڈالا اور پھر ایک جلوس کی شکل میں صدر اعظم سر اکبر حیدری کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے بظاہر اس جلوس کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ ارباب اختیار کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کریں۔ مگر وہاں جا کر انہوں نے تشدد آمیز رویہ اختیار کیا۔ صدر اعظم کی رہائش گاہ کو نقصان پہنچایا اور صدر ناظم کوتوالی پر تشدد کیا۔ اس افسوسناک واقعہ کی تحقیق کے لئے ایک کمیٹی نظام کے ایجنٹ جنرل برار سر ونکیٹ ستیاراؤ کی سربراہی میں مقرر ہوئی۔ اس کی کیا سفارشات تھیں کسی کو علم نہیں اور نہ ہی اس معاملہ میں کوئی کاروائی ہوئی۔ حیدرآباد[1] کی پوری تاریخ میں اس نوعیت کا یہ پہلا سنگین واقعہ تھا۔ کمیٹی کی سفارشات کے بارے میں کیوں خاموشی اختیار کی گئی، اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ اپنے خلاف اتحاد المسلمین کی بڑھتی ہوئی مخالفت کے پیش نظر سر اکبر حیدری نے خاموشی ہی میں عافیت جانی۔ بہر حال اس واقعہ نے حکومت کے وقار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اور شر پسندوں کو مستقبل کے لئے ایک راستہ دکھا دیا۔ اس واقعہ کے بعد ابھی سیاسی فضا سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ بہادر یار جنگ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ اُنکی وفات پر ہی اتحاد المسلمین کو اس بات کا احساس ہوا۔ کہ وہ کیسی عظیم شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔ اُن کے بعد اتحاد کے مختلف گروہوں کے باہمی اختلافات سامنے آ گئے۔ اور حصول اقتدار کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہو گئی:

رضاکار تنظیم

ہر عوامی تحریک میں کسی نہ کسی شکل میں رضاکاروں کی تنظیم ہوتی ہے۔ جو اس کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے چنانچہ بھارت میں کانگریس اور پھر مسلم لیگ کی رضاکار تنظیمیں تھیں اس طرح حیدرآباد میں بھی انجمن اتحاد المسلمین نے اپنی نشاۃ ثانیہ میں ایسی ہی ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن حیدرآباد کے مخصوص حالات میں دوسری سیاسی جماعتوں کے برعکس اس تنظیم پر ملک

[1] علی یاور جنگ۔ Hayderabad in retrospect page 5.

کی سالمیت امن و امان کی بحالی اور مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری بھی پڑ گئی۔ یہی چیز بھارتی حکمرانوں کے مفاد اور ان کی پالیسی کے خلاف تھی اسلئے اُسکی نظر میں یہ تنظیم شروع ہی سے گردن زدنی سمجھی گئی۔ اس کے خلاف بیحد پروپاگنڈا کیا گیا۔ بیرونی ممالک میں اُس کے اجتماعات کی تصاویر شائع کی گئیں اور سفارتی ذرائع سے تمام دُنیا میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی۔ کہ وہ اس تحریک کو ہندو آبادی کے لئے خطرہ سمجھتی ہے۔ اس تنظیم کے بارے میں متضاد آراء ہیں جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے مہا سبھائی حلقوں اور بھارتی حکومت کی یہ رائے تھی کہ فرقہ واریت کی بنیاد پر مبنی ہوئی یہ تنظیم ایک ایسی تحریک ہے۔ جو ہندو فرقے اور مُلک کے امن و امان کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے اور وی۔پی مینن یہ سمجھتا ہے کہ وہ اتحاد المسلمین کی ایک شاق برگیڈ"[1] ہے جسکا مقصد ایک اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ اُسکے برخلاف دوسرے حلقوں کا خیال تھا کہ جن حالات سے حیدر آباد کے مسلمان دوچار تھے اُنکے تحفظ اور بچاؤ کے لئے یہ ایک ناگزیر اقدام تھا ایک رائے یہ تھی کہ یہ تنظیم نازی پارٹی کی طرح حیدرآباد کی عسکری قوت کا ایک حصہ ہے جسکا مقصد مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو طاقت کے ذریعہ سہارا دینا ہے۔ یہ تحریک دراصل کیا تھی وُہ کیوں اور کس طرح معرض وجود میں آئی اور اُس نے حیدرآباد کی سیاست میں کیا کردار ادا کیا اس بارے کسی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے چند تاریخی حقائق کو نظر میں رکھنا ضروری ہے حیدرآباد کی اسلامی حیثیت اور اسمیں مسلمانوں کا اقتدار باہر کی فرقہ وارانہ تنظیموں کو بُری طرح کھٹک رہا تھا۔ عام سیاسی بیداری کیساتھ فرقہ وارانہ تعصب بھی بڑھتا رہا۔ غیر حیدرآبادی عناصر کی شہ پر حیدرآباد میں بھی مقامی مہاسبھائی اور آریہ سماجی تنظیموں نے ہر قسم کی تخریبی کاروائیاں شروع کر دیں۔ انتشار اور بدنظمی پھیلانے کے لئے باہر سے جتھے بھیجے جانے لگے۔ سیاسی فضا کو دیکھ کر اتحاد المسلمین[2] نے بھی مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ اُس نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنی شاخیں قائم کیں اِسطرح رضاکار تنظیم بھی معرض وجود میں آگئی۔ غیر مسلموں کی شورش پسندی مرٹھواڑی علاقوں میں شروع ہوئی اور دیکھتے دیکھتے دوسرے علاقوں میں پھیل گئی چنانچہ اوّلین دور میں رضاکار تنظیم بھی مرٹھواڑی میں علاقہ زیادہ فعال رہی ۱۹۳۹ء میں تلنگانہ کے علاقے میں کمیونسٹ تحریک نے جنم لیا اور فرقہ وارانہ تنظیموں - - - - - - -

[1] محمود حسین بنگالی مقالہ۔ رضاکار موومنٹ ان حیدرآباد وی۔ ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی صفحہ۔ -

[2] وی۔ پی۔ مینن Integration of Indian States صفحہ ۳۲

کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف مشترکہ محاذ بنالیا۔ ان تمام عناصر کے گٹھ جوڑ سے نبٹنے کے لئے مسلمانوں کے پاس یہی ایک تنظیم تھی۔ ۱۹۴۴ء میں بہادر یار جنگ کے انتقال[1] کے بعد ابوالحسن سید علی اور مظہر علی کامل کے دور میں اتحادالمسلمین کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا اس کی وجہ سے یہ تنظیم بھی ذرا سُست پڑ گئی۔ قاسم رضوی کو فرقہ واریت کا ذاتی تجربہ تھا اس لئے انہیں رضاکار تنظیم کی اہمیت کا زیادہ احساس تھا۔ اسی دوران اتحادالمسلمین[2] اور مرزا اسمٰعیل کی حکومت میں ٹھن گئی جن کی وجہ سے ایک سیاسی بے اطمینانی پیدا ہو گئی اور عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ بھارت کی طرف سے معاشی ناکہ بندی کے نتائج سامنے آنے لگے۔ اُن سب حالات کے پیش نظر اتحاد المسلمین نے اس تنظیم کو مضبوط بنانے پر ... خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ سرحدی علاقوں میں یونٹ قائم کئے گئے جنہوں نے کانگریس کے صدر راماننداتیرتھ کے بھیجے ہوئے جتھوں سے مقابلہ کیا۔ رضاکاروں کو جہاں ممکن ہو سکا۔ یونیفارم مہیا کی گئی۔ بیج تقسیم کئے گئے اور ان کی تربیت کے لئے ریٹائرڈ فوجیوں کی خدمات حاصل کیں۔ حیدرآباد کی فوج اور پولیس کے پاس اسلحہ ناکافی تھا تو ان کو کہاں سے مل جاتا۔ چنانچہ بھر مار بندوقوں۔ بھالوں۔ تیروں اور تلواروں سے انہیں لیس کیا گیا۔ آخری دور میں کچھ جدید اسلحہ بھی انہیں دیا گیا۔ مگر زیادہ تر اُن کے پاس قدیم ہتھیار ہی تھے۔ اسلحہ کی کمی کو نفری میں اضافے سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرحدوں پر اس کی کامیابیوں اور اپنے دفاع کی ضرورت کے احساس سے یہ تنظیم بہت مقبول ہو گئی۔ مسلمان نوجوان سینکڑوں کی تعداد میں بھرتی ہو گئے۔ حتیٰ کہ سکول اور کالج کے طلبا بھی اپنی درسگاہوں کو خیر باد کہہ کر اُس سے منسلک ہو گئے۔ اور بعض مقامات میں عورتوں نے بھی اپنی تنظیمیں بنالیں اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی بڑھتی ... ہوئی قوت سے شر پسندوں کی ایک حد تک روک تھام ہو گئی۔ لیکن باہر سے شہ ملنے کی وجہ سے سرحدوں پر دنگا فساد ... لوٹ مار۔ قتل و غارت سے ملک کا امن و امان اتنا خطرہ میں پڑ گیا تھا کہ اپنے محدود وسائل اور اسلحہ کی قلت کیوجہ سے حکومت کے لئے اُسے سنبھالنا دُشوار ہو گیا۔ معاشی ناکہ بندی نے اس صورت حال کو اور خراب

[1] محمود حسین بنگالی مقالہ رضاکار تحریک ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۴۰

[2] رضاکار موومنٹ حیدرآباد ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی

کردیا۔ ان حالات میں رضاکار تنظیم نے حکومت کا ہاتھ بٹایا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیم مسلح تنظیم کی شکل اختیار کرلی۔ جب تک اسکا دائرہ محدود رہا۔ اتحاد المسلمین کا اس پر کنٹرول بھی رہا۔ لیکن نفری میں اضافہ اور پھیلاؤ کیوجہ سے یہ کنٹرول بھی ڈھیلا پڑگیا۔ جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ ہنگامی حالات میں جنم لینے والی ایسی تنظیموں میں غیر مرشل غنڈہ عناصر بھی شامل ہوجاتے ہیں انہیں اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے جسے وہ تنظیم کے پردے میں پورا کرتے ہیں چنانچہ اسی قسم کے عناصر نے اپنے جائز ذرائع کے ساتھ لوٹ مار بھی شروع کردی۔ قتل و غارت اور آتشزدگی کے واقعات بھی ہونے لگے جس کی زد میں بسا اوقات اُنکے مسلمان بھائی بھی آنے لگے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نارکٹ پلی کے محاذ پر رضاکاروں کی ٹولی نے اپنے انچارج کی[1] سخت مخالفت کے باوجود لاری کو راستہ میں روک کر لوٹ مار کی۔ اس طرح جو تنظیم حکومت سے تعاون کرنے کے لئے میدان میں آئی تھی وہ خود حکومت کے لئے ایک مسئلہ بن گئی[2] اس کے علاوہ رضاکاروں کو اپنی طاقت اور اہمیت کے بارے میں اتنی غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ کہ انہوں نے کھلم کھلا نظم و نسق میں مداخلت کرنی شروع کردی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جو عہدہ دار ابتک اُنسے تعاون کر رہے تھے انکی ہر وقت کی زیادتیوں اور دھونس سے بیزار ہوگئے۔ اُن کے اس رویہ سے فضا ایسی مسموم ہوگئی کہ بعض بڑے عہدیدار بھی اس رو میں بہہ گئے۔ ایک فوجی افسر[3] کا بیان ہے کہ ورنگل کے صوبہ دار نے اُن پر زبردست دباؤ ڈالا کہ اُن کا فوجی یونٹ رضاکاروں کے ساتھ مل کر ایک گاؤں پر چھاپہ مارے۔ انہوں نے سختی سے انکار کردیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرکاری عہدہ دار حکومت کو نظر انداز کرکے رضاکار تنظیم کی طرف دیکھنے لگے مجھے خود ذاتی طور پر رضاکاروں کی بعض غیر قانونی کارروائیوں کا تجربہ ہوا۔ رضاکاروں کے ٹولے ریل اور بس سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے تھے ٹکٹ مانگنے پر انکار کردیتے تھے۔ میں نے بحیثیت چیف کمرشل منیجر ریلوے اس کا نوٹس لیا۔ تو وزیر مواصلات جن کا تعلق اتحاد المسلمین سے تھا۔ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور مجھے چھٹی پر بھیجدیا۔ لائق علی نے جب صدرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا تو یہ صورتِ حال حکومت کے نوٹس میں آئی قاسم رضوی بھی نالاں تھے تنظیم کو کنٹرول میں لانے کیلئے ریٹائرڈ فوجی افسروں کو مقرر کیا گیا مگر بہتری کی صورت نظر نہیں آئی۔ اور آتی بھی کیسے جب اتحادی

[1] روایت نذر مصطفیٰ صاحب جو اب لندن میں مقیم ہیں وہ اُس ٹولی کے انچارج تھے۔
[2] یادداشت خان بہادر اشفاق احمد سابق چیف سکریٹری۔ [3] روایت کرنل عشاق احمد۔

اور اُن کی خوشامد کرنے والے سرکاری عہدہ دار اپنے عہدوں کے وقار کو خیرباد کہہ کر رضاکار یونیفارم پہنے پھرتے تھے اور رضاکاروں کے ہر جائز و ناجائز مطالبے کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ تو اس تنظیم کا ایک پہلو تھا۔ اس کا روشن پہلو تھا۔ کہ اُس نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور ملک کے نازک وقت مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کیا۔ سیاسی مذاکرات کے انقطاع کے بعد وہ اسطرح فوج کا ایک حصہ بن گئے اور حملے کیوقت بعض ایسی قربانیاں دیں، جو تاریخ میں یادگار رہیں گی۔

آئینگار کمیٹی کی سفارشات

سیاسی بیداری کی عام فضا میں یہ ممکن نہیں تھا۔ کہ حیدرآباد میں دستوری اصلاحات کے مسئلہ پر توجہ نہ دی جائے حیدرآباد کے مخصوص حالات میں ان اصلاحات کی کیا نوعیت ہو۔ اس کے تعین کے لئے آئینگار کمیٹی کا تقرر ہوا۔ جسکا سربراہ ایک معتدل خیالات کا حامل ہندو لیڈر مسٹر آئینگار تھا اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں جو اصلاحات حکومت کے زیر غور تھیں انمیں ہندو مسلم نشستیں مجوزہ اسمبلی میں مساوی رکھی گئی تھیں مگر تمام غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حیثیت ایک اقلیت کی ہوجاتی تھی۔ انتخابات مخلوط اور مختلف مفادات کی بنا پر ہونے طے پائے تھے ان اصلاحات کو اتحاد المسلمین نے مسترد کردیا۔ اور تین مطالبات پیش کئے۔

(۱) مخلوط کے بجائے جداگانہ انتخاب۔

(۲) حیدرآباد کے اسلامی حکومت کے دعوے کی توثیق۔

(۳) صرف خاص سے لئے جانے تینوں اراکین ۔ ۔ ۔ ۔ ....

مسلمان ہونے چاہئیں۔ اختلاف رائے کیوجہ سے حکومت اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اتحاد المسلمین سے مذاکرات کے لئے[1] علی یاور جنگ اور معین نواز جنگ کو مقرر کیا گیا۔ یہ گفتگو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچی تھی۔ کہ حکومت کے لیت و لعل کی پالیسی نے معاملہ کو پھر الجھا دیا اور اختلافات نے شدت اختیار کرلی۔ جب سمجھوتہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو قائد اعظم سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے حیدرآباد آکر حکومت اور مسلمانوں میں صلح کرادی۔ اتحاد المسلمین کو تحریری تیقنات دیئے

[1] :۔ معین نواز جنگ مضمون بعنوان قائد اعظم کا تاریخی سفر اخبار سب رس دسمبر ۸۱ء۔

گئے کہ اقتدار کا مرکز فرمانروا کی ذات رہیگی اور مسلمانوں کی حکومت[1] میں اقلیتی حیثیت نہیں ہوگی۔ ان تیقنات کا دستوری پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کو صرف ہندوؤں کے مساوی ہی نہیں بلکہ جملہ غیر مسلم نمائندوں کے مساوی نشستیں دی جائیں۔ اور ہر فرقہ سے ایسے اُمیدواروں کا انتخاب ہو۔ جنہیں جملہ حاصل کردہ ووٹوں میں کم از کم ۵۱ فیصدی ووٹ حاصل ہوں۔ سر اکبر حیدری کی حکومت ان ترمیمات کو اصلاحات کی سکیم کی رُوح کے خلاف سمجھتی تھی۔ اور قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ لیکن جب نظام نے انہیں واضح طور پر بتایا۔ کہ متفق نہ ہونے کی صورت میں امن و امان کی بحالی اور نتائج کی سب ذمہ داری اُن پر ہوگی۔ تو اس تنبیہ پر سر اکبر حیدری کی وزارت نے اُن کی بات مان تو لی مگر سارے معاملے کو راز میں رکھ کر جنگ کے بہانے سے اصلاحات کا نفاذ ملتوی کر دیا۔ جنگ کے بعد سیاسی بیداری کو فروغ ہوا۔ حیدرآباد کے ملحقہ علاقوں میں سیاسی ادارے قائم ہو چکے تھے[2] وقت گذرنے کے ساتھ مسلمانوں کو دیئے ہوئے تیقنات بھی راز نہیں رہے تھے۔ اس طرح ایک بے یقینی کی فضا پیدا ہو گئی اس اثناء میں نواب چھتاری سر اکبر حیدری کی جگہ لے چکے تھے اور جو صورت حال اُن کے پیشرو چھوڑ گئے تھے۔ اُس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑی مشکل میں پاتے تھے۔ مولانا مظہر علی کامل کی روایت یہ ہے کہ چھتاری وزارت سر اکبر حیدری کی دی ہوئی تیقنات سے گریزاں تھی۔ اس وجہ سے مسلمانوں نے اصلاحات کو مسترد کر دیا اور ایک سیاسی ہیجان پیدا ہو گیا اُس کے برخلاف معین نواز جنگ کہتے ہیں کہ تجویز یہ بھی کہ غیر مسلم جماعتوں کو مطمئن کرنے کے لئے تیقنات میں کچھ ترمیمیں کر دی جائیں۔ انہوں نے اس بارے میں قائد اعظم[3] سے جو حیدرآباد آئے ہوئے تھے نجی طور پر مشورہ بھی کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ اگر مجوزہ ترامیم اصل سکیم سے مختلف نہیں تو پھر یہ ترمیمیں کر کے حکومت بد عہدی کا دھبہ اپنے دامن پر کیوں لگانا چاہتی ہے۔ مگر پبلک جلسے میں قائد اعظم نے اتحاد المسلمین کو مشورہ دیا۔ کہ اصلاحات کیسی بھی ہوں۔ بہر حال آئینی ترقی کیطرف ایک قدم ہے۔ اس لئے انہیں قبول کر لینا چاہیئے۔

---

[1] مولانا مظہر علی کامل سابق صدر مجلس اتحاد المسلمین مضمون بعنوان ”بانی پاکستان اور نظام دکن کی تاریخی ملاقات“ شائع شدہ روزنامہ جنگ ۱۴، اگست ۱۹۸۲ء۔ [2] نواب معین نواز جنگ مضمون بعنوان ”قائد اعظم کا تاریخی سفر“ ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن ستمبر ۱۹۸۲ء

[3] مولانا مظہر علی کامل مضمون بعنوان بانی پاکستان اور نظام دکن کی تاریخی ملاقات روزنامہ جنگ ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء۔

[4] نواب معین نواز جنگ مضمون قائد اعظم کا تاریخی سفر ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن ستمبر ۱۹۸۲ء

ابوالحسن سید علی سے مظہر علی کامل تک

بہادر یار جنگ کے جانشین ابوالحسن سید علی ایک منجھے ہوئے تجربہ کار سیاست دان تھے اور ایک عرصہ تک بہادر یار جنگ کے رفیق کار رہے تھے۔ اگر وہ سلامت روی سے کام لیتے اور اپنی فہم و فراست کو ساتھیوں کے مشورہ پر ترجیح نہ دیتے تو شاید انہیں معاملات کو سلجھانے میں کچھ کامیابی حاصل ہو جاتی۔ انہوں نے اپنے رُفقاء سے مشورہ کئے بغیر کانگریس سے بالا ہی بالا سمجھوتہ کر لیا۔ جس میں فوری طور پر دو مسلمانوں اور دو ہندو وزراء کے تقرر کے ساتھ ساتھ مفاد واتی کے بجائے علاقہ واری بنیاد پر انتخاب کرانا شامل تھا اس کے علاوہ مقننہ کے اختیارات میں مواز نہ کی منظوری پر بھی رضامندی کا اظہار کر دیا گیا تھا اس خفیہ سمجھوتے نے اتحاد المسلمین کی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا اور ابوالحسن سید علی سیاسی میدان سے ہٹ جانے پر مجبور ہو گئے اُن کے بعد مولانا مظہر علی کامل جو اتحاد المسلمین کے پُرانے سائرکن اور بڑی مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے صدر کے عہدہ پر فائز ہوئے اپنے مزاج کی وجہ سے شاید وہ اقتدار کی دوڑ میں حصّہ نہ لیتے۔ مگر اتحاد المسلمین کی اندرونی سیاست اور حالات کی نزاکت نے انہیں مجبور کر دیا اور وہ اس خار زار وادی میں اُتر آئے انہوں نے اپنے خلوص اور صلح کُن رجحانات کی وجہ سے عارضی طور پر انتشار پر قابو تو پا لیا مگر اندر ہی اندر سرگرمیاں جاری رہیں بالآخر وہ بھی ایک سال کی قلیل مدت میں استعفیٰ دے کر میدان سے ہٹ گئے۔

دیچپلی کا سانحہ

اُنکے مختصر صدارتی دور میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جسنے نظم و نسق اور حکومت کے وقار کو بہت سخت نقصان پہنچایا۔ اتحاد المسلمین کے چند اراکین نے جن میں عبدالرحمٰن رئیس پیش پیش تھے حصول اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اُس کے لئے شاید یہ ضروری تھا۔ کہ ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جائے کہ مسلمان عوام میں اُنکے نام کا ڈنکا بجنے لگے۔ اور وہ ایک ہیرو کی طرح سیاست کے میدان میں نمودار ہو جائیں۔ ڈچپلی کی مسجد کے قضیہ نے انہیں یہ موقعہ بہم پہنچا دیا۔ نواب چھتاری کی وزارت کا دور تھا۔ ضلع نظام آباد کے ایک چھوٹے سے قصبے ڈچپلی میں جذامیوں کا ایک مشنری ہسپتال تھا اُس کے احاطے میں مسلمان مریضوں نے نماز پڑھنے کے لئے ایک چھپر ڈال لیا تھا۔ عمارت کی توسیع کی ضرورت پیش آئی تو مریضوں کی مشورے سے اس جگہ چھپر ہٹا لیا گیا اور نماز پڑھنے کے لئے ایک متبادل جگہ تجویز کر دی گئی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ جسکا بتنگڑ بنا لیا گیا۔ عبدالرحمٰن رئیس نے یہ مشہور کر دیا کہ مسجد کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس معاملہ کو سلجھانے کے لئے حکومت اتحاد اور مشن کے نمائندوں کی ایک مشترکہ میٹنگ میں نئی جگہ کے بارے میں باضابطہ تصفیہ بھی ہو گیا۔ عبدالرحمٰن رئیس

خود اس میٹنگ میں شریک تھے اُس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس بارے میں نواب چھتاری کی یہ روایت ہے۔
"عبدالرحمن رئیس آئے اور گفتگو میں شریک ہو گئے اور فیصلے سے مطمئن ہو گئے اُن کے ساتھ اُنکے چار ساتھی بھی تھے امام بیگ دوفی نے عبدالرحمن سے یہ کہ مجمع کو جاکر خوشخبری سنا دیں۔ عبدالرحمن نے کہا۔ کہ تصفیہ جب تک تحریر نہ ہو جائے اعلان بیکار ہے لیکن کچھ ہی دیر کے بعد وہ مجمع کو اطلاع دینے گئے جونہی وہ مجمع کے سامنے پہنچے توڑ پھوڑ آگ لگانا شروع ہو گیا......"[1]

سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُس نے مجمع میں جاکر عوام کو حکومت اور صدر اعظم کے خلاف اُکسایا جسکے نتیجہ میں ایک مشتعل اور بے قابو ہجوم نے صدر اعظم کی رہائش گاہ کو نذر آتش کر دیا۔ اور اُس سے انتہائی نازیبا سلوک کیا۔ یہی کچھ وزیر پولیس کی رہائش گاہ پر ہوا۔ بہادر یار جنگ کے دور میں سر اکبر حیدری سے بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا تھا[2] مگر اس کاروائی میں ایسا تشدد نہیں تھا کہ سربراہ حکومت کی جان ہی خطرے میں پڑ جائے اس لئے حیدر آباد کی بربادی . . . .

دیچیلی کا سانحہ بلاشبہ ایک ایسی منزل تھی جس نے حکومت کے وقار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر اُسے اس قابل نہ رکھا کہ کسی مضبوط حکمت عملی پر عمل پیرا ہو سکے یا امن و امان کے تحفظ کے لئے کوئی موثر اقدام کر سکے۔ بعض لوگ اس واقعہ کو نظام کے شہ دینے پر محمول کرتے ہیں[3] اس الزام کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔ اس بارے میں نواب چھتاری نے اپنے نجی خطوط میں جن تاثرات کا ذکر کیا ہے وہ ایک گہری سازش کی نشاندہی کرتے ہیں سابق چیف سکرٹری اشفاق احمد کے نام ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا "...... ہوش نے مجھ سے کہا تھا کہ ۱۵ / مارچ ۱۹۳۶ء کو میرے مکان میں آگ سرکار مرحوم کے اشارے سے لگائی گئی تھی تاکہ مرزا اسمٰعیل کے لئے راستہ صاف ہو سکے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہوش خود مرزا اسمٰعیل کو لانے کی مہم میں پیش پیش تھے اس لئے ان کی یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس پر نواب صاحب نے[4] لکھا...... " ہوش کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو آپکی ہے...... اس معاملہ خاص میں آتشزدگی کے دن جب میں کاظم یار جنگ کے ہاں پہنچا تو انہوں نے فوراً کہا "یہ گرگسن[5] کے ہاں کیا ہوا؟" خود نوشت سوانح حیات میں نواب صاحب نے اسے یوں بیان

۱۔ نواب چھتاری کی یادِ ایام جلد دوم صفحہ ۱۸۰ ۲۔ یادداشت [illegible] چیف سکرٹری [illegible] اشفاق احمد [illegible]
۳۔ مکتوب مورخہ [illegible] اگست [illegible] ۴۔ یادداشت [illegible] اشفاق سابق چیف سکرٹری ۵۔ مکتوب مورخہ ۵ ستمبر [illegible]

کیا ہے "جب میں نے کاظم یار جنگ سے یہ واقعہ بیان کیا تو بے ساختہ[1] اُن کی زبان سے نکلا "یہ منظاہرہ تو گرگسن کے ہاں ہونے کی خبر تھی..... کاظم یار جنگ کے اس فقرے سے ظاہر ہو گیا کہ انہیں منظاہرے کی خبر تھی اور حکومت کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی" انہوں نے اس ضمن میں کاظم یار جنگ سے یہ بات بھی منسوب کی ہے کہ ۱۹ / مارچ کو جب کاظم یار جنگ اُنسے ملنے آئے۔ تو انہوں نے کہا[2] "اگر گرگسن کو اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق علیحدہ کر دیا ہوتا تو نہ مسلمانوں میں شورش ہوتی اور نہ سرکار برہم ہوتے" اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد علی یاور جنگ نے ریذیڈنٹ سر آرتھر لوتھین کو عثمان ساگر کے مہمان خانے میں ڈنر دیا[3]۔ اس موقعہ پر ریذیڈنٹ نے اپنی خفیہ پولیس کی رپورٹ[4] دکھائی جس میں یہ درج تھا کہ دین یار جنگ کے اشارے سے یہ سب کچھ ہوا تھا اور وہ سٹی پولیس کے انچارج تھے" نواب صاحب نے اس ضمن میں سابق چیف سکرٹری جن پر اُن کا پورا اعتماد تھا اس کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ کہ سقوط حیدر آباد کے بعد نظام نے خود اُس سے کہا تھا کہ اس سانحہ میں انہیں ملوث کرنا بالکل غلط ہے۔ تمام واقعات اور روایتوں کا جائزہ لینے سے یہ واضح تاثر ہوتا ہے۔ کہ مرزا اسمٰعیل کو لانے کے لئے ایک گہری سازش تیار کی گئی تھی[5] جس میں کئی ایسے لوگ شریک تھے۔ جن کا شاہی دربار میں رسوخ تھا اور حیدر آباد کی خفیہ پولیس جسکی پیشہ ورانہ مہارت کی دھوم تھی اس سازش میں بری طرح ملوث تھی۔ تشدد پر تلا ہوا یہ جم غفیر تین گھنٹوں میں عین شہر ہی سے دندناتا ہوا بلا کسی روک ٹوک صدر اعظم کی رہائش گاہ تک پہنچ گیا اس دوران پولیس نے اسے روکنے کی کوشش کی نہ کسی ذمہ دار شخصیت کو اُس کے عزائم کی اطلاع دی۔ حتیٰ کہ وزیر پولیس بھی اس تشدد سے نہ بچ سکے۔ جب صدر اعظم کی رہائش کو نذر آتش کیا جا رہا تھا تو اس وقت بھی پولیس کا کردار انتہائی کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے اس سارے سانحہ کے ایک گھناؤنی سازش ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جو مفاد پرستوں

۱۔ خود نوشت سوانح حیات جلد سوم صفحہ ۱۹۰۔

۲، ۳۔ خود نوشت سوانح حیات جلد سوم صفحہ ۱۹۱۔

۴۔ خود نوشت سوانح حیات جلد سوم صفحہ ۱۹۱۔

قائداعظم حیدرآباد میں خواتین کے جلسے میں

کی شہ پر عمال حکومت کی ملی بھگت اور فرض ناشناسی سے کامیاب ہوئی۔ اس سانحہ نے جہاں حکومت کے وقار کو ٹھیس پہنچائی۔ اور بدامنی اور فتنہ گردی کے لئے ایک فضا قائم کردی وہاں یہ بھی واضح ہوگیا۔ کہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی تنظیم اتحاد المسلمین ایک مضبوط اور متحد جماعت نہیں ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ منتخب صدر کی موجودگی میں چند مٹھی بھر افراد اپنی من مانی کر سکیں۔ عام خیال یہی تھا۔ کہ نظام اپنے صدراعظم سے اس موقعہ پر اظہار ہمدردی کرتے اور اپنے اعتماد اور تعاون کا یقین دلاتے مگر ہوا یہ کہ انہوں نے ایک درباری کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اس سانحہ کے بعد شاید وہ صدراعظم رہنا پسند نہیں کریں گے[1] چنانچہ نواب چھتاری نے استعفے پیش کر دیا۔ اور حیدرآباد سے رخصت ہوگئے۔ سوچنے کی بات ہے۔ کہ مسلمان اقلیت میں ہوں اور ان کا اقتدار میں ہونا حکومت کے ہی بل بوتے اور سہارے پر ہو۔ اور وہ حکمران کے خفیہ اشارے یا مفاد پرستوں کے اکسانے پر حکومت کے وقار اور سالمیت ہی کو داؤ پر لگا دیں تو پھر مستقبل کے بارے میں سوائے بربادی کیا پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔

نئے صدراعظم کا انتخاب

اس وقت کے ملک کے حالات میں نواب چھتاری کے جانے کے بعد صدراعظم کا انتخاب بڑی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کا متقاضی تھا اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ میں خوب ٹھنی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر یہ ضروری تھا۔ کہ اس عہدہ پر کسی ایسے آدمی کا تقرر نہ ہو۔ جس کے کانگریسی رجحانات ہوں۔ لیکن سازشی درباری ٹولے نے جس کا سرغنہ ہوش یار جنگ تھا نظام کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی۔ کہ وہ حیدرآباد کے مسلم عوام کی مرضی کے خلاف مرزا اسمٰعیل کے تقرر پر رضامند ہوگئے۔ اس تجویز کی خبر جب قائداعظم کے کان میں پڑی تو انہوں نے نظام کو متنبہ کیا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ کسی ہندو کو لے آؤ۔ مرزا اسمٰعیل کا نام نہ لو کیونکہ وہ مسلمانوں کے خلاف کام کرتا ہے۔ مولانا مظہر علی کامل کی روایت ہے کہ نظام نے قائداعظم سے اپنی خط و کتابت میں انہیں بتایا تھا کہ مرزا اسمٰعیل کے تقرر کی تجویز لارڈ ویول والسرائے ہند کے دباؤ کی وجہ سے زیر غور ہے[2]۔ قائداعظم نے جب لارڈ موصوف سے پوچھا کہ صدراعظم کے تقرر کے معاملے

---

[1] یادداشت سابق چیف سکریٹری اشفاق احمد یہ درباری ہوش یار جنگ تھے انہوں نے اپنی کتاب مشاہدات میں خود اس پیامبری کا اعتراف کیا ہے۔ [2] مولانا مظہر علی کامل۔ مضمون بعنوان بانی پاکستان اور نظام دکن کی تاریخی ملاقات روزنامہ جنگ مورخہ ۸ اگست ۱۹۸۰ء۔
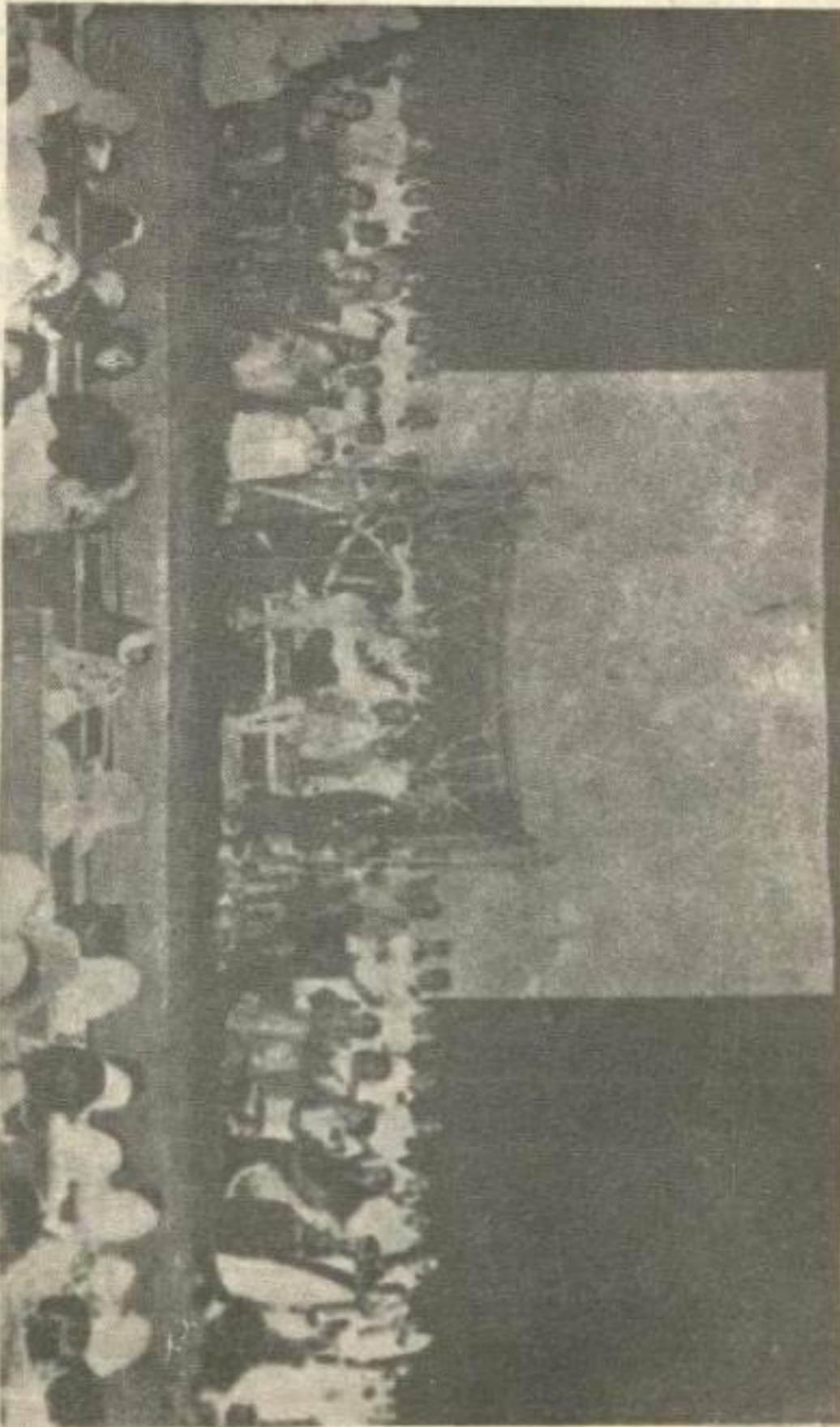
میں حیدرآباد پر کیوں دباؤ ڈالا جا رہا ہے تو لارڈ ڈویول نے جواب دیا۔ کہ انہوں نے کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ نظام اپنے صوابدید اور پسند سے اپنا صدر اعظم مقرر کر سکتے ہیں بہرحال جب خطوکتابت سے یہ معاملہ نہ سلجھ سکا اور مجلس اتحاد المسلمین نے بطور خاص درخواست کی کہ قائداعظم خود حیدرآباد تشریف لا کر اس مسئلے کو سلجھائیں تو قائداعظم نے بالمشافہ گفتگو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بتایا یہ جاتا ہے۔ کہ مرزا اسمٰعیل کو بلانے والے ٹولے نے قائداعظم کو دعوت دیئے جانے کی مخالفت کی لیکن انہیں انہیں کامیابی نہیں ہوئی چنانچہ نظام کی طرف سے انہیں مدعو کیا گیا۔ سرکاری سطح پر[۱] اور اتحاد المسلمین کی طرف سے انکا فقید المثال استقبال ہوا اور سرکاری مہمان خانہ راک لینڈ میں اُنکے قیام کا انتظام ہوا۔

قائداعظم کے سگریٹ کی کہانی

نظام سے قائداعظم کی ملاقات کا وقت صبح ۱۱ بجے مقرر تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ موضوع گفتگو کی اہمیت کے پیش نظر ملاقات میں کچھ وقت لگیگا۔ مگر قائداعظم تھوڑی سی ہی دیر میں شاہی محل سے واپس آگئے اُنکی اس طرح سے اچانک واپسی سے اُن کے عقیدتمندوں اور بالخصوص اتحاد المسلمین کی قیادت کو بہت پریشانی ہوئی۔ اتفاق سے میں خود بھی اُس وقت بطور ایک تماش بین سرکاری مہمان خانے میں موجود تھا میں نے دیکھا۔ کہ قائداعظم کے چہرے سے برہمی نظر آرہی تھی اور وہ موٹر سے اُترتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نواب صدیق علی خان کی طلبی ہوئی۔ اور انہیں واپسی کے سفر کے لئے فوری انتظام کرنے کی ہدایت ملی۔ صدیق علی خان نے مولانا مظہر علی کامل سے مشورہ کیا اور دونوں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے عرض کیا۔ کہ پروگرام میں غیر متوقعہ تبدیلی کی وجہ کچھ بھی ہو۔ اگر وہ اس طرح واپس تشریف لے گئے۔ تو حیدرآباد کے مسلمانوں کے لئے یہ ایک عظیم المیہ ہوگا۔ آپ ہم مسلمانوں کے لئے تشریف لائے ہیں یا عثمان علی خان کے لئے! یہ عرض کرتے ہوئے انہوں نے بڑے جذباتی انداز میں فیصلہ پر نظرثانی کی درخواست کی۔ قائداعظم نے فرمایا۔ تمہارا نظام بہت بدخلق اور جلدباز[۲] ہے۔ مسلمانوں کے مسائل کی اہمیت کے پیش نظر میں اُنکے بلانے پر آیا تھا ورنہ موجودہ مصروفیتوں کے زمانے میں مجھے آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ چند لمحات

۱؎ نواب معین نواز جنگ مضمون بعنوان قائداعظم کا تاریخی سفر ماہنامہ سب رس دسمبر [illegible]

۲؎ مولانا مظہر علی کامل مضمون بعنوان بانی پاکستان اور نظام دکن کی تاریخی ملاقات روزنامہ جنگ مورخہ ۱۴ اگست [illegible]

سوچکر قائداعظم نے مولانا کی اپیل پر اپنے واپسی کے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا شاہی محل سے اسطرح واپسی کے بارے میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ قائداعظم نے نظام کے سامنے سگریٹ سُلگایا تھا جسے آداب شاہی کے خلاف سمجھ کر نظام ناراض ہو گئے۔ نواب صدیق علی خان نے بھی یہی بات کہی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ روایت بھی بیان کی ہے۔ کہ جب مرزا اسمٰعیل کا ذکر آیا۔ تو نظام نے کہا "دیکھئے مسٹر جناح آپ کو میرے اُمور مملکت میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے" اس روایت کو پڑھ کر میں نے نواب صاحب کو لکھا کہ چونکہ قائداعظم اور نظام کی ملاقات میں کوئی تیسرا شخص[۱] موجود نہیں تھا۔ اس لئے اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا تو اس روایت کے راوی اُن دونوں میں سے ہی ایک ہو سکتا ہے۔ کیا قائداعظم نے اُن سے یہ بات کہی تھی؟ اگر ایسا ہے تو خیر ٹھیک ہے۔ ورنہ ان دو عظیم شخصیوں کے بارے میں اس روایت کے اصل راوی کی نشاندہی ہونی چاہیئے۔ مگر نواب صاحب نے باوجود میرے پیہم اصرار کے نشاندہی[۲] نہیں فرمائی۔ مولانا مظہر علی کامل کہتے ہیں کہ ان کے اپنے خاص ذرائع سے یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ مگر خاص ذرائع کا مولانا نے بھی انکشاف نہیں فرمایا۔ معین نواز جنگ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ زاہد حسین کے ہاں دعوت کے موقعہ پر قائداعظم[۳] نے نظام سے اپنی ملاقات کا حال سُنایا تھا انہوں نے بھی وضاحت نہیں فرمائی کہ سگریٹ والی داستان میں کتنی حقیقت ہے۔ مرزا اسمٰعیل نے بھی یہی روایت بہت نمک مرچ لگا کر بیان کی ہے اور اس واقعہ کا راوی ہوش یار جنگ کو بتایا ہے لطف یہ ہے کہ یہ بزرگوار بھی ملاقات کے وقت موجود نہ تھے وہ راوی[۴] کیسے بن گئے۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ ملاقات کے وقت کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہ تھا کسی نے چھپ چھپا کر کچھ سُن لیا ہو تو وہ اور بات ہے، ہوش یار جنگ نے خود انکشاف کیا ہے۔ کہ شاہی چوبدار نظام کی ہر بات پر کان لگائے رہتے تھے اور انہیں بات کا بتنگڑ بنانے میں کمال حاصل تھا اور وہ ریذیڈنسی سے تنخواہیں بھی پاتے تھے کیونکہ ہوش یار جنگ خود موقعہ پر موجود نہیں تھے اس لئے اُنکی روایت کے مآل کی تعبیر انہی ضمیر فروش چھپ کر سننے والے اور بات کا بتنگڑ بنانے والوں کی باتوں کی بنیاد پر ہی ہو سکتی تھی جس قسم کے الفاظ اور فقرے مرزا اسمٰعیل کی کتاب میں قائداعظم اور نظام سے منسوب کئے گئے ہیں۔

۱؎ مولانا مظہر علی کامل مضمون بعنوان بانی پاکستان اور نظام دکن کی تاریخی ملاقات روزنامہ جنگ مورخہ ۱۴ اگست [illegible]

۲؎ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲۲ ستمبر [illegible]

۳؎

وہ اُن لوگوں کے لئے جو ان محترم بزرگوں کے مزاج اور طبیعت سے واقف ہیں قطعی طور پر ناقابل یقین ہیں اور یہ ایک گھڑی ہوئی داستان معلوم ہوتی ہے۔ ہوش یار جنگ اس سازشی ٹولے کا سربراہ تھا۔ جو مرزا اسمٰعیل کو وزارت پر لانے کے لئے کوشاں تھا شاید اپنے ممدوح کے کیس کو مضبوط بنانے کے لئے اُس نے اس قسم کی داستان سرائی ضروری سمجھی ہو۔ بھارت کے ایجنٹ جنرل منشی[1] نے ہوش یار جنگ سے اپنے خفیہ مراسم کا جس طرح اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہوش یار جنگ کی روایت   معتبر نہیں سمجھی جاسکتی۔

واقعات کا تجزیہ

میں موقعہ پر موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ قائد اعظم شاہی محل سے بہت برہمی کے عالم میں واپس ہوئے جسکا نظام کو بھی احساس تھا اور شاید اُن کی ناراضگی پر اپنے عوام کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے قائد اعظم کی واپسی کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ موٹر میں سرکاری مہمان خانے کے سامنے سے گزرے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ کہ ان کی موٹر کو دیکھ کر مہمان خانے کے کمپونڈ اور عمارت میں موجود تمام لوگوں نے اپنی پیٹھ موڑ لی۔ اس سے زیادہ صاف ردِ عمل کیا ہو سکتا تھا۔ خود نظام کو بھی اس ناراضگی کا شدت سے احساس تھا چنانچہ اسی احساس کے تحت اُنہوں نے اپریل ۱۹۴۸ء میں سر محمد یامین خاں کو بطورِ خاص مدعو کیا[2] اور اُنکے ذریعہ قائد اعظم کو پیغام بھجوایا۔ کہ مرزا اسمٰعیل کو عنقریب سبکدوش کردیں گے۔ یہی پیغام چودھری خلیق الزمان کے ذریعہ نظام نے قائد اعظم کو بھجوایا تھا۔[3]

اصل صورت حال سے ناواقفیت کی وجہ سے سگریٹ والی داستان اتنی مشہور اور زبانِ زدِ عام ہو گئی کہ وہ بلا کسی ثبوت اور تحقیق کے مان لی گئی۔ میری نظر میں یہ داستان کئی وجوہات کی بنا پر قرینِ قیاس نہیں۔ پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ قائد اعظم نظام کی دعوت پر تشریف لائے تھے اور آنکے خصوصی مہمان تھے یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ مہمان نوازی کے آداب کے خلاف اور اُس کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مہمان کے لئے اس قسم کا رویہ اختیار کرتے اور مہمان بھی وہ عالی مرتبت انسان جو اسلامیان ہند کا سربراہ اور قائد اعظم تھا۔ دوسری سوچنے کی یہ بات ہے۔ کہ جو لوگ قائد اعظم کی خوددار طبیعت سے واقف ہیں وہ کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے کہ اس قسم کے مبینہ رویّے کے بعد وہ ایک

[1] کنیالال منشی۔

[2] سر محمد یامین خان۔ نامۂ اعمال جلد دوم صفحہ ۱۲۹۶۔

[3] چودھری خلیق الزمان۔ شاہراہِ پاکستان صفحہ ۱۰۴۳۔

لوگ کے لئے بھی سرکاری مہمان خانے میں قیام کرنا گوارا کر سکتے تھے۔ لیکن وہ مہمان خانے میں اپنے پروگرام کے مطابق نہ صرف ٹھہرے بلکہ اگلے دن اپنے میزبان کی درخواست پر ایک سرکاری ضیافت میں بھی شرکت کی جو خصوصی طور پر اُن کے اعزاز میں ترتیب دی گئی تھی اس دعوت میں انہوں نے نظام کا جامِ صحت بھی نوش کیا۔ اس ضمن میں سابق چیف سیکریٹری خان بہادر اشفاق احمد کی یادداشت کا ایک اقتباس موجب دلچسپی ہوگا[1]۔ دوپہر میں ایک بجے مجھے کنگ کوٹھی[2] سے ٹیلیفون آیا۔ کہ حضور نظام ہماری مزاج کی وجہ سے قائد اعظم کو خود مدعو نہیں کر سکتے مگر اُن کی خواہش ہے[3] کہ اُنکے اعزاز میں ایک ڈنر دیا جائے۔ جس میں نظام کی نیابت ولی عہد شاہزادہ اعظم جاہ کریں۔ مجھے یہ حکم ہوا۔ کہ میں قائد اعظم سے مل کر اُن کی رضامندی حاصل کروں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ نظام نے اپنی بیماری کے بارے میں قائد اعظم کو پہلے سے   مطلع کر دیا ہے۔ چنانچہ تین بجے دوپہر میں صغیر احمد عباسی پرسنل سیکریٹری نواب چھتاری کے ساتھ گیسٹ ہاؤس گیا۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ قائد اعظم مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے کیونکہ حکومت حیدرآباد اور نظام کی طرف سے جو بھی عطیات وقتاً فوقتاً دیئے جاتے تھے وہ میری ہی واسطے سے انہیں پیش کئے جاتے تھے نواب صدیق علی خان نے جو اُس وقت وہاں موجود تھے مجھ سے فرمایا۔ کہ آپ کا اس وقت اُن سے ملنا بہت دشوار ہے۔ میں نے عرض کیا۔ کہ حاضری میرا فرض تھا۔ آپ کارڈ بھجوا دیجئے۔ اگر اس وقت نہ مل سکیں تو میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ ہمارے کارڈ بھجوائے گئے۔ قائد اعظم نے فوراً ہمیں طلب فرما لیا۔ انہوں نے کئی مسائل پر خود ہی گفتگو شروع کر دی۔ میں نے سٹیٹ ڈنر کیلئے عرض کیا۔ تو انہوں نے فرمایا۔

Nizam was rude to me میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا تھا۔ جب میں نے دوبارہ ڈنر کے بارے میں عرض کیا تو انہوں نے فرمایا I do not keep late nights. چنانچہ دوسرے دن کے لئے لنچ طے ہو گیا۔ قائد اعظم نے ہمیں کافی وقت روکے رکھا۔ کئی بار مجھے چائے منگوانے کے لیے فرمایا جو خود بھی پی اور ہمیں بھی پلائی۔ اپنا آئندہ سہ روزہ پروگرام بھی مجھ سے مرتب

[1] یادداشت سابق چیف سیکریٹری خان بہادر اشفاق احمد۔

[2] کنگ کوٹھی۔   نظام کے شاہی محل کا نام تھا۔

کروایا۔ اس سارے وقت میں اُن کا مُوڈ خوشگوار تھا اور انہوں نے حضور نظام سے کسی ناخوشگواری کا ذکرہ نہیں کیا۔ اگلے دن انہوں نے ولی عہد کے ساتھ لنچ تناول فرمایا۔ اور بہت خوشگوار مُوڈ میں رہے۔ اور کھڑے ہو کر نظام کا جامِ صحت نوش کیا اس سے ظاہر ہے کہ قائداعظم کی اگر کوئی ناراضگی تھی تو وہ بالکل وقتی تھی ہو اگر اس داستان میں جسے مرزا اسمٰعیل نے ہوش یار جنگ کی واسطے سے چٹخارے لیکر بیان کیا ہے ذرا بھی حقیقت ہوتی تو کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ تھوڑی سی دیر کے بعد قائداعظم کے مزاج کی کیفیت اپنے معمول پر آجائیگی۔ چیف سکریٹری کی یادداشت اور سیاق سباق سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قائداعظم کی وقتی ناراضگی کی وجہ وہ فیصلہ تھا جو نظام نے مرزا اسمٰعیل کے تقرر کے بارے میں کر لیا تھا جسے وہ قائداعظم کے اصرار کے باوجود بدلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات میں قائداعظم نے اس تقرر کے خلاف کچھ کہا تو نظام نے اُن کی بات پر توجہ دیئے بغیر اپنے فیصلے سے دو ٹوک الفاظ میں آگاہ کر دیا۔ قائداعظم نے جو نظام کی دعوت پر انہیں اس بارے میں مشورہ دینے آئے تھے قدرتی طور پر اسے محسوس کیا اور مزید گفتگو کو تضیع اوقات سمجھ کر واپس ہو گئے۔ چیف سکریٹری سے قائداعظم کے الفاظ Nizam was rude to me نظام کے اس عاجلانہ فیصلے کے اظہار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مولانا مظہر علی کامل کی روایت سے جس میں انہوں نے نظام کو جلد باز کہا تھا یہی اشارہ ملتا ہے۔ سرکاری ضیافت کے بعد کشیدگی ایک حد تک رفع ہو گئی تھی اگر ایک ملاقات اور ہو جاتی تو سب غلط فہمیاں رفع ہو جاتیں۔ دوسری ملاقات کا ایک امکان پیدا ہوا تھا مگر سازشی ٹولے نے اُسے ختم کر دیا۔ ہوا یوں کہ اپنے دوران قیام قائداعظم نے سکندر آباد کے مسلمانوں کے ایک جلسے میں ایک تقریر کی جو نظام کو بہت پسند آئی۔ اور وہ اپنے درباریوں کے سامنے کاغذ قلم لیکر بیٹھ گئے اور خود ہی قائداعظم کے نام ایک خط کا مسودہ تیار کیا جس میں درخواست کی کہ جاتے وقت مل کر جایئے" ہوش یار جنگ کو اس میں اپنے منصوبے کے لئے خطرہ نظر آیا اور اس نے اس کو شاہانہ وقار کے منافی قرار دے کر کہا "یہ مہمان کا فرض ہے کہ وہ میزبان کو مل کر جائے" شاہی تمکنت اس جال میں پھنس گئی اس طرح غلط فہمیوں کی سُلجھانے[1] اور صفائی کا یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔

[1] ہوش یار جنگ۔ مشاہدات صفحہ ۳۰۱۔

اس واقعہ کے بارے میں نظام کی اپنی روایت

سابق چیف سکریٹری نے اپنی یادداشت میں اس واقعہ سے متعلق نظام کی اپنی روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُس کا اقتباس درج ذیل ہے۔۔۔۔۔۔ جب حیدرآباد پر بھارتی افواج کا قبضہ ہو گیا اور فوجی حکومت قائم ہو گئی۔ تو حضور نظام کے مصاحبوں اور درباریوں نے جو ابتک روزانہ اُنکی خدمتیں حاضری دیتے تھے آنا جانا بند کر دیا اس زمانہ میں مجھے اُنکی قربت کا بہت شرف حاصل رہا۔ وُہ دن میں کئی بار طلب کرتے اور برآمدے میں بیٹھ کر دیر تک گفتگو فرماتے تھے۔ ماضی کے اچھے بُرے اقدامات پر تبصرہ ہوتا۔ عام حالات میں اُنسے بے تکلفی سے گفتگو نہیں ہوسکتی تھی مگر اب حالات بدل گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ کوئی اُنسے باتیں کرے۔ ایک دن میں نے اشارۃً قائداعظم کے سگریٹ کے واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس بارے میں جو داستانیں زبان زدِعام ہو گئی ہیں اُن کا انہیں علم ہے ایک چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا لیا گیا ہے

واقعہ یہ ہے کہ اُس دن انہیں نزلہ تھا۔ قائداعظم سگار پیتے ہوئے آئے۔ تو اس کے دھوئیں سے انہیں کھانسی اُٹھنے لگی۔ قائداعظم نے بار بار کھانسنے کی وجہ دریافت کی تو جواب سُن کر I am sorry کہہ کر راکھ دان میں اپنا سگار بجھا دیا۔ اس کے بعد مسئلہ زیربحث پر گفتگو ہوئی۔۔۔۔۔۔[1] نواب صدیق علی خان کی کتاب میں بتایا گیا ہے۔ کہ قائداعظم نے نظام کی موجودگی میں چاندی کے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر جلایا اور پھر نظام کے اعتراض کرنے پر اُسے پھینک کر معذرت خواہ ہوئے۔[2] مولانا مظہر علی کامل۔ چیف سکریٹری اور مرزا اسمٰعیل کے بیانات کے مطابق وہ سگریٹ نہیں بلکہ سگار تھا اور اُسے اُن کی موجودگی میں نہیں جلایا گیا تھا بلکہ وہ حسب عادت پیتے ہوئے تشریف لائے تھے اور اُسے پھینکا نہیں گیا تھا بلکہ راکھ دان میں بجھا دیا گیا تھا چھوٹی چھوٹی باتیں اسطرح زیبِ داستان بن کر کچھ کا کچھ ہو جاتی ہیں

[1] یادداشت سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد۔

[2] نواب صدیق علی خان۔ بے تیغ سپاہی صفحہ ۲۸۲۔

مرزا اسمٰعیل کا دورِ صدارت

حیدر آباد کی صدارت عظمےٰ کا حصول مرزا اسمٰعیل کی دیرینہ خواہش کی تکمیل تھی وہ خود کہتے ہیں کہ ۱۰ سال پہلے انہیں برطانوی حکومت کی طرف سے اس عہدہ کی پیشکش ہوئی تھی۔ دوسری بار لارڈ ویول[1] کے دورِ اقتدار میں اسی پیش کش کی تجدید ہوئی۔ مگر اس وقت اُسے قبول کرنے کے موقف میں نہیں تھے یا ہو سکتا ہے۔ کہ نظام اس پیش کش سے متفق نہ ہوں۔ مرزا اسمٰعیل واضح طور پر کانگریسی رجحانات کے حامل تھے اور انہوں نے میسور اور جے پور کی ریاستوں میں اپنے اقتدار کے پورے دور میں مسلمانوں سے کبھی کسی ہمدردی اور تعلق خاطر کا اظہار نہیں کیا۔ ریاست جے پور میں مغلیہ دور سے اُردو میں کام ہوتا تھا اُن کے دور میں اُردو زبان اس امتیازی مرتبہ سے محروم ہو گئی اور ہندی کو بھی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ قائد اعظم کی دور رس نگاہوں نے اپنی فراست سے جو دیکھ لیا تھا وہ اُنکے اقتدار پر آتے ہی کھل کر سامنے آنے لگا۔ اُنہوں نے آتے ہی بلا پس و پیش اور بلا کسی یقین دہانی کے کانگریس کی تنظیم پر سے پابندی ہٹالی اور ہندو عناصر کو اپنا منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آنے لگا۔ حیدر آباد کی تاریخ میں پہلی بار کانگریس کے اکابر نے حیدر آباد کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ چنانچہ اُن کے حیدر آباد پہنچتے ہی گاندھی جی نے ... انہیں دستوری اصلاحات کے بارے میں اپنے مشورے سے نوازا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ مجوزہ اور اصلاحات کا جو بھی منصوبہ حکومت کے زیرِ غور ہو۔ وہ اُسے یکسر منسوخ کر دیں۔ یہ اصرار اتنا شدید تھا کہ وہ مرزا اسمٰعیل کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع بھی دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ جواہر لعل نہرو نے مقامی کانگریس کے صدر کو اطمینان دلایا۔ کہ مرزا اسمٰعیل کے آنے کے بعد اُنکے منصوبوں اور عزائم کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی[2]۔ کانگریسی اکابر سے مرزا کے تعلقات کا بڑا چرچا تھا نظام سمجھتے تھے کہ یہ تعلقات حیدر آباد کے معاملات کو سلجھانے میں مدد ثابت ہونگے بظاہر یہی خیال مرزا اسمٰعیل کے تقرر کا محرک ہوا تھا۔ مگر ان مبینہ تعلقات سے انہیں کوئی مدد نہ ملی بلکہ اُن کی وجہ سے مقامی ہندوؤں نے کئی مسائل کھڑے کر دیئے برار کے صوبے کی واپسی ایک طرح سے نظام کی کمزوری[3] بن چکی تھی۔ مرزا

---

۱ مرزا اسمٰعیل- My public life صفحہ ۹۰

۲ مرزا اسمٰعیل - مائی پبلک لائف صفحہ ۱۰۳ - My Public Life

۳ یادداشت زیر [illegible] مضمون بعنوان حیدر آباد [illegible] ۱۰ فروری [illegible]

نے اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں کچھ یقین دہانیاں کرائیں مگر انکی پیش رفت سے معاملہ اور اُلجھ گیا اور اُلجھانے والے اُنکے کانگریسی دوست تھے ادھر مسلمان ان سے نالاں تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے موقف[1] سے ہمدردی رکھنے والوں کو چن چن کر انتقام کا نشانہ بنایا۔ جسکی وجہ سے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہو گئی اس طرح مسلمان تو اُن کے خلاف تھے ہی۔ وہ ہندوؤں کا تعاون بھی نہ حاصل کر سکے نظام کو جو توقعات اُن سے تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور انہیں مرزا کے تقرر پر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا اظہار یقیناً اشارتاً اور کنایتاً انہوں نے کیا ہوگا تبھی تو مرزا اسمٰعیل اپنے استعفےٰ میں نظام کے عدم تعاون کی شکایت کرتے ہیں۔ مرزا کا مسلمانوں سے رویہ اتحاد المسلمین کے لیے ایک کھلا چیلنج تھا جو اُس نے قبول کر کے نظم و نسق میں مشکلات پیدا کر دیں۔ مرزا تنگ آ کر حیدر آباد سے رخصت ہو گئے[2]۔ یوں اُنکا مختصر دور جس کی مدت جولائی ۴۶ء سے اپریل ۴۷ء تک ہی تھی ختم ہو گیا اس مختصر عرصے میں اُنکے چند اقدامات ایسے تھے جو حیدر آباد کے مستقبل پر بُری طرح اثر انداز ہوئے۔ پہلی اہم بات یہ تھی کہ نظم و نسق میں کانگریسی رجحانات کو تقویت دے کر انہوں نے اس تنظیم کی طرف سے تخریب کاری کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی اور محب وطن عناصر میں جو کانگریس کی چالبازیوں کی کاٹ کر سکتے تھے بددلی پھیلا دی اور ہر ممکن طریقے سے انہیں تنگ کیا۔ حیدر آباد کو دفاعی اعتبار سے مضبوط بنانے کے لیے نہ صرف کوئی کوشش نہیں کی۔ بلکہ دفاعی ضروریات کو سرے سے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا چنانچہ اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ جو برطانوی فوج سکندر آباد اور بلارم چھاؤنیوں میں چھوڑ رہی تھی اور برین گن فیکٹری جو حیدر آباد کو اس وقت کوڑیوں کے مول مل سکتے تھے مرزا اسمٰعیل نے یہ کہہ کے رد کر دیا کہ حیدر آباد کو کس سے لڑنا ہے جو یہ روگ پالے[3]۔ اس طرح گویا وہ پہلے سے ہی ارادہ کر کے اور بھارتی حکومت کو یقین دہانی کر کے آئے تھے کہ حیدر آباد بھارت میں ضم ہو جائے گا۔

نواب چھتاری دوسری بار

مرزا اسمٰعیل کے جانے کے بعد اتحاد المسلمین کو یہ خدشہ تھا کہ

---

۱ میر لائق علی - ٹریجیڈی آف حیدر آباد صفحہ ۹۰ - Tragedy of Hyderabad

۲ مرزا اسمٰعیل - مائی پبلک لائف - صفحہ ۱۰۰ - My Public Life

۳ میر لائق علی - ٹریجیڈی آف حیدر آباد صفحہ ۷۵ - [illegible] اسلحہ کے ذخیرہ کی خریداری کی تجویز [illegible] مرزا اسمٰعیل کے پیش [illegible]

نظام اُن کے نقطۂ نظر سے کسی ناپسندیدہ شخصیت کو نہ منتخب کرلیں۔ چنانچہ اُن کا رُجحان واضح طور پر نواب چھتاری کی طرف تھا۔ نظام کی بھی یہی سوچ تھی چنانچہ انہوں نے نواب چھتاری کو اپنے مکتوب مورخہ ۲۷ مئی ۴۷ء میں[۵۱] باقاعدہ بلوا بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی اتحاد المسلمین نے اُن کے پاس ایک وفد جو سید تقی الدین سابق سکریٹری حکومت حیدرآباد اور یامین زبیری معتمد اتحاد المسلمین بھیجا بہت گلے شکوے ہوئے اپنے گزشتہ تلخ تجربہ کی بنا پر نواب چھتاری کو اس پیش کش کو قبول کرنے میں بجا طور پر تذبذب تھا۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات میں بتایا ہے کہ انہوں نے قائداعظم اور نواب بھوپال سے اس بارے میں مشورہ کرکے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔ بعد کے آنے والے واقعات نے ثابت کردیا کہ نواب[۵۲] صاحب کی طویل سیاسی اور سرکاری زندگی میں یہ رضامندی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی سابق چیف سکریٹری اشفاق احمد نے ایک مرتبہ نواب صاحب سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ مسلمانوں کی خدمت کے لئے قائداعظم کی ہدایت سے رُوگردانی نہیں کرسکتے تھے ان حالات میں اُنکا یہ جذبہ خدمت لائق تحسین ہے۔ کیونکہ اس اقدام سے انہوں نے اپنے وقار اور خود داری کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ ابھی انہوں نے چارج ہی لیا تھا۔ کہ سر والٹر مانکٹن اور اتحاد المسلمین میں اعلان آزادی کے مسودہ پر اختلاف رائے ہوگیا۔ قاسم رضوی نے بالا ہی بالا نظام کے نام ایک خط میں مابہ نزاع نقطہ کے ضمن میں یہ بھی لکھ دیا۔ چونکہ چھتاری کانگریسی حکومت کی رعایا ہیں اس لئے ان کا کانگریس سے متاثر ہونا لازمی ہے اُن کے ساتھ بھارتی حکومت سے گفت و شنید کے وقت دو وزرا حیدرآباد کے باشندے بھی ہونے چاہئیں۔[۵۳] ۲۵ جون کو قاسم رضوی اور سید تقی الدین نواب صاحب سے ملنے کے لئے آئے۔ دوران گفتگو انہوں نے ان حضرات سے کہا کہ "اتحادی حلقوں میں میرے دور وزارت کو 'دورِ مجہول' کا نام دیا جاتا ہے۔ آپکے ریکارڈ کے پیش نظر اس کا کیا جواز ہے؟" اس پر انہوں نے ٹالتے ہوئے کہا "اُس زمانے میں جو کچھ ہُوا سو ہُوا۔ آج کل کے

---

[۵۱] مکتوب بنام نواب چھتاری خود نوشت سوانح حیات صفحہ ۲۱۵

[۵۲] خود نوشت سوانح حیات صفحات ۲۱۹ - ۲۲۱ -

[۵۳] خود نوشت سوانح حیات صفحہ ۲۲۴ -

مسلمان کا زُور اں مُدواں آپکے ساتھ ہے"[۵۴]

اس دلچسپ ملاقات اور اس میں کی ہوئی دلچسپ یقین دہانی کے چند ہی روز بعد نواب چھتاری کو اتحاد المسلمین کی طرف سے ایک ہدایت نامہ وصول ہوا۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئیے۔ اور کیا نہیں کرنا چاہئیے اور اُن کی سیاسی حکمت عملی کیا ہونی چاہئیے۔ ظاہر ہے۔ کہ کوئی وزیراعظم کسی سیاسی پارٹی کا اس طرح تابع نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ابتدائی گرمجوشی کی فضا کے قلعہ میں اس وقت رخنہ پڑا۔ جب نواب صاحب نے اس مطالبے کو قطعی طور پر مسترد کردیا۔ نظام کی طرف سے اعلان آزادی نے عارضی طور پر شگاف کو پُر کردیا۔ اور پوری ریاست میں ہر طبقہ اور ہر فرقہ نے اپنی مرضی اور خوشدلی سے جشن آزادی منایا۔

---

[۵۴] خود نوشت سوانح حیات صفحہ ۲۲۷ -

حصہ اوّل

پانچواں باب

حیدرآباد کے معاشرے کے خدوخال

تہذیب اور طرزِ معاشرت کی جھلکیاں

مسلمانوں کی جو تہذیب و ثقافت مغلوں کی دلّی میں پروان چڑھی تھی مگر دور وقت کے ساتھ ناساز گار حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے ایک طویل سفر پر روانہ ہوئی اور مغلیہ جاہ و جلال کے آخری پڑاؤ پر آکر ڈیرہ ڈال دیا اور مقامی آبادی پر گہرے اور ان مٹ نقوش ثبت کر دئے۔ حیدرآبادی تہذیب بھی ہماری قومی زبان کی طرح ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنے والوں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور پروان چڑھی اس وجہ سے وہ ایک مخصوص انفرادیت کی حامل تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اس تہذیب میں اچھے پہلو بھی نظر آتے ہیں اور ایسے بھی جو ایک زوال پذیر معاشرے کی خصوصیت ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کی معاشرت میں نفاست۔ سلیقہ۔ صفائی۔ رہن سہن کے طریقے۔ معاشرتی آداب اور وضعداری اُس کے امتیازی نشان تھے۔ شادی۔ بیاہ اور دوسری سماجی تقریبات بھی ایک خاص قسم کے معاشرتی آداب کی عکاسی کرتی تھیں ان رسومات کے تقاضوں کی پابندی اتنی ناگزیر تھی کہ انہیں پورا کرنے کے لئے مہاجنوں کے سودی جنگل میں پھنس جانا بھی گوارا کر لیا جاتا تھا۔ مجھے ذاتی طور پر جو چیز خاص طور پر وہاں کی تہذیب میں متاثر کرتی تھی وہ اُس کی انفرادیت تھی جو کچھ تھا اُن کا اپنا تھا اور وہیں کے ماحول سے پیدا ہوا تھا۔ باہر کے مانگے تانگے کے خیالات اور تصورات کا اُس معاشرے میں عمل دخل نہیں تھا۔ فرقہ واریت جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ایک لعنت بن گئی تھی اُس کا حیدرآباد میں کہیں نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ مختلف طبیعت۔ مزاج اور عقیدے کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے عقیدے اور خیالات کا احترام کرتے تھے اور تہواروں میں شریک ہوتے

تھے لباس خالص قومی تھا اور اس میں اتنی یکسانیت ہوتی تھی۔ کہ پہلی نظر میں ہندو اور مسلمان میں تمیز کرنا مشکل تھا مقامی روایات کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ مقامی کیلنڈر بھی اپنا تھا جمعہ کی چھٹی وہاں اس وقت ہوتی تھی۔ جب ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا قومی زبان اُردو تھی جسے ہر سطح پر سرکاری اور غیر سرکاری طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

دورِ عثمانی میں ہمہ جہتی ترقی

میر عثمان علی خان آصف سابع کے دور میں حیدرآباد میں ہمہ جہتی ترقی ہوئی قطب شاہی دور کے شہر کا نقشہ بدل گیا آبپاشی کیلئے بڑے بڑے بند تعمیر کئے گئے۔ زراعت کو ترقی ہوئی تعمیراتی منصوبے تکمیل پائے حیدرآباد شہر کی سڑکیں سیمنٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ گندے پانی کے اخراج کا انتظام تھا اُسی دور میں جامعہ عثمانیہ کے عظیم منصوبے نے تکمیل کے مراحل طے کئے اور قومی زبان کو وہ درجہ ملا جسکی کہ وہ مستحق تھی نظم و نسق میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئیں عدلیہ انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہوئی۔ مواصلات کا ایسا مربوط نظام معرض وجود میں آیا جسکا مقابلہ آج ۳۰ برس پہلے ہندوستان کا کوئی علاقہ کر سکتا تھا اور نہ آج بھارت اور پاکستان کا کوئی علاقہ پورے ہندوستان میں اسلامی اور غیر اسلامی فلاحی ادارے حکومت حیدرآباد کی معارف پروری سے فیضیاب ہوئے یونانی طریقہ علاج کی پذیرائی ہوئی۔ اور اس کے فروغ کے لئے ایک جدید طرز کا ہسپتال قائم ہوا۔ جو جدید ترین سہولتوں اور اوزاروں سے لیس تھا۔ تجارت فروغ پذیر تھی اور رعایا نسبتاً خوشحال اور اپنے حال میں مگن تھی حیدرآباد کی تہذیبی اور معاشی زندگی کے یہ احسن پہلو تھے۔ مگر اس کے ساتھ مسلمانوں کی حد تک ------ جن کے ہاتھ میں عنان اقتدار تھی) زندگی کے کچھ ایسے رُخ تھے جو معاشرتی جمود کی نشاندہی کرتے تھے۔

قوموں کا عروج و زوال

ایک مسلّم حقیقت ہے۔ کہ ہر کمالے را زوالے کے مصداق عروج کے بعد زوال ہر قوم کا مقدّر ہوتا ہے مسلمانوں کی اپنی تاریخ بتاتی ہے۔ کہ جب ایک اسلامی حکومت اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے روگردانی کر کے اپنی من مانی کرتی ہے۔ وہ رو بہ زوال ہو کر بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ زوال یکلخت نہیں آتا یہ ایک تدریجی عمل ہے چند عوامل اور محرکات ایسے ہوتے ہیں جو معاشرے پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہو کر اُسے زوال کے راستے پر لے جاتے ہیں۔ صحتمند معاشرہ وہ ہوتا ہے۔ جسکی اخلاقی بنیادیں مضبوط

ہوں۔ جس کی خودکار قوتیں ایسی ہوں۔ جو دوسرے کی بیساکھیوں کے سہارے پر نہیں بلکہ اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا ہونے اور ترقی کی منزلوں میں آگے بڑھنے کی سکت رکھتا ہو۔

حیدرآبادی معاشرے کے عناصر اربعہ

اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں یہ کھوج لگانا ضروری ہے کہ حیدرآباد میں وہ کون سے عوامل اور محرکات تھے جنہوں نے زوال کے لئے راستہ ہموار کیا۔ اس معاشرے میں چار ترکیبی عناصر تھے۔

(الف) حکمران اور اس کے درباری۔ (ب) اُمراء اور جاگیردار۔ (پ) کارکنان حکومت۔

(ت) سیاست دان اور عوام۔ ان چاروں عناصر کے بارے میں اہل دانش کے جو تاثرات ہیں۔ وہ ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

(الف) حکمران اور اُس کے درباری۔ خانوادہ آصفیہ کی دکن میں کم و بیش ڈھائی سو سال کی حکومت رہی اُس کی نوعیت مطلق العنانی کی تھی اور حکمران وقت کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا ایسا حکمران اگر رعایا پرور ہو صاحب ضمیر ہو۔ اور اُمور سلطنت اور مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اُس کے احکامات خالصتاً رعایا کے مفاد میں ہوں تو تجربہ بتایا ہے کہ ایسا نظام حکومت آج کل کی کھوکھلی جمہوریت سے جس میں ہر چالاک۔ بے ضمیر آدمی کے لئے دوسروں کو اُلّو بنانے کے لئے کھلا میدان ہوتا ہے بہتر ہوتا ہے۔ مگر ایسے حکمران کی مشکل یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دُور اپنے طالع آزما درباریوں کی سازشوں اور کھینچا تانیوں میں گھر جاتے ہیں اُن کی اپنی رائے باقی نہیں رہتی۔ آہستہ آہستہ اُنکی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی صورت حیدرآباد کی تھی یہ درباری بھی عجیب لوگ ہوتے تھے وہ گالیاں کھاتے تھے اور ..... اُن کو سُن کر خوش بھی ہوتے تھے مگر اپنی بات کہے جاتے تھے۔ خوشامد۔ چاپلوسی۔ مسخرا پن اُنکے وجود کی واحد خصوصیت ہوتی تھی۔ مزاج شناس ہونے کی وجہ سے وہ حکمران وقت کے مزاج اور رجحانات پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے تھے اور باتوں ہی باتوں میں کوئی شوشہ چھوڑ کر بڑے سے بڑے امیر یا عہدہ دار کو سرِعام رُسوا کر دیتے تھے صاف سُتھرا ماحول اُن کی کارگزاریوں کے لئے سازگار نہیں تھا اس لئے اُنکی کوشش یہی رہتی تھی کہ سازشوں کا چکر چلتا رہے۔ ان لوگوں کی لگائی بجھائی سے حکمران اپنی حکومت کا خود حریف بن جاتا تھا اور حکومت مختلف قوتوں کی رزم آرائیوں کا اکھاڑہ بنکر کمزور پڑ جاتی تھی چنانچہ بیسویں صدی کے

اوائل ہی سے اکبر جنگ۔ عماد جنگ۔ اظہر جنگ۔ ہوش یار جنگ۔ زین یار جنگ۔ شہید یار جنگ منظور جنگ۔ دین یار جنگ جیسے درباری شاہی محل پر چھائے رہے۔ اور اپنے اپنے وقتوں میں سالار جنگ ثالث مہاراجہ سر کشن پرشاد۔ سر علی امام۔ سر اکبر حیدری۔ نواب چھتاری اور میر لائق علی ان کی سازشوں کا ہدف بنتے رہے قائد اعظم کے مشورے کے خلاف مرزا اسمٰعیل کو صدارت عظمےٰ پر فائز کرانے میں بھی اُنکا ہاتھ تھا جس سے حیدرآباد کو اجتماعی طور پر بہت نقصان ہوا۔ ان حضرات کی نظر کرم صرف وُزراء اور اُمراء پر ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ متوسط طبقے کے عہدہ دار بھی اُن کی زد میں آجاتے تھے مثال کے طور پر میرے والد محترم جو ایک محنتی اور متدین بزرگ تھے اپنے ابتدائی دورِ ملازمت میں انہی لوگوں کی لگائی بجھائی کی وجہ سے ایک عرصہ تک معتوب رہے۔ علاوہ اور الزامات کے نظام کے کان میں یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ قادیانی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ خفیہ پولیس کے ذریعہ تحقیقات کرائی گئی جب الزام غلط ثابت ہُوا۔ تو کہیں جا کر چھٹکارا ہُوا۔ اسیطرح جب سر علی امام رخصت ہوئے تو درباریوں نے نظام کو یہ باور کرایا۔ کہ فخر یار جنگ کا رخصت ہونیوالے صدر اعظم سے بہت "خلاملا" تھا۔ جواب طلبی پر والد محترم نے عرض کیا کہ سر علی امام صدرِ اعظم تھے اور وہ ایک معمولی عہدہ دار۔ اگر صدرِ اعظم کے احکامات کی تعمیل "خلاملا" کی تعریف میں آتا ہے تو اور بات ہے ورنہ وہ خود ایسا دعویٰ کرنے کی کیسے جسارت کر سکتے ہیں تب کہیں جا کر اُن کی خلاصی ہوئی۔

اُمراء اور جاگیردار

پائگاہ کے اُمراء نظام کے بہت قریبی عزیز تھے ملک میں بہت سے دوسرے اُمراء اور بڑے بڑے جاگیردار تھے ان کے اجداد نظام آصف جاہ اول کے ساتھ آئے تھے اور اس وقت سے خانوادہ آصفیہ کے دامن سے وابستہ تھے۔ اپنے روابط کیوجہ سے ان لوگوں کا حکومت میں کافی عمل دخل ہوتا تھا مگر چونکہ اُنکی اپنی حیثیت حکمران وقت کے نظر کرم کی محتاج ہوتی تھی اس لئے کوئی صحیح اور صائب مشورہ دینے کے بجائے یہ طبقہ اپنی خیر اسی میں سمجھتا تھا کہ وہ حکمران کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے۔ ان امراء کے تصرف میں بڑے وسیع علاقے تھے۔ جہاں وہ بلا شرکت اپنی مرضی اور خیال کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ ان کا طریقہ ...... حکومت کئی اعتبار سے مملکت کے نظام حکومت سے بھی زیادہ جابرانہ ہوتا تھا نظام کے سوا اُن سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ زیادہ تر اپنی من مانی کرتے تھے سر آسمان جاہ، سر خورشید جاہ، سر وقار الامراء بڑی وجیہ اور باوقعت شخصیتیں تھیں مگر اُن کی اولاد میں کوئی امتیازی خصوصیت باقی نہ رہی تھی وہ لوگ ایک خیالی دنیا میں بستے تھے۔

جسکا حدود اربعہ اُنکے حرم سراؤں اور محلات تک محدود تھا۔ شیر خواری کے زمانے میں وہ چاندی کے جھولوں میں پروان چڑھتے تھے اور جاہل انّاؤں اور چھوکریوں ۔۔۔ کی گود میں کھیلتے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی یورپ سے درآمد کی ہوئی میموں جنھیں گورنسیں" کہا جاتا تھا کے سپرد کر دیا جاتا تھا[1] جن سے وہ مغربی تہذیب کا کچا پکا سبق سیکھتے تھے اور جوانی میں محلوں میں پروردہ چھوکریوں اور خواصوں کی فوج بے ہنگام کی پناہ میں آجاتے تھے اُنکے اجداد کبھی میدان کارزار کے شہسوار تھے۔ نازوں میں پلے ان نوجوانوں میں یہ خواص ناپید تھے۔ مگر وہ اب بھی اپنے اجداد کی شان و شوکت کو سینہ سے لگائے ہوئے دربار سجاتے تھے۔ ایسے دربار جو بعض وقت اپنے کرّوفر اور ٹھاٹھ میں نظام کے درباروں سے بھی بڑھ جاتے تھے ان میں بعض دربار بڑی امتیازی خصوصیت کے حامل ہوتے تھے مثلاً ایک امیر کے دربار میں رت جگا ہوتا تھا اور سارا دربار رات ہی کو سجتا تھا۔ صدق جائسی نے شاہزادہ معظم جاہ کے دربار کی تصویر اپنی کتاب دربار دُربار میں بڑے لطیف اور دلچسپ انداز میں کھینچی ہے۔ شاعرانہ تخئیل آرائیوں سے قطع نظر اس میں اُمراء کی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور نظر آجاتا ہے۔ یہی حال بڑے جاگیرداروں کا تھا اُمرائے عظام کی طرح اُن کی اولاد بھونرے میں تو پرورش نہیں پاتی تھی مگر ان میں تعلیم کی بہت کمی تھی زندگی کی سب سہولتیں میسر تھیں پھر ہاتھ پاؤں ہلانے کی کیا ضرورت تھی

اس طبقہ کے نوجوانوں کا زیادہ وقت لایعنی اشاغل کبوتر بازی۔ مرغ بازی پتنگ بازی اور گھوڑ دوڑ میں گذرتا تھا۔ گنجفہ (تاش) کا شوق بھی وبا کی طرح پھیل گیا تھا اس شغل میں وہ کئی گھنٹوں کی نشست میں اپنی صحت ۔۔۔۔ وقت اور روپیہ برباد کرتے تھے اس طرح جاگیردار باپ اپنی اولاد اور متعلقین کو کاہلی۔ عیاشی اور غیر فطرتی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ چھوٹے جاگیردار اپنی گذران جاگیر کی آمدنی سے کرتے تھے۔ کوئی کام نہ کبھی کیا تھا نہ کرنے کی کوئی خواہش تھی۔ کاہلی اور ناعاقبت اندیشی کا یہ عالم تھا۔ کہ ان میں بہتوں کو اپنی جاگیر کا رقبہ معلوم تھا نہ اُس کے مسائل کا علم تھا۔ شکار کھیلنے کا شوق کبھی کبھار انہیں اپنی جاگیر میں لے جاتا تھا اس سے زیادہ انہیں اپنی جاگیر سے سوائے

[1] تذکرہ حیات حضرت حیدر آباد (مصنفہ ابوظفر مرید الدین حسن فاروقی)۔

آمدنی کے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ سارا انتظام منشیوں اور کارندوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حیدرآباد کے المیے کے بعد تعلیم سے عاری[1]۔ محنت و مشقت سے ناآشنا۔ خیالی دنیا کے یہ باسی سب سے زیادہ متأثر ہوئے۔

(ب) عہدہ داران حکومت۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سیولین طبقہ آہستہ آہستہ مملکت کے تمام نظم و نسق پر حاوی ہو چکا تھا۔ جس سے اُسکا معیار نمایاں طور پر بلند ہو چکا تھا۔ مگر من حیث الجماعت یہ طبقہ عوام سے بہت دُور تھا۔ انہوں نے برطانوی ہند کی سول سروس کی خصوصیتوں کی پوری طرح سے اپنا لیا تھا انہیں اقتدار اور دولت کا غرّہ تھا اور وہ ایک ہی چھلانگ میں ماضی کی سب محرومیوں کی تلافی چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے علاقائی عصبیت کو ہوا دی۔ اور مقصد براری کے لئے خوشامد اور چاپلوسی کو ذریعہ بنایا۔ ملک کی ترقی میں حب الوطنی کے جذبے سے کام کرنے کے بجائے اُن کا بیشتر وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے۔ اپنے مفاد کو پروان چڑھانے اور اپنی سطح پر اور بعض وقت سیاسی پارٹیوں کی مدد سے سازش کرنے میں گذرتا تھا۔ اس طبقہ میں ملکی اور غیر ملکی کی چپقلش بھی تھی جسکا ہدف زیادہ تر وہ عہدہ دار ہوتے تھے جن کا دُور یا قریب کا کوئی تعلق شمال ہندوستان سے ہوتا تھا حیدرآباد میں حصول ملازمت کے لئے سفارش اور پیروی بھی رائج تھی جس سے مستحق لوگوں کی حق تلفی ہوتی تھی رشوت اتنی تو نہیں تھی جتنی آجکل یہاں نظر آتی ہے۔ مگر نرخ بہرحال یہاں سے کم تھا عہدہ داران کا طبقہ خیالی محرومیوں کا شکار تھا۔ زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کی وجہ سے وہ ملک کی فلاح اور ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اُسنے ایسا نہیں کیا۔ وہ نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اجارہ داری چاہتا تھا جب اُسکے حصول میں کوئی رکاوٹ نظر آتی تھی تو جھنجھلا کر اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ ہی اتنے مگن تھے کہ حیدرآباد کے المیے کے بعد بھی وہ بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ جس سے انہیں من حیث الجماعت کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

(ت) سیاست دان اور عوام۔ حیدرآباد کے معاشرے میں سیاست دانوں کی جڑیں زیادہ

[1] پروفیسر حبیب الرحمٰن۔ سابق اُستاد جامعہ عثمانیہ مضمون بعنوان۔ برصغیر کی ایک مسلم ریاست حیدرآباد دکن شائع شدہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۹ ستمبر ۸۳ء۔

مضبوط نہیں تھیں آخری دور میں اُن کی جذباتی باتوں سے مسلمان عوام کافی متاثر ہوئے - مگر جذبات میں بہہ جانے کی وجہ سے فائدے کے بجائے نقصان اُٹھانا پڑا - اصل بات یہ تھی - کہ قابلیت اور اچھا ذہن رکھنے والے نوجوان سب سرکاری ملازمت سے منسلک تھے - اس لئے سیاست ایسے عناصر کے ہاتھوں میں چلی گئی جن کا قابلیت - ذہانت، کردار کے اعتبار سے کوئی مقام نہیں تھا - یہی وجہ ہے کہ ۴۷ - ۴۸ کے ہنگامی اور نازک دَور میں جب اُن کا واسطہ بھارت کے گھاگ سیاست دانوں سے پڑا تو وہ بری طرح مات کھا گئے

عوام

عوام مملکت آصفیہ کم و بیش ڈھائی سو سال سے قائم تھی اس سے پہلے دکن میں مسلمانوں کا اقتدار کئی صدی سال سے چلا آرہا تھا اس لئے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں پر اجارہ داری حاصل تھی مگر یہ صورت شہر کی حد تک ہی تھی - دیہاتوں میں اُنکے مالی اور معاشرتی حالات اچھے نہیں تھے - تجارت - زراعت اور دیگر سب پیشے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے - مسلمان صرف محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے - تعلیم بہت کم تھی اردو زبان میں کچھ شُد بُد رکھتے تھے - مگر عام طور پر وہ مقامی زبان ہی میں بات چیت کرتے تھے حیدرآباد میں پٹیل - پٹواری کے عہدے موروثی ہوتے تھے

پٹیل عام طور پر برہمن ہوتے تھے پٹواریوں کا تعلق ہندوؤں کے دوسرے طبقوں سے ہوتا تھا اس طرح دیہی نظام میں مسلمانوں کا کوئی مقام نہیں تھا جسکی وجہ سے اُنکی پوزیشن بہت کمزور تھی لیکن اقتدار کا نشہ لیا تھا ہے۔ کہ چھوٹی سے چھوٹی حیثیت کا مسلمان بھی اچھوت اقوام کے افراد سے ذلت کا برتاؤ کرتا تھا یہ اُن کی سب سے بڑی غلطی تھی - کیونکہ اگر اُسی طبقہ کے ہی دل موہ لئے ہوتے تو اچھوت جو اُنکے ذلت آمیز رویّہ کے زخم خوردہ تھے ظالموں کے ساتھ مل کر اُن کی بربادی میں حصہ نہ لیتے الغرض - مسلمان آبادی کے لحاظ سے اقلیت میں تھے معاشی اعتبار سے جو ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھے - معاشرتی اعتبار سے وہ اکثریتی طبقے کی آبادی میں گھرے ہوتے تھے مادی وسائل پر اُنکا کوئی کنٹرول نہیں تھا - لیکن اس حالت میں بھی یہ گہرا احساس تھا جسکا کہ وہ کھلم کھلا اظہار کرتے تھے کہ اُنکا حکومتی طبقہ سے تعلق ہے - ان حالات میں مصیبت کے وقت اُنہیں غیر مسلم آبادی سے تعاون اور ہمدردی کی کیا توقع ہو سکتی تھی -

حصّہ دوم

پہلا باب

ایک برطانوی مشیر

والٹر مانکٹن عالمی شہرت کے ایک برطانوی قانون دان سر والٹر مانکٹن ایک عرصہ سے حیدرآباد کے دستوری مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے - سر اکبر حیدری کے دور میں وہ گول میز کانفرنس میں اُن کے ساتھ تھے - ۱۹۳۶ء میں برار کے مسئلہ میں ایک عارضی سمجھوتہ کرانے میں بھی انہیں کامیابی ہوئی - اس سمجھوتے کے تحت برار کا نظم و نسق تو علی حالہ قائم رہا - مگر حیدرآباد کے ولی عہد شاہزادہ برار بن گئے - اور نظام کے مفاد کی نگرانی کے لئے حیدرآباد کیطرف سے برار میں ایک ایجنٹ جنرل کا تقرر ہو گیا ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری کے موقعہ پر سر والٹر مانکٹن اُنکے مشیر خاص تھے اور بُرے وقت میں ہر مرحلہ پر اُن کا ساتھ دیا - جنگ کے زمانہ میں برطانوی حکومت کی طرف سے انہیں بڑے اہم فرائض سونپے گئے - اس طرح برطانوی حکومت کے ارباب حل و عقد میں اُنہیں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا - ۴۷ - ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد کے بھارت سے سیاسی مذاکرات میں انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا - اُن کو بار بار لندن سے بُلایا جاتا تھا - سر اکبر حیدری سے لیکر سب صدر اعظم (سوائے سر مرزا اسمٰعیل کے) اور خود نظام اُن کا بڑا احترام کرتے تھے - لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے وہ ذاتی دوست تھے - اس لئے موصوف کے وائسرائے کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اُن کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی - لیکن اُن کی قانونی قابلیت دستوری مسائل میں گفت و شنید کی مُسلّم صلاحیت - برطانوی حکومت میں اثر و رسوخ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے دوستی حیدرآباد کے کسی کام نہ آئی - وائسرائے سے اُنکے دوستانہ تعلقات نے حکومت حیدرآباد سے بعض تلخ حقائق کو پوشیدہ رکھا - سر والٹر مانکٹن نے جب کبھی برطانیہ سے معاہدات پر زیادہ تکیہ نہ کرنے کا مشورہ دیا - تو تب بھی وہ اپنی ناقابل یقین خوش عقیدگیوں اور خوش فہمیوں میں مبتلا رہی - وہ اپنے بھولے

پن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ برطانیہ نے اپنی پوری تاریخ میں اپنی مخصوص سیاست کے مقابلے میں نہ کسی کی دوستی کی پرواہ کی نہ کسی کے احسان کو یاد رکھا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ اپنے موقف کی پختگی اور اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتے مذاکرات میں اُن کی مہارت ہی کو سب مشکلات کا حل سمجھ لیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ جس ملک نے بیوفائی کے سب ریکارڈ توڑ دیئے۔ اور برسوں کے معاہدات کو نہایت بے شرمی سے بھلا دیا۔ اُسی کا ایک شہری حیدرآباد کا اہم مشیر تھا۔ اور مذاکرات کے پورے دور میں وہی پیش پیش تھا۔ لیکن یہ ناانصافی ہوگی اگر سر والٹر کی حیدرآباد کے مسئلہ میں ذاتی وابستگی اور لگاؤ کا ذکر نہ کیا جائے۔ اُس سے تصویر کا دوسرا رُخ نظر آتا ہے۔ حیدرآباد اور بھارت کے مذاکرات میں جن کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔ اُن کے کردار کو جانچنے اور سمجھنے کے لئے اُنکی سوچ و فکر کے انداز کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ انہیں اپنے ہم وطنوں کی طوطا چشمی سے بجا طور پر شکایت تھی اور اُنکے طرز عمل پر شدید جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے تھے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے۔ کہ سر والٹر کے اس پہلو کو ریکارڈ پر لایا جائے۔

جنوری ۱۹۴۶ء کیبنٹ مشن کے آنے سے دو ماہ قبل جب وہ حیدرآباد آئے تو انہوں نے نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ سر اکبر حیدری رخصت ہو چکے تھے اور اُن کی جگہ نواب احمد سعید خان چھتاری صدر اعظم تھے۔ نظام بھارت سے الحاق سے بدستور انکاری تھے اور برار۔ شمالی سرکار اور دوسرے مقبوضات کی بازیابی کیلئے انہیں بڑی فکر تھی۔ بدلے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر سر والٹر کا خیال تھا کہ اس مرحلے پر ان علاقوں کی واپسی حیدرآباد کے لئے مزید سیاسی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ مطالبہ دوسری مراعات حاصل کرنے کے لئے سودا بازی کے لئے تو استعمال ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سیاسی حالات کے پیش نظر اقتدار اعلیٰ کے تصور میں بھی کچھ لچک پیدا ہونی چاہیئے تاکہ اگر ممکن ہو۔ تو حیدرآباد میں اسلحہ سازی کا کام شروع کر دیا جائے۔ جبکی فی الوقت برطانیہ سے پرانے معاہدات کے تحت ممانعت تھی۔ دستوری اصلاحات کو نافذ کرنے پر بھی وہ برابر زور دیتے رہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بڑے مقصد کے خلاف مخالفانہ پروپگنڈے کا سدباب اصلاحات کے نفاذ سے ہی ہو سکتا ہے۔

لہ والٹر مانکٹن مصنفہ لارڈ برکنھیڈ صفحہ ۲۲۰

Walter Monckton by Lord Birkenhead

سر سٹیفورڈ کرپس کا کانگریس کیطرف جھکاؤ

کرپس کے انڈین نیشنل کانگریس کیطرف واضح جھکاؤ سے وہ بہت نالاں تھے اور ریاستوں کے معاملے میں اُلجھاؤ کی پالیسی ان کی نظر میں بڑا غیر منصفانہ رویّہ تھا۔ برطانوی معاہدوں کی قدر و قیمت کا بھی اندرون خانہ انہیں کافی اندازہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے لگی لپٹی کے بغیر حیدرآباد پر اپنے شبہات کو واضح کر دیا تھا۔

"I have told them that although the U.K. government is not likely to admit it, the old treaty obligations for the protection of the state and dynasty can not be relied on. I do not believe that the British will be prepared to send their sons to fight, to preserve the Nizam against democratic India"

انہیں یقین تھا کہ آڑے وقت[1] میں یہ معاہدے کسی کام نہیں آئیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہموطنوں کا پرانے وعدوں اور یقین دہانیوں سے پھر جانے کا انہیں بہت قلق تھا اس کا اظہار انہوں نے لارڈ اسمے کے نام اپنے خط مورخہ ۶ جون ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کی خصوصی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے کیا۔

The policy of the Nizam has always been and still is to retain and increase the ties which find him to the British. Can you be surprised, if in the circumtances, he can not bring himself to trust the Hindus for his future, for they have proved no friends of his or ours? He asks: Am I really to be kicked out of the British family without discussion. Will you really just denounce the treaties, refuse me political and economic arrangements with H.M.G and otherwise leave me to my fate. I think this rather a shameful performance. How ready are we to oppease our enemies at the expense of our friends. This is because the latter have no nuisance value."

لہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۲۰

پھر انہی خیالات کا اعادہ انہوں نے سر ونسٹن چرچل کے نام اپنے خط میں یوں کیا[۱]

"There are many treaties whereby the British Government have guaranteed the protection of the state and the Dynasty against internal disorder and external aggression. These treaty obligations have been constantly reaffirmed in recent years notably by Cripps himself in 1942. Now it seems to be suggested that he can denounce or forget the treaties walk one to and leave the states to make the best terms they can with the politicions of British India. What a hope we should have with Congress! I must say that it sticks in my gizzard when I think of our complacently letting the Nizam and the Princes down in favour of Congress. When one thinks of the attitude of the Princes in both world Wars and that of Congress in 1942, one wonders if we must always be driven to let down our friends and appease our enemies"

۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کے نام[۲] ایک خاص خط میں اُنہوں نے حیدرآباد کے مسئلہ میں ان کی پالیسی پر تنقید کی۔ اس میں یہ بھی بتایا کہ نظام اُن پر زور دے رہے ہیں کہ وہ لندن جا کر اس پالیسی کے خلاف ایک محاذ قائم کریں۔ ۱۹ جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر لارڈ لسٹول نے وزارت ہند کو یہ تجویز پیش کی کہ سوال و جواب کی شکل میں حزب اختلاف کے واسطے سے گورنمنٹ

Monckton papers quoted in Walter Monckton by Lord Birkenhead.

[۱] سر والٹر مانکٹن مکتوبہ مولفہ لارڈ برکنہیڈ صفحہ ۲۲۱
[۲] " " " " ۲۲۳

برطانیہ کی ریاستوں کی پالیسی کی وضاحت حاصل کی جائے اس کے لئے سوال و جواب کا ایک مسودہ بھی تیار ہوا۔[۱]

خودکشی پر تلا ہوا بچہ

وقتاً فوقتاً ان کے دیئے ہوئے مشوروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر والٹر مانکٹن چاہتے تھے کہ وہ نظام کو ایسے اقدام سے روکیں یا ایسی صورت حال سے بچائیں جس سے اُنکی حکومت اور خانوادہ آصفیہ کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ آسان کام نہیں تھا اور اس کا اُنہیں بخوبی احساس تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنی بیٹی کے نام ایک خط میں نظام سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ایک ایسے بچے سے مشابہت دی جو خودکشی پر تُلا ہوا ہو۔ اُنکا کام یہ ہے کہ اُس خودکشی سے روکیں یا کم از کم اُسے اس ارادہ کو ملتوی کرادیں۔[۲]

نومبر ۱۹۴۶ء کو جب انہیں لندن سے طلب کیا گیا۔ تو جن اُمور پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی اُنمیں برار کی واپسی۔ نظم و نسق میں باب حکومت کے اختیارات کی منتقلی اور مارماگوا کسی اور بندرگاہ کے حصول یا استعمال کی اجازت کی کارروائی جیسے معاملات شامل تھے۔ اُن کی نظر میں کسی ایک بندرگاہ کا حصول مملکت حیدرآباد کی بقا کے لئے اشد ضروری تھا۔

لارڈ ویول کی اقتدار اعلیٰ سے علیحدگی کا انہیں رنج تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ لارڈ ویول کو روساء سے ہمدردی تھی اور اُن کے دور میں ایک حد تک منصفانہ رویہ کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اسلئے کے بیان میں اقتدار اعلیٰ کے معاہدات میں ترمیم کے امکانات موجود تھے، اس لئے انہوں نے سر مرزا اسمٰعیل جو اُس وقت تک صدارت عظمٰے کا عہدہ سنبھال چکے تھے لکھا "اگر حیدرآباد چاہے تو اُسے اپنی عسکری قوت اور اسلحہ سازی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جب اقتدار اعلیٰ ختم کیا جا رہا ہے۔ تو نظام پر اس کی پابندیاں کیونکر عائد کی جا سکتی ہیں۔" مرزا اسمٰعیل نے اس مشورہ پر کس طرح عمل کیا وہ ایک علیحدہ داستان ہے مختصر یہ کہ اُنکے یہ کہنے پر کہ سکندرآباد چھاؤنی میں برطانوی

[۱] لارڈ اسے مکتوب بنام سر ڈی۔ مانیٹیکٹ۔ نمبر ۲۹۱ - ۵۰۵۔
[۲] والٹر مانکٹن مصنف لارڈ برکنہیڈ صفحہ ۲۲۱ Walter Monckton -
[۳] والٹر مانکٹن مولفہ لارڈ برکنہیڈ۔ صفحہ ۲۲۶ -by Lord Birkenhead

فوج کے اسلحہ کا ایک بڑا گودام آسان شرائط پر مل سکتا ہے۔ مرزا اسمعیل نے یہ کہہ کر اس مشورہ کو مسترد کر دیا۔ کہ اس اسلحہ سے کس سے جنگ کرنی ہے۔

بھارت کی طرف سے معاشی دباؤ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے آنے کے بعد حیدرآباد پر معاشی اور سیاسی دباؤ تیزی سے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۸ء کو وی۔ پی۔ مینن کے واسطے سے اس دباؤ نے ایک الٹیمیٹم کی شکل اختیار کر لی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے خط مورخہ ۱۲ر اگست ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کو اور پھر ذاتی طور پر سر والٹر کو یقین دہانی کرائی تھی کہ دستوری سمجھوتے کے لئے کسی قسم کا ناجائز دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ مگر جو صورت سامنے آرہی تھی اور اس دباؤ سے جن مشکلات میں حیدرآباد گھر گیا تھا۔ اُس سے بڑھ کر اور کونسا دباؤ ہو سکتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر سر والٹر نے وائسرائے کے ہاں قیام کرنے اور اُن کی میزبانی سے انکار کر کے ایک شریفانہ احتجاج کیا۔ اسکے ساتھ ہی انہوں نے نظام کو بھی پُرزور الفاظ میں قاسم رضوی اور رضاکاروں کی کاروائیوں پر مؤثر کنٹرول کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ نازک حالات میں حقائق سے صرف نظر کر کے صرف جذبات میں بہہ جانے سے کام نہیں بنتا۔ اتحاد المسلمین کی طرف سے بار بار دھمکیوں کیطرف اشارہ کرتے ہوئے نظام کو لکھا۔

"I can and do respect a determination to go down fighting if one must go down. But before deciding to die the wise man first exhausts every chance of living honourably .... "

کیمبل جانسن کی ایک دلچسپ روائت

کیمبل جانسن نے جو ماؤنٹ بیٹن کا افسر تعلقات عامہ تھا[1] سر والٹر مانکٹن کے متعلق یہ روائت بیان کی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے سر والٹر مانکٹن سے دوران گفتگو اس بات کا اعادہ کیا کہ وہ نظام کو مشورہ دیں کہ وہ اپریل ۱۹۴۸ء کے طے شدہ چار نقاط کو قبول کر لیں۔ اور اُس کے ساتھ اپنے صدر اعظم کو تبدیل کر دیں کیونکہ بھارتی حکومت

Walter Monckton by Lord Birkenhead

[1] والٹر مانکٹن مولفہ لارڈ برکنہیڈ صفحہ ۲۴۷۔

کے حلقوں میں کسی کو بھی میر لائق علی پر اعتماد نہیں ہے۔ اور انکی جگہ زین یار جنگ جیسے "جہاندیدہ" سیاست دان کو مقرر کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہاں اس ایک اقدام سے ساری سیاسی فضا بدل جائے گی" لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو نے لائق علی کو خود مستعفی ہونے کے لئے کہا تھا۔ اس لئے یہ باور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ مانکٹن[1] نے نظام کو ایسا مشورہ دیا ہو . . . . مشاورتی فرائض کی ادائیگی کے کئی برس پر محیط دور میں سر والٹر کی مملکت حیدرآباد کے اندرونی نظم و نسق میں مداخلت کرنے یا کسی شخص کی کسی عہدہ کے لئے وکالت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

مذاکرات کے انقطاع پر آپکے تاثرات

مذاکرات کے انقطاع کے بعد جب وہ لندن جا رہے تھے میں نے انہیں لنچ پر مدعو کیا۔ جس میں کئی مشاہیر بھی شریک تھے۔

سر والٹر بہت افسردہ نظر آرہے تھے۔ حیدرآباد کا جو حشر سامنے نظر آرہا تھا اُس کا انہیں بہت رنج تھا۔ میں نے جب انہیں ٹٹولنے اور آپکے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ تو انہوں نے بہت محتاط انداز میں .... مذاکرات کی تفصیل بتائی۔ اُن کا خیال تھا کہ مذاکرات کی کامیابی کے لئے طرفین کے رویہ میں لچک ہونی چاہیئے تھی یہاں دونوں طرف سے لچک کا اظہار نہیں ہوا۔ وہ اتحاد المسلمین کے رویہ سے بھی بہت نالاں تھے اُس کی تفصیل بتانے کا نہ وہاں کوئی موقعہ تھا اور نہ وہ خود اس موڈ میں تھے کہ وہ کچھ بتاتے۔

روانگی سے پہلے انہوں نے سر ظفر اللہ خان سے بھی ملاقات کی۔ اور مجھے صدر اعظم کے نام ایک یادداشت حوالے کی جس کے اہم نقاط یہ تھے۔ (۱) ہمارا مقدمہ عالمی عدالت کی بجائے عالمی امن کے خطرے کی بنا پر اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں پیش کیا جائے۔ (۲) وفد کی قیادت صدر اعظم کو کرنی چاہیئے اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ ذمہ داری وزیر خارجہ کو سونپی جائے۔ (۳) وفد میں کسی غیر ملکی کو شامل نہ کیا جائے۔ غیر ملکی سے مطلب انگریز یا امریکی تھا۔ (۴) وفد کے ارکان قابلیت شخصیت اور کردار کے اعتبار سے ایسے ہونے چاہیئے جو عالمی میدان میں بھارت کے ترانٹ سیاست دانوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں۔ انکی رائے تھی۔ کہ اس معاملہ میں علی یاور جنگ کی

Tragedy of Hyderabad

[1] لائق علی ٹریجڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۰۳۔

خدمات سے استعفاء کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد دستوری مشیر کی حیثیت سے وہ مشورے دیتے تھے۔ لیکن پھر حیدرآباد نہیں آئے۔ اُن کا رابطہ نظام اور اُن کی حکومت سے ساتھی رچرڈ بیومنٹ کے ذریعے قائم رہا۔ اِس نوجوان کو رابطہ کی اِس مہم جوئی میں بھارتی افسروں کے "شریفانہ" برتاؤ سے بھی واسطہ پڑا۔ ایک بار شاہ برطانیہ کے نام نظام کے ایک خط کو زبردستی اُس سے چھین لیا گیا اور بہت بدسلوکی کی گئی۔

حیدرآباد کے سقوط پر سر والٹر مانکٹن کا تبصرہ

جب فوجی حملے کے نتیجہ میں حیدرآباد کا سقوط ہو گیا تو حیدرآباد کے دستوری مشیر کا تبصرہ یہ تھا۔

"India wanted Hyderabad and took it by force.
I always said they would. They ought to be
ashamed of themselves and so ought we"[1]

Walter Monckton by Lord Birkenhead

۱؎ والٹر مانکٹن: مولفہ لارڈ برکن ہیڈ صفحہ ۲۵۴

حصّہ دوم

دوسرا باب

اعلان آزادی سے معاہدہ انتظام جاریہ تک

اعلان آزادی

۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو نظام نے مملکت حیدرآباد کی آزادی کا اعلان کیا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ چونکہ مملکت حیدرآباد کی رعایا ہندو مسلمان دونوں طبقوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے مملکت اور رعایا دونوں کے مفاد اور دوامی یک جہتی کا تقاضا ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان کسی سے بھی الحاق نہ کریں اور دونوں مملکتوں سے تعلقات اُستوار کرتے ہوئے ایک آزاد مملکت کی بنیاد ڈالیں۔ اعلان آزادی کے بعد انہوں نے نمائندہ تاج برطانیہ کو ایک اہم مکتوب بھیجا۔ جس میں اپنے اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے برطانیہ سے اپنے تاریخی دوستانہ تعلقات اور معاہدوں کی یاد دہانی کرائی۔ اور تفصیل سے بتایا[1]۔ کہ ان تاریخی حقائق کے پیش نظر مملکت حیدرآباد کی حیثیت دوسری ریاستوں سے بالکل جُداگانہ ہے۔ اور انہیں بجا طور پر شکایت ہے کہ اس بارے میں کیبنٹ مشن نے جو یقین دہانی کرائی تھی اسے حالیہ اقدامات سے نظرانداز کر دیا گیا ہے جو سراسر زیادتی اور وعدہ خلافی ہے۔ اور پُرزور مطالبہ کیا کہ حیدرآباد کو نوآبادیاتی درجہ دیا جائے۔ اپنے اس موقف کے اظہار کے ساتھ لارڈ ماونٹ بیٹن سے درخواست کی کہ اُن کا یہ مکتوب شاہ برطانیہ کو بھیجدیا جائے۔ اس خط کے جواب میں لارڈ موصوف نے بتایا۔ کہ وہ مکتوب شاہ برطانیہ کو بھیجدیا گیا ہے[2]۔ کئی دنوں کے بعد جب دوبارہ یاد دہانی کرائی گئی۔ تو بتایا گیا کہ ایک دفتری سہو سے وہ خط مکتوب علیہ کو نہیں بھیجا جا سکا۔ !! اگر ایسی بات تھی تو پھر حتمی طور پر یہ کیوں کہا گیا کہ وہ خط بھیجا جا چکا ہے۔ برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک معزز رکن کی اس صریح کذب بیانی کو آخر کیا نام دیا جائے۔ برطانیہ

۱؎ خط ۲ - مورخہ ۹ جولائی ۱۹۴۷ء

۲؎ خط ۳ - مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء

ہیں شائع شدہ کاغذات میں نظام کے اس خط کے نیچے ایک حاشیہ میں یہ دلچسپ انکشاف کیا گیا ہے کہ سر والٹر مانکٹن نے اس خط کی ایک نقل وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کو بھیج کر درخواست کی تھی کہ اُسے وائسرائے کو فوری طور پر پیش کر دیا جائے[1] - ۱۰ جولائی کو اس خط کی ایک نقل پرائیویٹ سکریٹری نے انڈیا آفس کو بھیجدی - ۱۲ جولائی کو کارفیلڈ نے سر جارج ایبل کو بتایا - کہ وائسرائے نے یہ طے کیا ہے - کہ اس خط کا جواب آزادی ہند کے قانون کے پاس ہونے کے بعد دیا جائے - اس طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۵ جولائی کو بتایا کہ وہ خط شاہ برطانیہ کو بھیج دیا گیا ہے - اور وہ جلد ہی نظام کو اس کا جواب بھیجیں گے !! اس حاشیہ سے یہ بالکل واضح ہے - کہ خط کی نقل وزیر ہند کو بھیجی گئی - مگر اصل خط شاہ برطانیہ کو دفتری سہو کی وجہ سے اسے نہیں بھیجا جاسکا - قانون آزادی ہند کے پاس ہونے تک انتظار کا فیصلہ بہت معنی خیز ہے اور جس جواب کا وعدہ کیا گیا تھا اُسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا - اس سیاق و سباق میں شاید یہ بتانا بے موقعہ نہ ہوگا - کہ ایک روایت جو راویوں کے اپنے بیان کے مطابق لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی زبانی اور اُن کی یادداشتوں پر مبنی ہے یہ ہے - کہ لارڈ موصوف نے اپنے تقرر کے وقت وزیر اعظم اٹیلے سے یہ بات منوالی تھی کہ اُنہیں اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں پوری آزادی ہوگی - کسی مرحلہ پر حکومت سے پوچھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ وہاں سے کوئی مداخلت کی جائے گی - اس روایت کی تصدیق ایچ - وی - ہاڈسن نے بھی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہ صرف مکمل اختیارات سے لیس ہو کر ہندوستان آئے تھے - بلکہ حکومت برطانیہ کی طرف سے اُن کے تقرر سے متعلق پارلیمنٹ میں جو بیان دیا گیا تھا - وہ خود لارڈ موصوف نے تیار کیا تھا - اگر یہ روایت صحیح ہے - تو ظاہر ہے وہ مالک و مختار تھے - اُن کی سوچ اور فکر کے مطابق نظام کے مراسلے کا یہی حشر ہونا تھا - ایک روایت یہ بھی ہے - کہ لارڈ موصوف کا تقرر پنڈت نہرو کی سفارش سے ہوا تھا - اگر اس روایت میں ذرا بھر بھی حقیقت ہے تو پھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پالیسیوں کے جواز کے کھوج لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی -

---

[1] سرکاری کاغذات حیدرآباد

[2] Fabulous Moghul

[3] چارلس سمتھ -

جس خط کا یہ حشر ہوا - اس کی اہمیت کے پیش نظر اُسکا پورا متن درج ذیل ہے -

اس اہم مکتوب کا متن

مسودہ قانون ہند وغیرہ، کا علم مجھے چند روز قبل اخبارات کے ذریعہ ہوا - مجھے افسوس ہے کہ چند ماہ میں ایسا بارہا ہوا ہے اور پھر اس دفعہ برطانوی وفد کے لیڈروں سے کافی طویل مباحث ہوئے لیکن مجھ پر اُن کا اظہار نہیں کیا گیا نہ مجھ سے یا میرے نمائندے سے اس خصوص میں بحث کی گئی مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے - کہ اس دفعہ میں برطانوی حکومت کی جانب سے اُن معاہدات کی جو برسوں سے میری ریاست اور خاندان کو برطانوی حکومت سے وابستہ کر رکھا تھا نہ صرف یکطرفہ تنسیخ عمل میں آئی ہے - بلکہ اس میں اس امر کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ تاوقتیکہ میں دونوں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شریک نہیں ہوتا اُس وقت میری ریاست برطانوی دولت عامہ کا جزو نہیں بن سکتی - جن معاہدات کے بموجب ایک عرصہ قبل برطانوی حکومت نے میری ریاست اور خاندان کو بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری قبول کی تھی اُن کا اس زمانہ میں خصوصاً ۱۹۴۲ء میں سر سٹرافورڈ کرپس کی جانب سے مسلسل اقرار صالح کے طور پر اعادہ کیا جاتا رہا - مجھے یہ بتایا جاتا رہا ہے - کہ میں برطانوی اسلحہ اور برطانوی قول پر کاملاً اعتبار کر سکتا ہوں جن کی وجہ سے مجھے حال تک اپنی فوج میں اضافہ کرنے اور اسلحہ سازی کے کارخانوں کے قیام سے باز رکھا گیا تھا - اُس کے باوجود دفعہ، میں معاہدات کی تنسیخ نہ صرف میری رضامندی کے بغیر ہوتی ہے - بلکہ مجھ سے اور میری حکومت سے اس خصوص میں گفتگو تک نہیں کی گئی -

۲ - جیسا کہ یور ایکسیلنسی کو علم ہے کہ آپ کے انگلستان کی روانگی سے قبل اور وہاں کے دوران قیام میں نے درخواست کی تھی کہ ہندوستان سے چلے جانے کے بعد میری ریاست کو نوآبادیاتی درجہ ملنا چاہیئے - اب تک میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے - کہ ایک صدی سے زائد مدت کے وفادارانہ اشتراک عمل کے بعد جبکہ میں نے انگریزوں پر مکمل اعتماد کیا تھا - مجھے دولت عامہ میں شریک ہونے کا موقعہ دیا جائیگا - دفعہ، سے مجھے حال ہی میں یہ بتایا گیا ہے - یور ایکسیلنسی نے ایسے تعلقات کے قیام کے متعلق پارلیمنٹ میں اعلان کرانے کا وعدہ کیا ہے - مجھے توقع ہے - کہ ان تعلقات کے بعد میری سلطنت اور حکومت برطانیہ کے مابین قریبی اتحاد اور یکانگت میں ترقی ہوگی - کیونکہ برسوں سے میں وفادارانہ طور سے تاج برطانیہ سے وابستہ ہوں -

۳۔ میں یور ایکسیلینسی سے یہ احتجاج کرنے میں حق بجانب ہوں۔ کہ کسطرح میری ریاست کو اُس کا قدیم حلیف نظر انداز کر رہا ہے اور ان بندھنوں کو توڑا جا رہا ہے۔ جنہوں نے ملک معظم سے مجھے وابستہ کر رکھا تھا۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ یور ایکسیلینسی میرے اس خط کو ملک معظم کی خدمت میں روانہ کر دینگے۔ سر دست میں اس خط کو شائع نہیں کر رہا ہوں کہ میرے قدیم احباب اور ساتھی دنیا کے سامنے رُسوا نہ ہوں۔ لیکن میں اپنی ریاست کے مفاد میں اس کی اشاعت کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔"[1]

پہلا مذاکراتی دور

نواب چھتاری کی وزارت کا دوسرا دور تھا کہ اعلان آزادی ہوا۔ اور مندرجہ بالا خط لکھا گیا۔ چھتاری نے چارج سنبھالتے ہی سر والٹر مانکٹن کو لندن سے بُلوا بھیجا انہوں نے انتظام جاریہ کا ایک مسودہ تیار کیا تاکہ معاملات کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھنے سے فریقین کو اپنے نقطۂ نظر اور موقف کا بغور جائزہ لینے کا موقعہ مل جائے ایک وفد نے جو نواب چھتاری سر والٹر مانکٹن۔ علی یاور جنگ۔ عبدالرحیم اور پنگل و نیکٹ ریڈی پر مشتمل تھا ماؤنٹ بیٹن کو یہ مسودہ پیش کر دیا ماؤنٹ بیٹن نے حیدرآباد کو دفاع۔ اور اُمور خارجہ اور مواصلات کی حد تک بھارتی یونین میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ جسے ماؤنٹ بیٹن نے حیدرآباد کو دفاع۔ امور خارجہ حیدرآباد کے اقتدار اعلیٰ کے منافی سمجھ کر مُسترد کر دیا۔ دوران گفتگو جب اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ اگر حیدرآباد کو مجبور کیا گیا تو وہ بدرجۂ مجبوری پاکستان سے الحاق کرنے کے امکانات کا جائزہ لیگا۔ تو ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ اس نوع کا فیصلہ کرتے وقت جغرافیائی صورت حال کو صرف نظر کرنا ایک غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا۔ بہر حال یہ گفتگو نتیجہ خیز نہیں رہی۔ اس میٹنگ کی ناخوشگوار فضا اور حیدرآباد کی جغرافیائی اور سیاسی پوزیشن کے پیش نظر والٹر مانکٹن نے اپنے ایک خط میں نظام کو مشورہ دیا کہ معاہدہ کا وقت آگیا ہے اور جو کچھ اس وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ۱۵ اگست کے بعد وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس تجویز میں اُمور خارجہ دفاع اور مواصلات کے اُمور کی حد تک الحاق تھا اور بھارت اور پاکستان کے مابین جنگ کی صورت میں حیدرآباد کی غیر جانبداری کے حق کو تسلیم کرنے کی پیشکش کی گئی تھی۔[2]

---

[1] اس خط کے انگریزی متن کا ترجمہ بدر شکیب صاحب کی کتاب حیدرآباد کا عروج و زوال سے لیا گیا ہے جس کے لیے میں شکیب صاحب کا ممنون ہوں۔

[2] سر والٹر مانکٹن بنام نظام مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء۔ سر والٹر مانکٹن مصنفہ لارڈ برکنہیڈ صفحہ ۲۳۰۔
Walter Monckton by Lord Birkenhead

سیاسی رشوت؟

گفت و شنید کے اس دور کے آغاز سے پہلے ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے سر والٹر مانکٹن سے کہا کہ اگر نظام کا رویہ ٹھیک رہا اور اگر مانکٹن کو اپنے مشاورتی فرائض کی انجام دہی میں یہ پیشکش مفید ثابت ہو تو نظام کو یہ اشارہ دے دیا جائے۔ کہ اُنکے دوسرے فرزند معظم جاہ کو ہز ہائینس کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ تجویز نظام تک پہنچائی گئی یا نہیں اور اگر پہنچائی گئی تو اُن کا کیا ردِ عمل تھا۔ بہر حال ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے وزیر ہند کو یہ تجویز باضابطہ پیش کی کہ ملک معظم سے اس خطاب کو دیئے جانے کے لیے منظوری حاصل کیجائے۔ لارڈ لسٹوول کے اطمینان کے لئے اس تجویز میں واضح طور پر بتایا گیا۔ کہ ولبھائی پٹیل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں[1]۔ اگلے دن وزیر ہند کی طرف سے اس تجویز کی منظوری بھی آگئی۔ کیا یہ سب انتقال اقتدار سے پہلے نظام کو رشوت دینے کی تجویز تھی اگر اُنہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہوتی اس پر عمل بھی ہو جاتا۔[2] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظام نے اُسے مُسترد کر دیا اور آخر وقت میں یہ منظور شدہ تجویز داخل دفتر ہو گئی۔

حیدرآبادی وفد کی قائدِ اعظم سے ایک اہم ملاقات

۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو نواب چھتاری۔ سر والٹر مانکٹن۔ اور علی یاور جنگ نے قائداعظم سے ملاقات کی۔ جس میں نظام کی طرف سے وائسرائے کو لکھا جانے والے خط کا مسودہ زیر بحث آیا۔ دوران گفتگو قائداعظم نے نظام کا ایک خط دکھایا جو حکومت کے علم کے بغیر نظام نے انہیں بالا بالا ہی لکھا تھا۔ نواب چھتاری کا اس پر بڑا دلچسپ تبصرہ ہے۔ "حضور نظام کا ہمارے حکم اور اطلاع کے بغیر مسٹر جناح کو خط لکھنا مسٹر جناح کا ہماری تجاویز کو مُسترد کر دینا۔ اور اتحاد پارٹی کے ذریعہ ہماری تجاویز کا انہیں پہلے سے علم ہو جانا یہ تمام باتیں ایسی تھیں جو ہمارے لئے اور سوائے عبدالرحیم کے میرے شرکاء کار کے لئے ناقابل برداشت تھیں اور حیدرآباد کے معاملہ

---

[1] برطانیہ کے مطبوعہ کاغذات۔ Transfer of Power پیرا ۲۹۳۔

[2] 〃 〃 پیرا ۱۱۔

[3] نواب چھتاری۔ خود نوشت سوانح حیات جلد سوم صفحہ ۲۲۷۔

کو نہ صرف مشکل بلکہ محال بنا دیتی تھیں" ۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم سے وفد کی پھر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کی روداد جس پر اُنکے توثیقی دستخط بھی ثبت ہیں ضمیمہ ۲ میں درج ہے۔ اس میٹنگ میں انہوں نے تفصیل سے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور اپنے موقف پر قائم رہنے سے اگر حیدرآباد مشکلات میں گھر گیا تو پاکستان کس حد تک اُس کی مدد کر سکتا ہے۔ اس پر بھی اپنی سوچ کی نشاندہی کی ہے۔ یہ دستاویز بہت اہم اور منفرد ہے۔ جس میں انہوں نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔[1]

ریاستوں کے بارے میں برطانوی اکابر کے اعلانات

جولائی اور اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی سیاست دانوں نے ریاستوں کو بہت سی یقین دہانیاں کرائیں۔ آئندہ اُن کے ساتھ جو برتاؤ ہوا اُس کے پیش نظر ان یقین دہانیوں کو نظر میں رکھنا چاہیئے۔ ۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم اٹیلے نے حتمی طور پر اعلان کیا کہ ریاستوں کے حکمران برطانیہ سے کئے جانے والے معاہدوں کے ختم ہو جانے کے بعد آزادی حاصل کر لیں گے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو سر ہارٹلے شاکراس اٹارنی جنرل نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ریاستوں کے حکمرانوں پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالیگی۔ ۱۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو لارڈ لسٹوول وزیر ہند نے اعلان کیا کہ ریاستوں کے حکمران اپنی پالیسی میں بالکل آزاد ہیں۔ چاہے وہ کسی ڈومینین میں شامل ہو جائیں یا علیحدہ رہیں۔ برطانوی حکومت اس بارے میں ذرا سا بھی دباؤ نہیں ڈالے گی۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ریاستوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے اور اُن پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائیگا۔[2]

حیدرآباد وفد کی وائسرائے سے پہلی ملاقات کے بعد کے واقعات

ماؤنٹ بیٹن نے حیدرآباد کے مسئلہ کو سلجھانے کے لئے بھارتی حکومت سے دو ماہ کی مہلت لے لی۔ تاکہ فریقین کو مزید غور و فکر کا

---

[1] نواب چھتاری۔ خود نوشت سوانح حیات جلد دوم صفحہ ۲۵۱-۲۵۴ ضمیمہ ۲

[2] ڈی۔ ایف۔ کراکا۔ صفحہ ۴۰

موقعہ مل سکے۔ حیدرآباد کا وفد ابھی دہلی ہی میں تھا۔ کہ قاسم رضوی وہاں پہنچ گئے۔ اور سردار پٹیل سے ملاقات کی۔ اُس وقت کی کشیدہ فضا میں یہ ملاقات کیسے ممکن ہو سکی۔ اُس بارے میں مختلف روائتیں ہیں بتایا جاتا ہے۔ کہ ملاقات اُس وقت کی وزارت کے ایک ہندو وزیر کے ذریعے ہوئی۔ بہرحال یہ بات اہم نہیں ہے۔ ملاقات بڑے ناخوشگوار ماحول میں ہوئی۔ اور بُری طرح ناکام ہو گئی۔ حیدرآبادی وفد کی کارروائیوں پر اتحاد المسلمین کی خفیہ نگرانی تھی۔ وفد کے ہی ایک رکن عبدالرحیم نے وزارتی رازداری کے روائتی مسلّمہ اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اتحاد المسلمین کو یہ رپورٹ دی۔ کہ چھتاری اور علی یاور جنگ نظام کے مقدمے کو خراب کر رہے ہیں اور سر والٹر مانکٹن کا وائسرائے سے گٹھ جوڑ ہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ یہ رپورٹ دہلی سے ٹیلیفون پر دی گئی اس طرح گفتگو کا سارا ریکارڈ اور پورا متن بھارتی حکومت کو اُسی وقت مل گیا۔[1] اس کے علاوہ اتحاد کے ایک اور نمائندے اکرام اللہ جو بعد میں لائق علی وزارت کے رکن بنے نظام کے لئے ایک خفیہ مراسلہ لائے جس میں انہیں بتایا گیا کہ وفد نے اُنکے لئے جو پھندا تیار کیا ہے۔ وہ اُس سے بچنے کی کوشش کریں اُس کیساتھ یہ بھی رپورٹ کی گئی۔ کہ نواب چھتاری نے تنہائی میں قائد اعظم سے ملاقات کی۔ سر والٹر مانکٹن تین روز تک وائسرائے کے مہمان رہے اور علی یاور جنگ نے نہرو خاندان کے ساتھ ایک وقت کا کھانا کھایا اس لئے وہ تینوں قابل اعتماد نہیں۔ اتحاد المسلمین کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ جب تک آپ اپنے نمائندے پر اعتماد نہیں کریں گے[2] معاملہ کو آگے کیسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ سیاسی تاریخ میں بڑے بڑے اہم فیصلے کھانے کی میز پر طے ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے کسی کے ساتھ مل بیٹھنے یا ایک وقت کا کھانا کھا لینے پر بھی پابندی لگا دی۔ تو اُس سے آپ کی انا کی تسکین تو شاید ہو جائے۔ معاملہ وہیں کا وہیں رہیگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وفد کی واپسی پر ان سب خفیہ اور کھلی معاندانہ سرگرمیوں پر اظہار افسوس بھی کیا گیا اور ایسا کرنے والوں میں قاسم رضوی بھی شامل تھے۔

Walter Monckton by Lord Birkenhead

[1] والٹر مانکٹن۔ مصنفہ لارڈ برکنہیڈ صفحہ ۲۲

[2] یادداشت سابق چیف سکریٹری نواب بہادر اشفاق احمد۔

مگر اظہار افسوس کے ساتھ علی یاور جنگ کے خلاف پروپگنڈا ابھی جاری رہا۔ لائق علی[1] نے اس پراپگنڈے کی مہم کی دو وجوہات بیان کی ہیں ایک یہ کہ وفد کی خفیہ کارروائیوں سے شک و شبہ کو تقویت ملتی تھی۔ جس کی وفد کے ہندو اور مسلمان ارکان کو بھی شکایت[2] تھی دوسرے یہ کہ علی یاور جنگ جن کو مجوزہ اتحاد المسلمین قابل اعتماد نہیں سمجھتی تھی نواب چھتاری انہیں اُنکے رتبہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے بہرحال اندرون خانہ جو کچھ بھی ہو۔ اس مہم نے بڑھتے بڑھتے سارے وفد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ ہر قسم کے الزامات کا ہدف بن گیا۔ ایک الزام یہ تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کو پیش کیا جانے والا خط اُس سے بالکل مختلف تھا جس میں حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا اس الزام کے ساتھ یہ بات بھی بڑے دھڑلے سے بیان کی گئی۔ کہ اگر عبدالرحیم اور پنگل ریڈی موقعہ پر موجود نہ ہوتے تو وفد[3] نے حیدرآباد کا بیڑہ ہی غرق کر دیا ہوتا۔ ان الزامات سے جن کی بظاہر کوئی بنیاد نہ تھی بیزار ہو کر تینوں سرکاری ارکان نے استعفےٰ پیش کر دیا نظام نے تار سے ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ وہ والٹر مانکٹن کو وفد کا رکن رہنے کی ترغیب دیں اور ایک فرمان کے ذریعہ وفد کے ارکان پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اُس پر ارکان نے اپنے استعفےٰ واپس لے لئے۔ ایک محاذ پر شکست کھانے کے بعد اتحاد المسلمین نے دوسرا محاذ سنبھال لیا۔ اور نواب چھتاری پر دباؤ ڈال کر اُمور دستوری کا قلمدان علی یاور جنگ سے لیکر معین نواز جنگ کے حوالے کر دیا۔ جس سے اول الذکر کا تعلق عملی طور پر ختم ہو گیا۔

نیا وفد

حالات کی اس اُفتاد نے نظام کو بڑی اُلجھن میں ڈال دیا اس کا حل اُنہوں نے یہ سوچا۔ کہ وفد کی ہیئت ہی بدل دی جائے۔ چنانچہ علی یاور جنگ۔ عبدالرحیم اور پنگل ریڈی کے نام واپس لے لئے گئے اور اُن کی جگہ سر والٹر مانکٹن سر سلطان احمد اور علی نواز جنگ نے لے لی۔ اس اقدام کو بھی حیدرآباد کے سیاسی حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا اس وفد کی تشکیل میں بڑی

[1] یادداشت سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد۔

[2] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۷۰ Tragedy of Hyderabad

[3] بدر شکیب۔ حیدرآباد کا عروج و زوال صفحہ ۱۳۵۔

خامی یہ تھی کہ اس میں کوئی ہندو رکن شامل نہیں تھا۔ اتحاد المسلمین کو یہ شکایت تھی کہ اُس کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر وفد کی تشکیل میں اُسے نظر انداز کر کے اُس کی رسوائی کی گئی ہے جسے وہ کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی لائق علی کا اس وفد کے بارے میں تبصرہ یہ ہے کہ اُس میں صرف ایک حیدرآبادی تھا ایک انگریز اور دو غیر ملکی تھے۔ مسلسل کشمکش۔ مخالفانہ فضا اور ماحول کی تلخی[1] سے بیزار ہو کر نواب چھتاری نے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا اور نظام کو مشورہ دیا کہ اُس وقت کے سیاسی حالات میں کسی ملکی یعنی فرزند زمین کو صدر اعظم مقرر کرنا مناسب ہوگا کیونکہ باہر والا چاہے کتنی ہی دیانت داری محنت اور لگاؤ سے اپنے فرائض انجام دے وہ بہرطور شبہ کی نظر سے دیکھا جائیگا۔ نظام چاہتے تھے کہ مصالحتی کوششیں کسی منزل پر پہنچ جائیں تو سربراہ حکومت کی تبدیلی پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی اس خواہش کے احترام میں چھتاری نے فوری طور پر سبکدوش ہونے پر اصرار نہیں کیا۔ بعد کے واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بھی اُن کی غلطی تھی جب فضا ہی زہر آلود ہو۔ ہر شخص آپ کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہا ہو۔ تو مصالحتی کوششیں کسی منزل پر پہنچ کیسے سکتی ہیں۔ اس موقعہ پر نظام کی طرف سے اظہار ناراضگی بھی ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی وجہ سے قاسم رضوی نے اپنے خط مورخہ ۱۰ اگست ۴۷ء میں اپنے تعاون کا یقین دلایا ضمیمہ ۲، اس کے علاوہ ایک طویل خط میں اب تک جو اُن سے برتاؤ ہوا تھا اُس پر اظہار ندامت کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنا استعفےٰ واپس لے لیں۔ نواب چھتاری کے حکم سے چیف سکریٹری قاسم رضوی سے ملے ملاقات کے وقت وہاں سید تقی الدین بھی موجود تھے چیف سکریٹری نے رضوی سے کہا کہ اگر وہ نواب صاحب کے استعفےٰ کی واپسی کے بارے میں مخلص ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ ایک ایسا بیان جاری کریں جس میں صدر اعظم[2] پر کلی اعتماد کا اظہار ہوتا ہو۔ قاسم رضوی نے جواب دیا۔ کہ وہ اس قسم کا بیان اس شرط پر دینے کے لئے

[1] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۷۱۔ Tragedy of Hyderabad

[2] یادداشت سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد۔

تیار ہیں کہ سید تقی الدین کو اُس محکمہ کا سکریٹری بنا دیا جائے - جس کا تعلق بھارت سے مُفاہمتی مذاکرات سے ہو - چیف سکریٹری نے کہا کہ اعتماد کا اظہار غیر مشروط ہونا چاہیئے - صدر اعظم کسی ایسے بیان کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیں گے جو کسی فرد کے لئے کسی خاص عہدہ پر تقرر سے مشروط ہو - چھتاری اور قاسم رضوی کے مابین مفاہمتی کوششیں اسی پر ختم ہو گئیں -

نظام کی نئی تجویز

آزادی ہند کے بل پر برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کی روشنی میں نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام اپنے خط مورخہ ۱۸ اگست سنہ ۴۷ء[1] میں بھارت سے ایک معاہدے کی پیشکش کی جسمیں مُراصلاتی نظام کو کل ہند بنیادوں پر اُستوار کرنا - ملکی دفاع میں تعاون اور خارجہ پالیسی کو بھارت کی پالیسی سے ہم آہنگ کرنا شامل تھا - اس پیشکش کے ساتھ یہ شرط تھی کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ کی صورت میں حیدرآباد غیر جانبدار رہے گا اور اگر کسی وقت بھارت اور پاکستان نے دولتِ مُشترکہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو حیدرآباد کو اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کرنے کا اختیار ہوگا - نیز یہ کہ حیدرآباد کو غیر ملکوں میں اُسی طرح ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کا حق ہوگا جسطرح برطانیہ میں اُسکا نمائندہ موجود ہے - وائسرائے نے اپنے خط مورخہ ۱۲ اگست سنہ ۴۷ء[2] میں جواب دیا - کہ تنگیٔ وقت کی وجہ سے بھارتی حکومت نے حیدرآباد کے مسئلہ کو سلجھانے کے انہیں مزید دو ماہ کی مہلت دی ہے - اس خط کا اہم پہلو اس بات کی یقین دہانی تھی کہ اُس وقت کے حالات میں الحاق نہ کرنا معاندانہ اقدام نہیں سمجھا جائیگا اور نہ حیدرآباد کی ناکہ بندی کر کے اُس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالا جائیگا - اس یقین دہانی کا کیا حشر ہوا - آئندہ صفحات میں اُس کی نشاندہی کی جائے گی قابل توجہ بات یہ ہے کہ وی - پی - مینن[3] نے اپنی کتاب میں ماؤنٹ بیٹن کی اس یقین دہانی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بھارتی حکومت اس بارے میں مُخلص نہیں تھی - نمائندہ تاج کا نظام کے نام یہ آخری خط تھا - اس کو پڑھ کر تاثر ہوتا ہے - کہ بھارت کی جوع الارضی

[1] خط نمبر ۴ -

[2] خط نمبر ۵ -

[3] وی - پی - مینن The Integration of Indian States

میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کتنا آلۂ کار بن گیا تھا - حیدرآباد کے بارے میں تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے - مگر کشمیر - ٹراونکور - کوچین اور کاٹھیاواڑ کی ریاستوں پر دباؤ کا آخر کیا جواز تھا ؟ وی - پی - مینن نے برطانوی افسروں کی نگرانی میں استصواب رائے کی پیش کش کا ذکر کیا ہے اُس کے بیان کے مطابق ۲۰ اگست سنہ ۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے نظام کو یہ تجویز پیش کی گئی تھی حیدرآباد کی دستاویزات[1] بیض میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا - مینن کے بیان کے مطابق نظام نے اُسے اس بنا پر مُسترد کر دیا تھا کہ حیدرآباد کی سلطنت دستوری حیثیت کے پیش نظر استصواب رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

مجوزہ معاہدے کے عنوانات

۸ اگست سنہ ۴۷ء کی پیش کش کی وضاحت نظام نے اپنے مراسلے مورخہ ۱۸ ستمبر سنہ ۴۷ء[2] میں کی اور معاہدے کے عنوانات یعنی Heads of Agreement تجویز کئے - اس میں دو تین شقیں بہت اہم تھیں - (ا) حیدرآباد حکومت برطانیہ سے ہر قسم کے مُعاہدے کرنے کے لئے آزاد ہوگا (ب) حیدرآباد کو دولت مُشترکہ کے کسی ایک مُلک یا اگر ضروری سمجھا گیا تو دوسرے کسی ملک سے سیاسی تعلقات اُستوار کرنے کا حق حاصل ہوگا - جس مُلک میں اُس کا اپنا نمائندہ نہ ہوگا اُس کے سب مُعاملات بھارتی سفارت خانے کے واسطے سے طے پائیں گے - (پ) بندرگاہ گوا کے استعمال اور اُس کی توسیع کے ضمن میں ضروری اقدامات - لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بحیثیت گورنر جنرل ۲۴ ستمبر سنہ ۴۷ء کے مراسلے میں اطلاع دی - کہ بھارتی حکومت ان عنوانات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ بقول اُنکے وہ معاہدے کے لئے قابل اطمینان بنیاد فراہم[3] نہیں کرتے - دلیل یہ تھی کہ ایک طرف تو آپ اپنے خارجہ تعلقات کو بھارت کی خارجہ پالیسی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے

[1] وی - پی - مینن The Integration of Indian States

[2] خط ۱۲ - Hayderabad's relations with Dominion of India Vol 1.

[3] خط ۱۴ - Hayderabad's relations with Dominion of India Vol 1.

ہیں دوسری طرف بیرونی ممالک میں اپنے نمائندے مقرر کرنے کا حق مانگتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسی کوئی تجویز جس میں بھارتی حکومت کو حیدرآباد سے متعلق قانون سازی کا اختیار نہ دیا جائے۔ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ بہرحال ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں گفت و شنید جاری رہی۔ وی۔ پی۔ مینن کا بیان ہے۔ کہ اس دوران وفد نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود اکتوبر میں حیدرآباد جا کر مزید گفتگو کرے چنانچہ مینن نے ۱۸ اکتوبر کی تاریخ مقرر کر کے چھتاری کو اُس کی اطلاع کر دی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو چھتاری نے حیدرآباد جا کر پروگرام کو اس بنا پر ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ کہ اُس کے وہاں آنے سے مظاہروں کا خدشہ ہے۔ نواب چھتاری نے اُس افسوس ناک صورتِ حال کا ذکر اپنی کتاب میں ان الفاظ میں کیا ہے: "اتحاد المسلمین کے لوگ اُس کے خلاف تھے نظام کو اطلاع دی گئی۔ کہ اگر مسٹر مینن آئیں گے تو ہندو اُن کا استقبال کریں گے اور اتحاد کے لوگ مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ نظام کا حکم ہوا کہ اُنکا آنا روکا جائے مجھے تعمیل کرنی پڑی اور ناخوشگوار بات کو خوشگوار طریقہ سے کہنا پڑا۔ جواب میں جو اُن کا تار آیا اُس کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اثر قدرتاً خراب ہوا"۔ مینن نے اُس پر بڑی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا اور اُسے یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ حیدرآباد میں[1] امن و امان کی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ ایک طے شدہ پروگرام کو آخری وقت ملتوی کرنا پڑا دو ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر حیدرآبادی وفد ایک متفقہ معاہدہ اور اس کے اہم جزو Collateral Letter لانے میں کامیاب ہو گیا۔ نظام نے یہ دستاویز باب حکومت کو اظہار رائے کے لئے بھیجی۔ جس نے ۲۵ اکتوبر کو ۲ کے خلاف ۶ ووٹوں کی اکثریت سے اُسے منظور کر لیا۔

وفد کے خلاف مظاہرہ

اس کے بعد کیا ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن کی روایت یہ ہے۔ ۲۵ اکتوبر کو ہی نظام نے اس دستاویز کی منظوری دیدی۔

۱؎ نواب چھتاری۔ خود نوشت سوانح حیات جلد سوم صفحہ ۲۰۰

جب وفد کے اراکین ۲۶ اکتوبر کو اُسے لینے کے لئے گئے[1] تو نظام نے اگلے دن صبح تک دستخط کرنے کے عمل کو ملتوی کر دیا۔ ۲۷ اکتوبر کو صبح کے تین بجے ایک جمِ غفیر نے جسکی تعداد ۲۰ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی تھی۔ نواب چھتاری سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد کی رہائش گاہوں کا محاصرہ کر لیا۔ تاکہ وہ باہر نہ نکل سکیں ۵ بجے صبح ایک فوجی دستہ کی مدد سے نواب چھتاری اور وفد کے دوسرے ارکان برگیڈیر گلبرٹ کی رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے" صبح نو بجے نظام کا حکم آیا کہ وفد کی روانگی ملتوی کی جائے اور گورنر جنرل کو تار دے دیا گیا کہ بعض غیر متوقع اسباب کیوجہ سے وفد اب ۳۰۔ ۳۱ اکتوبر سے پہلے نہ آسکیگا اس مظاہرے کے بارے مختلف روائتیں ہیں کہ یہ کیوں ہوا اور کس کے ایما سے ہُوا۔ مظاہرے کے ضمن میں وقت اور فاصلہ دونوں بہت اہم پہلو ہیں مظاہرین کا ایک خاص مقام مقررہ وقت پر جمع ہونا اور ایک جمِ غفیر کی شکل میں کئی میل کا فاصلہ طے کرنا۔ پولیس کے علم میں آئے بغیر کیسے ممکن ہو گیا۔ کسی مرحلہ پر پولیس نے اُسے نہیں روکا۔ کیا اس مظاہرے کی خبر متعلقہ وزیر معین نواز جنگ کے علم میں لائی گئی تھی اگر نہیں لائی گئی تھی تو ایسا کیوں ہُوا اور اگر لائی گئی تھی تو کیا متعلقہ وزیر نے صدر اعظم اس کی اطلاع دی تھی اگر اُن سے بھی بالا بالا نظام کے ایماء سے یہ سب کچھ ہوا۔ (جیسے کہ بعض حلقوں میں کہا گیا) تو پھر بھی پولیس کے اعلیٰ افسر کو اپنے وزیر کو مطلع کرنا چاہیئے تھا۔ لارڈ برکنہیڈ نے اپنی کتاب میں بتایا ہے۔ کہ اُس دن نظام نے قاسم رضوی کو رات کا کھانا بھیجا تھا اگر اس روایت میں ذرا بھی حقیقت ہے۔ تو یہ نتیجہ اخذ کرنے کا جواز[2] ملتا ہے۔ کہ نظام قاسم رضوی کے بری طرح دباؤ میں آگئے تھے اور مظاہرے کے پروگرام کا انہیں کچھ نہ کچھ علم ضرور تھا۔ خود مظاہرے کا کیا جواز تھا۔ اس بارے میں بھی کئی روائتیں ہیں ایک روایت جو میرے ذاتی علم میں ہے اور عام طور پر حیدرآباد میں زبانِ زدِ عام تھی وہ یہ تاثر تھا کہ جو معاہدہ منظور ہوا ہے وہ اُس سے مختلف ہے۔

۱؎ ایچ۔ وی۔ ہاڈسن نے یہ روایت گورنر جنرل کی خفیہ رپورٹ سے اخذ کی ہے صفحہ ۴۷۹ H.V. Hodson

۲؎ والٹر مانکٹن مصنفہ لارڈ برکنہیڈ صفحہ ۲۲۴ Walter Monckton by Lord Birkenhead

جو نواب چھتاری دہلی لے جا رہے تھے۔ یہ محض افترا پردازی تھی۔ اس الزام کا نہ تو اُس وقت کوئی ثبوت پیش کیا جا سکا نہ اُس کے بعد دوسری روایت یہ ہے کہ باب حکومت میں بحث مباحثے کی تفصیل اُسی کے ایک رکن عبدالرحیم نے قاسم رضوی کو پہنچا دی چونکہ باب حکومت کی منظوری اکثریت کے فیصلہ پر ہوئی تھی قاسم رضوی نے اُسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا کر مخالفت کا یہ پروگرام بنا لیا۔ بہرحال ۲۷ ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو وفد دہلی نہ جا سکا۔ اگلے دن شام کو نظام نے خلاف معمول اپنی کونسل کا اجلاس اپنی رہائش گاہ پر بلایا جس میں باب حکومت کے اراکین کے علاوہ وفد کے ارکان اور قاسم رضوی بھی موجود تھے اس اجلاس میں قاسم رضوی اور وفد کے ارکان بالخصوص سر سلطان احمد میں کافی نوک جھونک ہوئی۔ نواب چھتاری نے ان ناخوشگوار حالات کا ذکر کرتے ہوئے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے[1] "نظام کے استفسار پر قاسم رضوی نے کہا کہ اگر مُلکی لوگوں کا ڈیلیگیشن جائے اور حکومت ہند پر زور ڈالے تو وہ ضرور اس سے بہتر شرائط لائے گا اس لئے کہ حکومت ہند کشمیر میں اتنی اُلجھ رہی ہے کہ وہ ہماری شرائط منظور کرے گی۔ کشمیر میں کچھ پشاوری قبائل کے لوگوں نے حملہ کیا تھا رضوی کا اشارہ اُسی جانب تھا۔ ہم تینوں نے نظام سے عرض کیا کہ قاسم رضوی کا خیال غلط ہے۔ اور محض خوش فہمی پر مبنی ہے لیکن نظام کا رجحان خاطر اسی طرف تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں انہیں موقع دیا جائے اگر حضور کا خیال ہے۔ کہ حیدر آباد کی خدمت یہ کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے۔ ہم لوگوں نے ڈیلی گیشن سے استعفےٰ دیدیا۔" قاسم رضوی کے مشورے سے معین نواز جنگ کی سربراہی میں عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ ریڈی پر مشتمل ایک نئے وفد[1] کی تشکیل ہوئی۔ یہی وہ تین ارکان تھے جنہوں نے باب حکومت کے ۲۵ ر اکتوبر کے اجلاس میں مسودہ کے خلاف رائے دی تھی۔ مینن نے لکھا ہے۔ کہ سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد اس سارے ڈرامے سے اتنے برہم تھے کہ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کے نام نظام[2] کے خط کے مسودے کے بارے میں مشورہ

لہ نواب چھتاری۔ خود نوشت سوانح حیات جلد سوم ۲۷۷ - ۲۷۸۔

کہ وی۔پی۔مینن The Integration of Indian States

دینے سے انکار کر دیا البتہ سر سلطان نے یہ خط ماؤنٹ بیٹن کو پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ اس خط میں کیا لکھا تھا قطعی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ حیدر آباد کی دستاویزات میں شامل نہیں ہے۔ البتہ مینن نے یہ کہا ہے۔ کہ یہ ایک قسم کی دھمکی تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر بھارت سے مفاہمتی گفتگو کامیاب نہ ہوئی تو وہ پاکستان سے مُعاہدہ کرنے کی کارروائی کریں گے۔ نواب چھتاری اس رسوائی کے بعد استعفےٰ دے کر آخری بار حیدر آباد سے رخصت[1] ہو گئے اُن کی روانگی سے قبل ایک بات ریکارڈ پر لانا ضروری ہے جس سے موصوف کی اسلام دوستی اور وسیع القلبی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ابوالحسن سید علی نے اُن سے کچھ مالی مدد اس کام کے لئے طلب کی کہ وہ قاسم رضوی کے خلاف ایک محاذ بنائیں گے اُنہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ اُن سے[2] جیسا بھی برتاؤ ہوا ہو وہ مسلمانوں کی واحد تنظیم میں انتشار پھیلانے کی مہم میں شرکت نہیں کر سکتے۔

دہلی میں شدید ردِ عمل

اس واقعہ سے دہلی میں شدید ردِ عمل ہوا۔ اُسے وعدہ خلافی قرار دیا گیا اور کانگریسی حلقوں میں ایک عرصے سے جو عام تاثر تھا کہ حیدر آباد کی حکومت کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتی اُس کی بھی ایک حد تک تصدیق ہو گئی دہلی میں ردِ عمل جو ہوا سو ہوا۔ اندرون خانہ جو کچھ ہو رہا تھا اُس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ لائق علی کہتے ہیں کہ جب وہ بیرون ملک کے دورے سے واپس آئے تو معین نواز جنگ کی باتوں سے انہیں تاثر ہوا کہ ایک طرف تو نظام نے مُعاہدے کے مسودے میں خوشگوار اور قابل قبول تبدیلیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سر سلطان احمد کے ذریعہ ماؤنٹ بیٹن کو کہلا بھیجا کہ انہوں نے عوامی مُظاہروں سے مجبور ہو کر وفد کو بدلا ہے۔ لائق علی نے جب اُن سے پوچھا کہ ان حالات میں اُنہوں نے نئے وفد کی سربراہی کی ذمہ داری کیوں قبول کی۔ تو اُن کا جواب یہ[3] تھا کہ وہ نظام کے اصرار پر ایسا کرنے

لہ وی۔پی۔مینن The Integration of Indian States

کہ یادداشت سابق چیف سیکرٹری خان بہادر اشفاق احمد

پر مجبور تھے۔ سر سلطان احمد سے متعلق اس روایت کا بظاہر کوئی ثبوت نہیں۔ منین نے بتایا ہے۔ کہ انہوں نے ۱۲؍اکتوبر ۴۷ء کو یہ خط ماؤنٹ بیٹن کو پیش کیا۔ یہ عین ممکن ہے کہ دوران گفتگو جس برتاؤ کا انہیں واسطہ پڑا تھا اُس کا ذکر آیا ہو۔ اگر بالفرض انہوں نے یہ بات کہی بھی تھی تو شاید حالات کا تقاضا یہی تھا۔ کیونکہ اگر ماؤنٹ بیٹن کو یقین ہو جاتا کہ نظام نے وفد کو اپنی مرضی سے برخواست کر دیا ہے۔ تو شاید وہ نئے وفد سے گفت و شنید کے لئے تیار ہی نہ ہوتا۔ نظام کے خط مورخہ ۲۰؍اکتوبر ۴۷ء میں یہ حتمی اعلان کہ اُن کی حکومت نے برخواست شدہ وفد کے مُعاہدے کو مُسترد کر دیا ہے۔ ایک اُلجھن میں ڈال دیتا ہے۔ ۲۵؍اکتوبر ۴۷ء کے اجلاس میں اکثریت نے اس کو منظور کر لیا تھا۔[1] اور خود نظام نے اس کی منظوری دے دی تھی کیا اس سے یہ سمجھا جائے۔ کہ ۲۸؍اکتوبر کے خصوصی اجلاس میں دوبارہ یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا اور پہلا منصوبہ کالعدم قرار دے دیا گیا ہے کسی ریکارڈ سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دوسرا بیان محض لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مطمئن کرنے کیلئے وضع کیا گیا تھا۔

نیا وفد نئے وفد نے ۳۱؍اکتوبر ۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے غیر رسمی ملاقات کی۔ وی۔ پی۔ مینن اور کیمبل جانسن نے اس ملاقات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بہت ناخوشگوار فضا میں ہوئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خود مسٹر والٹر مانکٹن سے اس کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے "

"--- really chewed up moin successfully ------- and he had gone out dripping with sweat and completely finished -------."

اس غیر رسمی ملاقات کے بعد ماؤنٹ بیٹن انگلستان[2] چلا گیا اور گفت و شنید کا اگلا مرحلہ

Integration of Indian state
Hyderabads Relations with Dominion of India

[1] Walter Monckton by [illegible]
[2] Lord Birkenhead

۲۵؍نومبر تک ملتوی ہو گیا ان مذاکرات میں بعض لفظی ترمیمات کے سوا مسودہ کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور مُعاہدے اس کے اہم جزو COLLATERAL LETTER پر ۲۹؍نومبر ۴۷ء کو دستخط ہو گئے مُظاہرے اور گھیراؤ کا مظاہرہ بظاہر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ بقول کیمبل جانسن کے Colon کے بجائے Semi-colon. اور کولن کے بجائے سیمی کولن جیسی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں اس مُعاہدے پر دستخط ہونے کے بعد ایک نیا وفد جو میر لائق علی۔ معین نواز جنگ اور سر والٹر مانکٹن پر مشتمل تھا وُجود میں آیا۔

مُعاہدہ انتظام جاریہ اس مُعاہدے کی پانچ دفعات تھیں آئندہ ۱۰ ماہ تک یہ مُعاہدہ بھارت اور حیدر آباد کے مابین نافذ تھا اس لئے اس کی تفصیلات بیان کرنا ضروری ہے۔ دفعہ اوّل میں یہ طے پایا کہ دفاع۔ امُور خارجہ اور مواصلات کا سارا انتظام اُنہی بُنیادوں پر قائم رہیگا جو ۱۵[1]؍اگست ۴۷ء سے پہلے رائج تھا۔ حیدر آباد میں اندرونی شورش کی صورت میں بھارت فوجی امداد دینے کا پابند نہ ہوگا اور نہ ہی اُسے اسکا اختیار ہوگا۔ بجز زمانہ جنگ بھارت کو حیدر آباد میں کوئی فوج رکھنے کا حق نہ ہوگا اور ناگہانی حالات میں اگر فوج رکھی بھی جائے تو وہ جنگ کے خاتمہ کے بعد چھ ماہ کے اندر واپس بُلالی جائے گی دفعہ ۲ میں حیدر آباد اور دہلی میں ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کے حق کو تسلیم کیا گیا دفعہ ۳ میں بھارت نے اقتدار اعلیٰ۔ Paramountcy کے اختیارات کو استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ دفعہ ۴ میں معاہدے سے متعلق تنازعہ کی صُورت میں فریقین کو ثالثی کے سپرد کرنے پر اتفاق کیا گیا دفعہ ۵ میں اس مُعاہدے کی مدت ایک سال مقرر کی گئی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اہم جزو Collateral Letter میں بھارتی حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی۔ کہ اُسے حیدر آباد کے لندن یا کسی اور ملک میں اپنا نمائندہ مقرر کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن ایسے نمائندوں کے لئے

[1] Hyderabads relations with Dominion of India
Volume I

ضروری ہوگا۔ کہ اُن کی کاروائیاں بھارتی نمائندوں سے مربُوط ہوں۔ الیسی کاروائیوں کا دائرہ تجارت تک محدُود ہوگا۔

حصّہ دوم

تیسرا باب

نئے صدرِ اعظم کی تلاش

فرزندِ زمین کا تصور

یوں تو مُغلیہ سلطنت کے زوال کے آغاز ہی سے ہندوستان کے ہر علاقے کے مسلمان اپنی تہذیب اور ثقافت کے تحفظ اور ذہنی سکون کی تلاش میں حیدرآباد آتے رہے۔ لیکن سالار جنگ اوّل کے زمانے میں نوواردوں کا یہ سلسلہ تیز ہوگیا۔ برطانوی ہند سے بہت سے ماہرینِ نظم ونسق اور علم وفن کے جویا حیدرآباد آئے اور وہاں کے ماحول کو اپنی صلاحیتوں کے لئے سازگار پاکر شہرت کے آسمان پر درخشاں ستارے بن کر چمکے۔ محسن الملک۔ وقار الملک۔ مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ۔ عزیز مرزا۔ موتمِد الملک (سرعلی امام) سعید الملک (نواب چھتاری) سراکبر حیدری۔ فخر یار جنگ راس مسعود۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی۔ ملک غلام محمد۔ زاھد حسین جیسے بزرگون نے بڑی دلسوزی سے حیدرآباد کی خدمت کی۔ اور اپنے کارہائے نمایاں سے کل ہند شہرت حاصل کی۔ اس طرح علم وادب کے میدان میں حالیؔ۔ شبلیؔ۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ ظفر علی خان۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق۔ مولوی عنائیت اللہ۔ عبدالحلیم شرر۔ ہاشمی فرید آبادی جوش ملیح آبادی۔ فانی بدایونی۔ ماہر القادری اور دوسرے بے شمار اہلِ قلم حضرات نے مسلمانوں کی اِس آماجگاہ میں علم وادب کے چراغ روشن کئے۔ بیسویں صدی کے پہلے چار عشرون میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ قاضی محمد حسین۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ ڈاکٹر مظفر حسین قریشی۔ الیاس برنی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے دانشوروں نے حیدرآباد کو علم وفضل اور اسلامی ثقافت کا مرکز بنا دیا اور قومی زبان کے احیاء کے لئے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ جامعہ عثمانیہ کا عظیم تجربہ اور اسکے واسطے سے علوم وفنون

کی اشاعت حیدرآبادی اور غیر حیدرآبادی مسلمانوں کی ان تھک اجتماعی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ اس کے علاوہ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے آگلے وقتوں میں (بالخصوص بہار اور ۴۷ء ۱۹ کے بعد) مقامی مسلمانوں نے اپنے دینی بھائیوں کا بڑی خندہ پیشانی اور خوشدلی سے استقبال کیا اور اُن کی آبادکاری میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں۔ لیکن اُس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر علاقائی عصبیت اور فرزند زمین کا غیر اسلامی تصور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد پر غالب آجاتا تھا۔ اور برطانوی ہند سے اُن کا تعلق باہر سے آنے والوں کے لئے حیدرآباد میں اُنکے لئے بے شمار مسائل پیدا کر دیتا تھا جس کو نشانے میں اُنکی عمریں گذر جاتی رہیں تھیں۔ ملکی صداقتنامے کے حصول میں ہندوؤں کو کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ضابطے کی ساری کاروائی مسلمانوں ہی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی تھی آج سے ۷۰ برس پہلے سر علی امام کی دُور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب مستقبل میں اُنکے لئے سیاسی مشکلات پیدا کر دیگا۔ اُس کے توڑ کے لئے آبادکاری کی ایک سکیم بنائی گئی جسکا مقصد حیدرآباد کے غیر آباد علاقوں میں باہر سے مسلمانوں کو لاکر آباد کرنا تھا - - - اگر اس سکیم کے نفاذ میں رکاوٹیں نہ پیدا کی جاتیں تو ۴۷-۱۹۴۸ء میں پیش آنے والی حکومت صورت حال میں حیدرآباد میں بسنے والے مسلمانوں کی پوزیشن زیادہ مستحکم ہوتی۔ مگر یہ سکیم مسلمان مفاد پرست طبقہ کی مہا سبھائیوں سے گٹھ جوڑ کی بھینٹ چڑھ گئی عصبیت کے اس غیر دانشمندانہ مظاہرے سے سر علی امام اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ انہوں نے استعفیٰ دیدیا اور حیدرآباد کی حدود سے باہر جانے تک پانی نہیں پیا۔ وہ کہتے تھے کہ میں اس ریاست میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتی دیکھ رہا ہوں میر لائق علی نے اس سکیم کے ضمن میں جسطرح نظام اور سر علی امام کا ذکر کیا ہے[۳] - وہ میری نظر میں بلا جواز ہے - اُن

[۱] محمد یامین زبیری جو لائق علی وزارت کے ایک رکن اور مجلس اتحاد المسلمین کے معتمد تھے۔ مضمون بعنوان "حیدرآباد ایک تہذیب کا ماتم جو ختم ہو گئی" شائع شدہ روزنامہ ایام کراچی مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء - بحوالہ کتاب "حیدرآباد کے عروج و زوال" صفحہ ۹۰ میں لکھا ہے۔ کہ اس سکیم کا آغاز مہاجرین کی آبادکاری سے ہوا تھا [illegible]

[illegible] [۲] روایت نواب بہادر یار جنگ تحریری ۔ سر علی امام [illegible]

[illegible] میر عثمان علی خان [illegible]

کا سب سے دلچسپ تبصرہ ہے۔ کہ اُس دور کے مسلمانوں میں سر علی امام کی قدآور شخصیت انتظامی صلاحیت سے عاری تھی۔ سر علی امام کی دُور رس نگاہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اُسکو کئی برس کے بعد بہادر یار جنگ نے محسوس کیا اور انہوں نے ۱۹۳۲ء میں نواب چھتاری کو ترکستان کے کئی ہزار جلاوطنوں کو حیدرآباد کے غیر آباد علاقوں میں آباد کرنے کی تجویز پیش کی۔ مگر اُسوقت فرزند زمین والی عصبیت اتنا زور پکڑ چکی تھی کہ اُسکی کامیابی کا ذرا بھر بھی امکان نہیں تھا پھر ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو لائق علی نے گاندھی سے اپنی ملاقات میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے مسلمانوں کو حیدرآباد میں آباد کرنے کا مشورہ دیا تھا جسے گاندھی نے سوچ بچار کے بہانے سے ٹال دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حالات کی اُفتاد سے پہلے اس عصبیت کے مضر اثرات کا احساس حیدرآبادی اکابر کو بھی ہونے لگا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ ایسے وقت ہوا۔ جب پانی سر سے اُونچا ہو چکا تھا۔ قصّہ مختصر اس عصبیت اور مفاد پرست طبقے کی تنگ نظری نے اُس مملکت ہی کو ختم کر دیا۔ جسکے بل پر وہ صدیوں سے اقتدار کے مالک تھے۔ - بشمول اجتماعی نقصان جو اس عصبیّت سے اُمت مسلمہ اور خود حیدرآباد کو بحیثیت ایک اسلامی مملکت کے پہنچا - - - - - - - - - مسلمانوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ماضی میں علاقائی عصبیت بہت سی اسلامی ریاستوں کی تباہی کا باعث بنی۔ اس لئے اسلامی کردار کی حامل حکومت میں اس عصبیت کا فروغ اس کے مستقبل کے لئے نیک فال نہیں تھی۔ علاوہ اجتماعی نقصان کے مسلمان قوم کے بہت سے جوہر قابل کو جن کی صلاحیتیں مملکت کے استحکام کے کام آسکتی تھیں۔ گوناگون پریشانیاں اُٹھانی پڑیں۔ مثال کے طور پر حیدرآباد کے ایک عظیم دانشور ڈاکٹر۔ یوسف حسین خاں کو جنہوں نے حیدرآباد کی کم از کم دو نسلوں کو پڑھایا تھا۔ اپنے پورے دورِ ملازمت میں اس عصبیت سے مسلسل واسطہ پڑتا رہا۔ مجھے اُن کی پریشانیوں کا ذاتی طور پر علم ہے وہ اپنی کتاب "یادوں کی دنیا" میں بلاشبہ بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔ مگر اُنکے مختصر سے تبصرے

[۱] میر لائق ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحات ۲۲-۲۳ Tragedy of-
[۲] بہادر جنگ مکتوب مورخہ ۶ مارچ ۱۹۴۳ء
[۳] میر لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحات ۱۱۶-۱۱۷ -Hyderabad

سے جاننے والے بہت کچھ اخذ کرسکتے ہیں" فرماتے ہیں کہ "ہمارے سب سے بڑے بھائی اور سب سے چھوٹے بھائی محمود میاں کے علاوہ جو قائم گنج میں پیدا ہوئے - باقی سب نے حیدر آباد میں جنم لیا - اس لئے وہ ملکی کہلائے جانے کے مستحق تھے - مگر حیدر آباد والے اُس کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے - اُن کے ملکی ہونے کے معیار کچھ اور تھے - جس پر شاید ہم پُورے نہیں اُترتے تھے"[1] اس ضمن میں علی یاور جنگ کے اس خیال کی تردید ضروری ہے - کہ غیر ملکی مسلمانوں نے فرقہ داری تنظیم کو جنم دیا اور انتشار کو ہوا دی - یہ رائے حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی - بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فرقہ وارانہ کھچاؤ غیر ملکی ہندوؤں کی کارگزاری تھی جنکے حیدر آباد میں آنے پر قیود بس برائے نام تھیں اس عصبیت کا وقت کے ساتھ اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا لیکن جیسے جیسے ہندوستان کی آزادی کی گھڑی قریب آرہی تھی اسمیں نمایاں طور پر اضافہ ہوگیا -

صدر اعظم کی تلاش ناسا عد حالات سے مجبور ہو کر جب نواب چھتاری دوسری بار حیدر آباد سے رُخصت ہوئے تو صدر اعظم کے عُہدے کے لئے ایک ایسی شخصیت کی تلاش تھی جو اپنے تدبر - سیاسی سُوجھ بُوجھ اور معاملہ فہمی سے ملکی سیاست کی گتھیاں سُلجھا سکے - مہدی یار جنگ کو عارضی طور پر یہ ذمہ داری سونپی گئی - مگر یہ محض دفع الوقتی تھی جس سے بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوگیا - جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے - اُس وقت ملک میں سوچ و فکر کا جو انداز تھا اور سیاست جو رُخ اختیار کر رہی تھی - اُس کے پیش نظر کسی غیر حیدر آبادی سیاست دان کے لئے اس ذمہ داری کو سنبھالنا بہت مشکل تھا .... وہ چاہے کتنا ہی مخلص بحر سیاست کا شناور اور ماہر نظم و نسق ہو - کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُس فضا میں اُسے کسی حلقے سے تعاون حاصل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میر لائق علی جو بعد میں اس عُہدے پر فائز ہوئے - سیاسی

[1] یادوں کی دنیا صفحہ ۴۸

Hyderabads Relations with Dominion of India

مذاکرات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب میں یہ چبھتا ہوا - فقرہ لکھ گئے "وہ چھتاری مشن میں ایک انگریز اور دو کا تعلق انڈین یونین سے تھا" یعنی حیدر آباد کے اُس نازک وقت میں سوال مُوزنیت کا نہیں تھا - بلکہ اس بات کا تھا - کہ وفد کے ارکان ملکی فرزند زمین ہیں یا نہیں - ان حالات میں باہر سے کوئی کل ہند شخصیت کا سیاست دان مکمل تعاون اور اپنائیت کی یقین دہانی کے بغیر اُس ذمہ داری کو اُٹھانے کے لئے کیسے تیار ہو جاتا سابق وزیر خزانہ ملک غلام محمد کو جو اُس وقت پاکستان میں اُسی عہدے پر فائز تھے - اس کی پیش کش کی گئی - لیکن انہوں نے معذرت کر دی - لائق علی کی روایت ہے کہ اُنکے انکار کی وجہ خرابی صحت تھی - اغلب ہے کہ روائیت ملک غلام محمد کے اپنے بیان پر مبنی ہو - مجھے یقین ہے کہ اُنکے تذبذب کی یہی ایک وجہ نہیں تھی - انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا - کہ اس پیشکش کو قبول کرنے میں دو رکاوٹیں تھیں - ایک یہی عصبیت تھی - جسے وہ ملکی سازش کا نام دیتے تھے جسکا اُنہیں اپنے دور وزارت میں کافی سابقہ پڑ چکا تھا دوسری وجہ نظام کی متلوّن مزاجی تھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ اُس وقت کی صحت کی حالت میں نو زائدہ ملک پاکستان کی وزارت خزانہ کا بار سنبھال سکتے تھے اور بعد میں ایک مطلق العنان گورنر جنرل کا کردار کر سکتے تھے تو حیدر آباد کی وزارت عظمٰے کا عُہدہ سنبھالنے میں کیا امر مانع تھا - یہ نہ بھولیئے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں وہ صرف وزیر خزانہ تھے - گورنر جنرلی پہ فائز ہونا اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہو سکتا تھا - بہر حال وجہ کچھ بھی ہو - غلام محمد نے یہ پیشکش مُسترد کر دی - اُس کے بعد زاہد حسین کا نام زیر غور آیا جو اُس وقت دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے - اُنکے بارے میں تار کے ذریعہ پوچھا بھی گیا لیکن وہاں سے انکار آگیا - مقامی لوگوں میں جنرل احمد العیدروس دین یار جنگ صدر ناظم کوتوالی - اور میر لائق علی کے نام زیر غور آئے[2] - اول الذکر دو ناموں پر اتفاق رائے نہ ہونے سے صرف میر لائق علی میدان میں رہ گئے - انہیں اپنے کاروبار کے سلسلے

[1] لائق علی - ٹریجڈی آف حیدر آباد صفحہ ۹۸
[2] لائق علی ،، ،، ۹۱

Tragedy of Hyderabad

میں ہندو مسلم دونوں طبقوں میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ وہ ایک مرنجاں مرنج۔ پابند شریعت اور متدین مسلمان تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ حیدر آباد ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے ہندو مسلمانوں کا مُشترکہ ورثہ بنے۔ اُن کی اس شُہرت سے عام تأثر یہی تھا کہ نظام کی اکیلی نظر انتخاب اُنہی پر پڑے گی۔ لیکن مجلس اتحاد المسلمین نے ذرا بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ اور قاسم رضوی نے نظام کو ایک طرح کا الٹیمیٹم بھجوا دیا کہ ۲۴ گھنٹوں میں میر لائق علی کو یہ ذمہ داری سونپ دی جائے ورنہ وہ راست اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ دین یار جنگ صدر[1] ناظم کوتوالی جنہیں نظام کا خصوصی قُرب حاصل تھا۔ خدا معلوم اس راست اقدام کی کتنی ہولناک تصویر کھینچی ہوگی۔ کہ لائق علی الٹیمیٹم کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے ہی صدر اعظم مقرر ہو گئے۔ بدر شکیب[2] نے اس تقرر کی بڑی دلچسپ کہانی لکھی ہے۔ جس کے راوی اُنکے بیان کے مطابق عبدالرحیم اتحادی وزیر تھے۔ تقرر کے فوری محرکات کچھ بھی ہوں یہ واضح تھا[3]۔ کہ اتحاد المسلمین کی بے صبری نے اچھی صلاحیتوں کی حامل ایک ایسی شخصیت کو جو دونوں فرقوں میں توازن قائم کر کے اُن کا اعتماد حاصل کر سکتی تھی عملاً ایک فرقہ کا نمائندہ بنا دیا بعد میں یہی چیز اُن کی کامیابی میں بڑی رکاوٹ بن گئی کیونکہ اس طرح وہ اتحاد المسلمین کے آلۂ کار سمجھے جانے لگے۔ اور غیر مسلم فرقوں کے تعاون سے محروم ہو گئے۔ اُس کے ساتھ وہ اتحاد المسلمین کی پالیسی اور اُن کے سیاسی منصوبوں پر عمل کرنے کے پابند ہو گئے۔ اس ذمہ داری کو سنبھالنے سے پہلے لائق علی نے قائد اعظم سے اپنی ملاقات کی رُوداد بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے۔ کہ اُنکا مشورہ یہ تھا کہ جب تک ہندو مسلمان دونوں فرقوں کی طرف سے اُنسے متفقہ طور پر درخواست نہ کی جائے اور جب تک نظام ذاتی طور پر اُن سے اصرار نہ کریں اُنہیں یہ ذمہ داری قبول نہیں کرنی چاہیے۔ چوہدری محمد علی کی روایت ہے۔ کہ نظام نے لائق علی کے تقرر کے بارے میں قائد اعظم سے پوچھا تھا تو انہوں نے

[1] یادداشت سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد۔ [2] بدر شکیب حیدر آباد کا عروج و زوال صفحات ۱۵۰ تا ۱۵۲۔
[3] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدر آباد صفحہ ۱۲۔ Tragedy of Hyderabad

اس کے خلاف مشورہ دیا تھا[1]۔ اتحاد المسلمین کا سہارا لینے کے بعد دوسرے فرقوں کی نظر میں لائق علی کی غیر جانب داری مُشتبہ ہو گئی اور پھر بجائے اس کے قائد اعظم کے مشورے کے مطابق نظام کے ذاتی اصرار کا انتظار کیا جائے۔ جو لوگ نظام کو ذاتی طور پر جانتے تھے وہ اتفاق کریں گے کہ کسی دباؤ کے تحت اُن سے سو فیصدی تعاون کی امید رکھنا ایک بڑی خوش فہمی تھی۔ بہر حال نئے صدر اعظم کے تقرر کو اتحاد المسلمین نے اپنی ایک فتح قرار دیا جسکا اُنہوں نے بڑا چرچا کیا۔ جس نے لائق علی کی پوزیشن کو مزید کمزور کر دیا۔ حیدر آباد کی حیثیت بھارتی سمندر میں ایک جزیرہ کی سی تھی وہ چاروں طرف سے شرپسند عناصر سے گھرا ہوا تھا۔ ان حالات میں تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ سب فرقوں میں اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ ہوتا۔ ۱۹۴۷ء میں سب فرقے نظام کے اعلان آزادی کے ہم نوا تھے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس جذبے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا کر ملک کی سیاسی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی سعی کی جاتی۔ اور چھوٹی چھوٹی فرقہ وارانہ کامیابیوں پر اتنا نہ اترایا جاتا۔

لائق علی وزارت کی تشکیل

وزارت کی تشکیل میں سب سے زیادہ مشکلات اتحاد المسلمین کی طرف سے پیدا ہوئیں۔ بظاہر وہ ایک مضبوط سیاسی پارٹی تھی مگر اس میں اندرونی خلفشار تھا جو وزراء کے انتخاب کے وقت صاف ظاہر ہو گیا۔ نامزد وزراء کی فہرست مرتب کرنے میں اسی کھینچا تانی کی وجہ سے بہت تاخیر ہو گئی۔ پھر جب یہ فہرست پیش ہوئی تو اس میں چند ایسے نام تھے جو نظام اور صدر اعظم کی نظر میں ناموزوں تھے۔ اس پر بحث مباحثہ شروع ہو گیا۔ قاسم رضوی ایک مضبوط سیاسی پارٹی کے طاقتور سربراہ ہونے کے باوجود وزراء کے انتخاب میں اپنی عاملہ سے مات کھا گئے۔ اس لیت و لعل سے لائق علی کو اتنی کوفت ہوئی کہ وہ ایک مرحلے پر استعفٰی دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ معاملہ جبھی آگے بڑھا جب[2] قاسم رضوی

[1] چوہدری محمد علی The Emergence of Pakistan
[2] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدر آباد صفحہ ۹۹۔ Tragedy of Hyderabad

نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ فی الوقت اُن کی عاملہ کے نامزد وزراء کو لے لیا جائے اور تحریری وعدہ[51] کیا کہ وزارت قائم ہو جانے کے بعد اگر ناپسندیدہ عناصر کو باہر کے ملکوں میں ایجنٹ جنرل بنا کر بھیجدیا جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور وہ وزارت کے لیے متبادل نام پیش کر سکیں گے۔ ملک کے انتہائی نازک دور میں یہ انداز فکر کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اچھی شخصیتوں کو سامنے لانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ . . بلکہ وعدے بندیوں سے سیاسی مفاد کا تحفظ اصل مقصود تھا۔ ناپسندیدہ وزراء کو بطور سفیر بھیجنے کی تجویز اُسی انداز فکر کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو ۳۰ برس سے مملکت پاکستان میں کارفرما نظر آتی ہے۔ جہاں ناپسندیدہ شخصیت کو موقعہ سے ہٹانے کے لئے یا کسی اور سیاسی یا ذاتی مصلحت کی بنا پر بلالحاظ اس کے وہ اہم ذمہ داری کا اہل بھی ہے یا نہیں کسی باہر کے ملک میں سفیر مقرر کر دیا جاتا ہے!!

بہرحال اسی شرط پر اتحاد المسلمین کی دی ہوئی فہرست قبول کرلی گئی۔ اس کے بعد سرکاری عہدہ داروں میں سے لئے جانے والے وزراء کا مسئلہ زیر غور آیا۔ یہاں بھی اتحاد المسلمین کو اصرار تھا کہ اُنکے انتخاب میں بھی اُس کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ اُسی کے نامزد وزراء کا انتخاب ہوا۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ یقیناً ایک انقلابی موڑ تھا۔ کیونکہ وزراء کے تقرر میں نظام کا اختیار تمیزی جو برطانوی دور[52] میں بھی بہت حد تک برقرار تھا وہ اب اچھوں کے ہاتھوں ختم ہوگیا۔ عہدہ داروں کے . . طبقے سے اتحاد المسلمین کے نامزد وزراء کے بارے میں یقین نہیں کیا جاسکتا کہ جس مقصد کے تحت انتظامی صلاحیتوں کے حامل اشخاص کو وزارت میں لیا گیا تھا۔ وہ ان وزراء کے انتخاب سے پورا ہوگیا۔ لائق علی کے احباب اور بہی خواہوں نے انہیں سمجھایا۔ کہ ہر بات میں اتحاد المسلمین کے دباؤ میں نہیں آنا چاہیئے۔ اس طرح جہاں ایک طرف اُن کی اپنی پوزیشن اور وقار متاثر ہوتا ہے۔ دُوسری طرف اگر وہ بڑھتے ہوئے دباؤ کو نہیں روکیں گے۔

[51] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۹۹ Tragedy of Hyderabad

[52] بدر شکیب۔ حیدرآباد کا عروج و زوال۔ صفحہ ۱۵۴۔

تو وہ سیاسی طور پر اُس کے تابع مہمل ہو کر رہ جائیں گے مگر یہ بات تو اُس وقت ممکن ہوتی جب وہ اپنے تقرر کے لئے اُن کے ممنون احسان نہ ہوتے!!

کانگریس نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا اس لئے مقننہ میں اُس پارٹی کا کوئی رُکن نہیں تھا قومی یکجہتی کی خاطر صدر اعظم نے اُس سے بھی نامزدگیاں طلب کیں۔ پہلے دو نام پیش ہوئے پھر کسی مصلحت یا بیرونی ہدایت کے تحت ایک نامزدگی واپس لے لی۔ ایک نامزدگی کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کانگریس اپنے نمائندے کے ذریعہ کابینہ کی کارروائیوں اور عزائم سے آگاہ رہنا چاہتی تھی۔ ہندوؤں میں سے چار وزراء تھے۔ کانگریس کے ایک نمائندے کے علاوہ تین وزراء مختلف گروپوں سے غیر معروف شخصیتیں تھیں اور یہ لوگ بھی نیم دلانہ طور پر شریک ہوئے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ انہوں مناسب نمائندگی نہیں ملی۔[53]

نئی وزارت کے سامنے نظم و نسق کے مسائل

متضاد نظریات اور مختلف رُجحانات کے حامل ۱۲ افراد پر مشتمل اس وزارت کے سامنے سب سے بڑا دُشوار مسئلہ امن و امان کی بحالی تھی۔ بہت سے مُفسد عناصر اتحاد المسلمین کے مخالف گروپ سمیت امن عامہ کو تہ و بالا کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ سوامی رامانند تیرتھ کانگریس لیڈر حکومت کے معتمد مالیات لکشمی نرائن گپتا کی رشتہ پر اور ہندو ساہوکاروں کی مالی اور عملی تعاون سے اضلاع اور سرحدی علاقوں تخریبی کارروائیاں کر رہا تھا منافرتی فضا قائم کرنے کے لئے لائق علی نے رامانند تیرتھ کو رہا . . . کردیا۔ وہ کسی بہانے سے مملکت کی حدود سے باہر چلا گیا اور وہاں جاکر انہی عناصر کے ساتھ مل کر تخریبی کارروائیاں اور تیز کردیں۔ امن عامہ کو خراب کرنے میں لکشمی نرائن گپتا جو حکومت میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھا اس حد تک ملوث تھا کہ اگر اُسے بھارتی ایجنٹ جنرل منشی کا تعاون

[53] یادداشت سابق چیف سکریٹری بہادر اشتیاق احمد۔

حاصل نہ ہوتا تو جنرل چوہدری کی فوجی حکومت کے دور میں اُس کی بُری گت بنتی۔ نئی حکومت میں اتنا کس بل نہیں تھا کہ وہ گھر کے اس بھیدی کو اس کلیدی عہدے سے ہٹا سکتی۔ اس طرح لا مانند تیرتھ کی بیرون ملک تخریبی کارروائیوں۔ مہاسبھائی شرپسندوں کی حرکتوں اور اسی قماش کے دوسرے عناصر بشمول ہندو عہدداران کی سازشوں سے بدامنی پھیلتی گئی۔ سرحدوں پر حملے تیز ہوتے گئے۔ تیرتھ کے ملک سے باہر جانے کے چند روز کے بعد شاہراہ عام پر نظام کی کار پر ایک دستی بم پھینکا گیا۔ جو خوش قسمتی سے بے ضرر ثابت ہوا۔ کانگریس کے قائدین نے اس واقعہ کی مذمت کی۔ مگر یہ واضح تھا۔ کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی جس کے کرتا دھرتا یہی لوگ تھے یا اُنکے تنخواہ یاب کارندے۔ نظام نے اس موقعہ پر بڑے تحمّل اور خود اعتمادی کا ثبوت دیا۔ وہ خود موٹر سے اُترے۔ موقعہ کا معائنہ کیا اور حملہ آوروں کو اُن کے قانونی دفاع کے لئے سب جائز سہولتیں دینے کے لئے ہدایات جاری کیں۔

امن وامان کی بحالی اور معاشی زندگی کی ضروریات

بھارت سے کیا ہوا معاہدہ انتظام جاریہ

شروع ہی سے بالکل غیر موثر تھا۔ اُس کی ایک شرط بھی پُوری نہیں ہوئی۔ معاشی مقاطعہ کھلم کھلا لاگو کر دیا گیا۔ آزادی ملنے سے پہلے آل انڈیا کانگریس کے قائدین نے مختلف بہانوں اور ہتھکنڈوں سے زندگی کی ضروریات کی اشیاء کی درآمد کے راستے بند کر دیئے تھے یہ[1] حصُول آزادی کے بعد یہ طریق کار بھارتی حکومت کی مُسلّمہ پالیسی بن گئی۔ اور انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات کی چیزوں کی درآمد ممکن نہ رہ سکی۔ حتیٰ کہ پینے کے پانی کو صاف کرنے کے لئے کلورین کی شدید قلت ہو گئی۔ جس سے ہیضہ کی وبا پھیل گئی۔ اور دواؤں کی کمیابی سے اس وبا پر قابو پانے کی کوئی سبیل نہ رہی۔ اس کے علاوہ گولہ بارُود کی فراہمی بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اُس کی کمی امن وامان کی بحالی میں رُکاوٹ پیدا کرتی تھی۔ بھارت سے مذاکرات جاری تھے۔ مُعاہدہ انتظام جاریہ بھی نافذ العمل تھا جس کے تحت گولہ بارُود اور اسلحہ کی مقامی ضروریات کے مطابق فراہمی بھارتی حکومت کی ذمہ داری تھی مگر لائق علی کے

[1] لہ الاوّل - ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۵۔ Tragedy of Hyderabad

دہلی کے بار بار دوروں اور حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل کی مسلسل پیروی کے باوجود نتیجہ بالکل صفر تھا۔ ملک میں اسلحہ سازی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اقتدار اعلیٰ سے معاہدات کے تحت اُس کی ممانعت تھی۔ قطب شاہی اور اُس سے پہلے کے ادوار میں اسلحہ سازی ہوتی ہوگی۔ مگر انگریزوں نے چالاکی سے مختلف بہانوں سے یہ کام بالکل بند کروا دیا تھا اسلئے اسلحہ سازی کی اب صرف یادیں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ پُرانی قسم کے ہتھیار کثیر تعداد میں نجی اسلحہ خانوں میں زنگ آلود ہو کر پڑے تھے اُنکا ذخیرہ کرنے کی مہم شروع کر دی گئی اور بہت سی پرانی ساخت کی بندوقیں۔ بھالے۔ نیزے .... اکٹھے کر لئے گئے۔ اُن میں جو چیز بھی قابل استعمال سمجھی گئی۔ اسے ٹھیک ٹھاک کر لیا گیا اور نا قابل استعمال چیزوں کو گلا پگھلا کر دوسرے ہتھیار بنانے کے کام میں لایا گیا۔ مختلف محکموں سے متعلق ورکشاپ کو نئے سرے سے منظم کیا گیا تاکہ وہ چھوٹے موٹے ہتھیار بنا سکیں۔ چھوٹے پیمانے پر یہ کوشش موٹر کار اور ہوائی جہاز کے دور میں بیل گاڑی چلانے والی بات تھی مگر یہی چیز بھارتی حکومت کی پروپاگنڈا مشنری کا ہدف بن گئی اس میں دروغ گوئی۔ مُبالغہ آرائی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر کے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی۔ جیسے حیدرآباد میں اسلحہ فیکٹریاں بن رہی ہیں۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ بار بار کی یقین دہانیوں اور مُعاہدوں کے خلاف بھارتی حکومت اسلحہ کی فراہمی میں لیت ولعل سے کام لے۔ اور اگر امن وامان کی بحالی کے لئے مقامی طور پر کچھ کوشش کی جائے تو وہ واویلا مچانا شروع کر دے!! ایک ایسی مملکت کے تحفظ کے لئے جسکی بڑی وسیع اور طویل سرحدیں ہوں جس کے خلاف بھارت کے ملحقہ علاقے غُنڈوں کو ایک منصوبے کے تحت تربیت دے کر تخریب کاری کے لئے اسلحہ فراہم کرتے ہوں اس قسم کے چھوٹے منصوبے کافی نہیں تھے۔ بلکہ ایک ایسے انتظام کی ضرورت تھی۔ جو امن وامان کی بحالی کی سب ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ یہ صرف باہر سے درآمد کی صورت ہی میں ممکن تھا۔ مگر اس تجویز پر عمل کرنے میں کئی اہم دُشواریاں تھیں ایک بڑی دُشواری یہ تھی کہ غیر ملک سے اسلحہ کی خریداری ایسی نہیں ہے کہ بازار میں ترکاری اور گوشت طرح خرید جاسکے۔ حیدرآباد یہ تقاضے پورے کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسری دُشواری یہ تھی کہ ذرائع مواصلات مکمل طور پر بھارت کے کنٹرول میں تھے۔

اس لئے خریدے گئے ہوئے اسلحہ کو حیدرآباد پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ نواب چھتاری کے دوسرے دور میں کابینہ میں یہ مسئلہ اُٹھایا گیا تھا۔ انہوں نے کئی وجوہات کی بنا پر اس تجویز کو ناقابل عمل قرار دیا اُن کا خیال تھا۔ کہ باہر سے اسلحہ درآمد کرنے کی کوئی کوشش راز نہیں رہ سکتا اگر وہ راز فاش[1] ہوگیا تو سیاسی مذاکرات پر اس کا بڑا مہلک اثر پڑے گا۔ اُس وقت کی سیاسی فضا میں نواب چھتاری کی طرف سے دیئے گئے۔ ہر مشورے کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ نظام کے براہ راست احکامات کے تحت اور وزیر خزانہ لیاقت جنگ کے مشورے سے میجر جنرل العیدروس نے یورپ کے کئی چکر لگائے مگر ہر مرتبہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکام مشن کی بھنک بھارتی حکومت کے کان میں پڑگئی اور مذاکرات کے دوران ماؤنٹ بیٹن نے اس کا ذکر کیا۔ نواب چھتاری نے اُس وقت اس مسئلہ کو بڑی مشکل سے سُلجھایا۔ لائق علی حکومت کے دور میں جہاں ایک طرف مقامی وسائل سے کام لیا گیا دوسری طرف ایک انتہائی خُفیہ منصوبے کے تحت باہر سے اسلحہ درآمد کرنے کا انتظام بھی ہوا۔ یہ انتہائی رازدارانہ اور دلیرانہ کاروائی تھی۔ کراچی میں حیدرآباد کی ایجنسی کی ذمہ داریوں کے ضمن میں اس کاروائی اس منصوبے اور اس پر عملدرآمد کرنے کے طریق کار اور اُس کی دُشواریوں کا تفصیلی ذکر آئے گا۔ اس کاروائی میں ہندو وُزراء کو کہاں تک اعتماد میں لیا گیا وہ ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ حیرت یہ ہے۔ کہ دوسرے وُزراء بھی منصوبے کی تفصیلات سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر اتحادالمسلمین نے ملکی دفاع کے لئے اپنی ایک رضاکار تنظیم بنالی تھی حالات کی ابتری نے حکومت کو مجبور کردیا۔ کہ وہ اس تنظیم سے تعاون کرے۔ امن وامان سے متعلق تدابیر کا یہ پہلو بھی کُھلم کُھلا زیر بحث نہیں لایا جاسکتا تھا ان وُجوہ سے یہ واضح ہوگا۔ کہ وزارتی نظام میں ذہنی تحفظات کار فرما تھے۔ جسکی وجہ سے وُزراء میں ہم آہنگی کا فُقدان تھا اس لئے مضبُوط حکومت کا قیام

[1] یادداشت سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد

بھی ممکن نہ رہا اور نظم ونسق کا سارا بوجھ لائق علی اور اُن کے چند قابل اعتماد وُزراء کے کندھوں پر پڑگیا۔ آخری دور میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ مسلمان وُزراء نظم ونسق کے مسائل اور سیاسی معاملات سے بے تعلق ہوکر رہ گئے ہیں۔ معلوم[1] ایسا ہوتا تھا۔ کہ انہیں اپنی ذمہ داریوں سے زیادہ اپنے مرتبے اور اُس سے ملنے والی مراعات سے دلچسپی تھی اُنہیں اعتماد میں لیا جاتا تھا نہ خود انہیں اپنے اختیارات سے محرومی اور عدم اعتماد کا کوئی احساس تھا۔

حیدرآباد ایر فورس کی تشکیل[2] کا منصوبہ

موجودہ سائنسی دور میں کسی ملک کے دفاعی نظام میں ایر فورس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے سرکاری کاغذات میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ بگر وائسرائے ہوس کی ایک میٹنگ مورخہ ۲۲ جون ۱۹۴۷ء کی رُوداد سے پتہ چلتا ہے۔ کہ لندن میں مقیم حیدرآباد کے نمائندے نے ایر چیف مارشل سر کرسٹوفر کورٹنی کو حکومت حیدرآباد کی طرف سے دعوت دی تھی کہ حیدرآباد کی مجوّزہ ایر فورس کی تشکیل کے بارے میں مشورہ دیں اور اُس کے لئے برطانوی ہوائی جہاز اور عملے کا بندوبست کریں۔ اُس نے انڈیا آفس سے رجُوع کیا تو اُس سے کہا گیا کہ اس مسئلہ پر تین چار ماہ تک غور نہ کیا جائے۔ تین چار ماہ کا التوا کس پیش بینی کے تحت تھا یہ واضح نہیں ہے۔ شاید وہ اس مدت میں "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" کے مُنتظر تھے حیدرآباد کے نمائندے کی اس پیش رفت پر ماؤنٹ بیٹن اور اُس کے حوارین کی جھنجلاہٹ کا چیف آف اسٹاف کمیٹی کی میٹنگ مورخہ ۲۵ جولائی ۴۷ء کی رُوداد سے پتہ چلتا ہے۔ جس میں ہمارے لندن کے نمائندے کو کے لقب سے نوازا گیا ہے[3]۔ حالانکہ دو برس سے برطانوی حکومت کی نظر میں وہ ایجنٹ جنرل

[1] مکتوب معین نواز جنگ بنام لائق علی جو کراچی سے میرے واسطے سے حیدرآباد بھیجا گیا تھا۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ایسا وقت آگیا ہے کہ دوسرے وزراء کو اعتماد میں لیکر صدراعظم کو اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہیئے۔

[2] لندن میں شائع شدہ سرکاری کاغذات صفحہ ۷۷۰ (۲۲ جون ۱۹۴۷ء) Transfer of Power

[3] لندن میں شائع شدہ سرکاری کاغذات صفحہ نمبر ۱۱۰۱۔ ٹرانسفر آف پاور صفحہ ۱۲۴۔

تھا اور حیدر آباد کے سقوط تک یعنی ۲۵ جولائی کی میٹنگ کے ایک سال سے زیادہ عرصہ تک حکومتی سطح پر وہ ایجنٹ جنرل کے لقب سے ہی مخاطب کیا جاتا رہا!! ایر مارشل کے کورٹنی کا اندازِ فکر ذرا مختلف تھا ورنہ وہ یہ نہ کہتا۔

"-------there may well be more than one view on the whole question and that it may not be in the best interests of His Majesty's Government that a chance of retaining a strong foothold in the largest Indian State should be discarded"[1]

اتحاد المسلمین اور دفاعی صورت حال

دفاعی صلاحیت کی کمزوری اور وسائل کی کمی ایک ایسی حقیقت تھی جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس صورت حال کا اتحاد المسلمین کو بھی احساس تھا۔ چنانچہ لائق علی وزارت کے قیام کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اتحاد المسلمین کے اکابر ایک اتحادی وزیر کی رہائش گاہ میں جمع ہوئے۔ جس میں میر لائق علی کو بھی مدعو کیا گیا۔ انہوں نے حکومت کے مالی اور دفاعی وسائل اور عسکری صلاحیت[2] کی روشنی میں دفاعی صورت حال کا مکمل جائزہ پیش کیا وہ اتنا حقیقت پسندانہ تھا کہ اتحادی وزراء کی اکثریت بشمول قاسم رضوی نے اس بات پر اتفاق کیا کہ محاذ آرائی کے بجائے اگر مناسب سمجھوتہ ہو جائے تو وہ بہتر ہو گا۔ صرف چند اراکین نے اختلافی نقطہ نظر پیش کیا۔ اکثریت کے اس واضح رجحان کے بعد بجائے اس کے کہ اس قسم کے سمجھوتے کے امکانات پر غور ہوتا اتحاد المسلمین کے چند جذباتی نوجوانوں نے اپنے جلسے میں اتنا زور باندھا۔ اور جذبات ہوشمندی کے بند توڑ کر ایسا بہہ نکلے قائد اتحاد المسلمین نے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے

[1] لندن میں شائع شدہ سرکاری کاغذات نمبر ۱۱۹۔ ٹرانسفر آف پاور صفحہ ۱۴، [2] بروایت شیخ حیدر رضا سابق پرنسپل لاء کالج کراچی

والی تقریر کر ڈالی۔ اس ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کے اُس خط کا بھی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو انہوں نے حیدر آباد کی جماعت اسلامی کے محمد یونس صاحب کی معرفت قاسم رضوی کو بھیجا تھا جس میں انہیں مشورہ دیا گیا تھا کہ حیدر آباد کے جغرافیائی اور سیاسی حالات اور ہندو اکثریت کی وجہ[3] سے حیدر آباد میں مسلمانوں کی حکومت کا پرانا تصور قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے مزاحمت اور کشمکش کی بجائے۔ ایسا سمجھوتہ کرنا مناسب ہو گا جس میں انڈین یونین میں حیدر آباد کی شمولیت اور ذمہ دارانہ حکومت کا قیام مسلمانوں کے لئے کم از کم مضر ہو سکے۔ بتایا جاتا ہے۔ کہ قاسم رضوی نے اس خط کو پڑھے بغیر پھاڑ کر پھینک دیا۔ مجھے مولانا کے خط کے اصل متن کی تلاش تھی جو مجھے بڑی کوشش کی دستیاب ہو گیا۔

[3] روایت۔ عبدالکریم عابد صاحب جو اب روزنامہ جسارت کے مدیر ہیں۔ یہ روایت میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا مودودی کا اصل خط ضمیمہ میں درج ہے۔ (بخبار)

حصّہ دوم

چوتھا باب

سفارتی اداروں کا قیام

لندن ایجنسی

برصغیر کی آزادی سے کچھ عرصہ قبل حکومت حیدرآباد کی طرف سے لندن میں ایک نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس سفارتی ادارے کے قیام کے وقت برطانوی حکومت کے ذہن میں کیا تھا اور کن مصلحتوں کے تحت اسکی اجازت دی گئی تھی یہ واضح نہیں ہے شاید یہ دو عالمی جنگوں میں "یار وفادار" کی بھرپور امداد کا یہ ایک سستا رسمی اعتراف تھا۔ بہرحال جون ۱۹۴۷ء میں میر نواز جنگ لندن میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل تھے اُن کی رہائش اور دفتری ضروریات کے لئے حیدرآباد ہاؤس کے نام سے ایک عالیشان عمارت حاصل کر لی گئی تھی اور ایک افسر برائے تعلقات عامہ بھی متعین تھا جس کے فرائض میں حیدرآباد کے موقف کی تشہیر اور رائے عامہ کو ہموار کرنا شامل تھا۔ جون ۱۹۴۷ء سے پہلے حیدرآباد کے صنعتی اداروں کے لئے مشینری۔ پُرزے اور ضرورت کی دوسری اشیاء کی خرید بھی ایجنٹ جنرل کی ذمہ داری تھی اس کے بعد تھوڑی بہت خریداری تو ہوتی رہی۔ لیکن خرید کئے ہوئے سامان کو حیدرآباد پہنچانا اُس کے لئے انتہائی دشوار ہو گیا وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اہم سیاسی کام انجام دے سکتا۔ البتہ نظام کے پیغامات برطانیہ کے بادشاہ اور سیاسی اکابر تک پہنچانا اُسی واسطے سے ہوتا تھا۔ اُس کے لئے بڑی دشواری یہ تھی کہ کوئی خفیہ بات۔ ٹیلیفون تار یا ڈاک سے بھیجنا یا وصول کرنا ممکن نہیں تھا اُسے اپنی حکومت سے رابطہ رکھنے کے لئے کراچی ایجنسی کا سہارہ لینا پڑتا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

حیدرآباد میں بھارتی ایجنٹ جنرل

ایک سال کے مُعاہدہ انتظام جاریہ کے

تحت حیدرآباد کا بیرونی ممالک میں ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بھارت نے اس معاملہ میں پہل کر دی۔ اور معاہدے کے چند دنوں کے بعد ہی ایک کٹر مہاسبھائی کنہیا لعل منشی کو حیدرآباد میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجدیا۔ یہ شخص مہاسبھائی شورش اور ہلچل کے دور میں حکومت بمبئی کا ہوم منسٹر تھا اور اپنے عہدہ کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے اس وقت حیدرآباد کے امن وامان کو تہ وبالا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ منشی نے اپنے اس کردار کا اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے مگر اُس کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نظام نے اُس سے التجا کی تھی کہ شورش پسندوں کو حیدرآباد جاتے ہوئے شولاپور میں روکا جائے جسے اُس نے رد کر دیا۔ اُس نے ایک دوسری جگہ سر اکبر حیدری کی اس تجویز کا ذکر کیا ہے یہ تو قرین قیاس ہے کہ حق ہمسائگی کی بنا پر سر اکبر کی حکومت نے ایسی کوئی تجویز پیش کی ہوگی۔ مگر نظام کو منشی کی بارگاہ میں ایک ملتجی کی حیثیت سے پیش کرنا محض دروغ گوئی ہے۔ جسے اُن سے اپنی .... اہمیت کو جتلانے کے لئے وضع کیا ہے۔ اسی شخص کے ایماء سے اگست ۱۹۴۷ء سے حیدرآباد کی معاشی ناکہ بندی کی ابتدا ہو چکی تھی اور حیدرآباد کا بہت سا سامان بمبئی کی بندرگاہ میں روک لیا گیا تھا۔ اس پس منظر اور ریکارڈ کے ساتھ اس شخص کا تقرر مفاہمت کے لئے کوئی نیک فال نہیں تھی اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے اس نے بمبئی میں ہوائی راستے سے تیز تھے صدر اور ملک کے دوسرے کانگریسی لیڈروں کے علاوہ نائب صدر اعظم پنگل و نیکٹ ریڈی اور معتمد مالیات لکشمی نرائن گپتا سے خفیہ ملاقاتیں کیں اور ملک کے بہت سے سربستہ راز حاصل کر لئے۔ اس طرح اُس نے اپنی سفارت کا آغاز مملکت کے کارپردازوں کے جذبہ وفاداری کو ختم کر کے انہیں اپنے جاسوسی کا ذریعہ بنا لیا۔

ریذیڈنسی کی عمارت میں قیام پر اصرار

حیدرآباد پہنچتے ہی اُس نے ایک اہم مسئلہ کھڑا کر دیا۔ برطانوی دور میں اُس کے نمائندے ریذیڈنسی کی عمارت میں قیام کیا کرتے تھے اُن کی تقلید میں وہ بھی اُسی عمارت میں رہائش اختیار کرنے پر مُصر تھا۔ حیدرآباد کو اس عمارت اور اُس کے ملحقہ علاقے کو برطانوی حکومت سے واگذار کرنے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ منشی کی ہٹ دھرمی

پر وہ سارا انتظام درہم برہم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حکومت نے جب اُس کی اُس خواہش کو ماننے سے انکار کر دیا تو ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ بڑی ردّ وکد کے بعد یہ طے ہُوا کہ اُسے حکومت حیدر آباد کے مہمان کی حیثیت سے بلارم ریذیڈنسی میں ٹھہرایا جائے۔ وہاں چند روز کے قیام کے بعد اُس کی ملحقہ عمارت "دکن ہوس" میں جو برطانوی دور میں برٹش کمانڈر کی رہائش گاہ ہوتی تھی منتقل ہو گیا۔ وہاں جاتے ہی وہ عمارت دکنتا سدن کے نام سے کہلائی جانے لگی۔ اور جلد ہی ہندو شر پسندوں کی سازشوں کا مرکز اور جاسوسی کا اڈّا بن گئی۔

جاسُوسوں کا اڈّا

حکومت حیدر آباد سے تعلّق رکھنے والے کتنے ذمہ دار لوگ مُنشی کی گرفت میں آ چکے تھے۔ یہ تو اُس نے نہیں بتایا مگر اپنی کتاب میں کئی ایسے لوگوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایک بڑے افسر نے جسکے نام کا اُس نے انکشاف نہیں کیا اُس کے پورے زمانہ قیام میں حکومت کے خلاف جاسوسی کی[1] جب حیدر آباد میں اس کے لئے حالات سازگار نہیں رہے۔ تو وہ بمبئی چلا گیا جہاں غلطی سے اُسے حیدر آباد کا جاسُوس سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ پھر مُنشی ہی کے کہنے سننے سے اُسے رہائی ملی۔ ظہیر احمد کے بارے میں جو وزارت خارجہ کے سکریٹری کے اہم عہدہ پر فائز تھا اُس نے بتایا ہے کہ وہ ۸ ۔ مئی کو اُس کے پاس آیا اور اُس پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ بھارت اور حیدر آباد میں مصالحت کرا دے اگر یہ روایت صحیح ہے۔ تو اُس وقت کے حالات میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کی سلسلہ جنبانی کا اُسے حکومت کی طرف سے اختیار دیا گیا ہو۔ لائق علی نے اپنی کتاب میں اس کا نہیں ذکر کیا اور نہ سرکاری سطح پر اس کا کسی کو علم تھا اُس نے بالا ہی بالا یہ کاروائی کی ہوگی۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ چند ماہ کے بعد اقوام مُتحدہ میں حیدر آباد کے مقدمے میں یہی بزرگوار وفد کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے پیش ہُوئے مُنشی کی روایت کی روشنی میں حیدر آباد کے سُقوط کے بعد بھارتی حکومت کی طرف

[1] کے۔ ایم۔ منشی The End of an Era

سے اُسے اچانک سفارتی عہدے پر فائز کیا جانا سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مُنشی نے حیدر آبادی فوج کے ایک اعلیٰ افسر کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کے نام کے انکشاف سے احتراز کرتے ہوئے اُسے "خاموش آواز" کے نام سے موسُوم کیا ہے۔ اُس نے حیدر آباد کے فوجی وسائل کے بارے میں اُسے ایک تفصیلی رپورٹ بہم پہنچائی۔ جس سے ظاہر ہے بھارتی فوج کو کافی مدد ملی ہوگی۔ کرنل گراہم سے بھی جو حیدر آباد میں ایک کلیدی فوجی عہدہ پر فائز تھا اُس کا کافی میل جول تھا اور حیدر آباد سے روانگی کے وقت مُنشی کی سفارش سے بھارتی حکومت نے اُسے کئی مراعات سے نوازا العیدروس کا بھی اُس سے ربط تھا اور بیگم اور العیدروس سے مُنشی کی خصوصی سفارش کی بنا پر بمبئی میں دی۔ آئی۔ پی برتاؤ کیا گیا اس کے علاوہ کچھ درباری بھی تھے جو اندر کی خبریں اُسے پہنچاتے تھے منظور جنگ سے میل جول کا اُس نے کئی بار ذکر کیا ہے اور ہوش یار جنگ کے بارے میں تو اُس نے یہاں تک لکھا ہے کہ ایک دفعہ رات کو وہ ننگے سر، کُرتے پاجامے میں ملازمین کے آنے جانے کے راستہ سے اُسکے گھر آیا اگر ہوش یار جنگ کا مقصد خُفیہ نہیں تھا تو اُسے بھیس[2] بدل کر بے وقت بھارتی نمائندے کے مکان میں نوکروں کے دروازے سے داخل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ ہوش یار جنگ کے مُنشی سے خلا ملا کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اُس نے اپنی کتاب "مشاہدات" کا پیش لفظ جس میں حیدرآباد کے خلاف بہت زہر اُگلا گیا ہے۔ مُنشی سے لکھوایا ہے جو اُردو زبان سے بالکل نابلد تھا اس پیش لفظ کے لکھوانے کا مقصد بظاہر یہی ہو سکتا ہے کہ مُنشی کی بارگاہ میں اپنے قرب کا ثبوت پیش کیا جا سکے۔ ہندو جاسُوسوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں مگر ایک صحافی شاستری کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ وہ اتحاد المسلمین والوں کے اعتماد میں بھی تھا۔ اور وہاں کی سب خبریں مُنشی کو پہنچاتا تھا۔

طریق کار کو برطانوی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش

حیدر آباد آتے ہی مُنشی نے[3] اس بات کا اعلان کیا۔ کہ

[1] کے۔ ایم۔ منشی The End of an Era

[2] ، The End of an Era

[3] ، The End of an Era

حیدر آباد اور بھارتی حکومتوں کے درمیان تمام خط و کتابت ایجنٹ جنرل کے واسطے سے ہوگی - اور تمام معاملات اُسی ذریعہ سے طے پائیں گے اس کا مطلب یہ تھا کہ بھارتی ایجنٹ جنرل کی حیدر آباد میں وہی پوزیشن اور کردار ہوگا جو برطانوی ریذیڈنٹ کا ہوتا تھا - منشی نے کھُلم کھُلا اپنے آپ کو اُسی سانچے میں ڈھالنا شروع کیا - حالانکہ مُعاہدہ انتظام جاریہ میں اقتدارِ اعلیٰ کی واضح طور پر نفی کی گئی تھی - منشی کے بارے میں تھوڑے ہی دنوں میں یہ پتہ چلا کہ اُسے بھارتی حکومت کے بعض حلقوں[1] کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور اُس کی رائے پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی اس لئے اس کا سفارتی کردار بالکل منفی نوعیت کا تھا وہ بار بار اپنی برتری جتلاتا تھا اور بھارتی حکومت میں مناسب پذیرائی نہ ہونے سے کھُلم کھُلا اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا تھا اُس کا بیشتر وقت شر پسند لیڈروں سے میل جول رکھنے اور غنڈہ گردی پر اُکسانے میں گذرتا تھا - کیمبل جانسن نے اس ضمن میں ماؤنٹ بیٹن کی منشی کے بارے اُس رائے کا بھی حوالہ دیا ہے کہ مذاکرات[2] کے اس نازک مرحلے میں منشی اپنی طبیعت اور رُجحان فکر کی وجہ سے اپنے فرائض کا کما حقہٗ انجام نہیں دے سکتا - شاہ انگلستان کے نام بھی اپنی رپورٹ میں منشی کا ذکر کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ وہ قابلِ بھروسہ نہیں ہے - ماؤنٹ بیٹن اور وزارتی حلقوں میں اپنی مشکوک شخصیت کے باوجود وہ اپنی شر پسندی سے باز نہیں آیا - چنانچہ مارچ ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے میں جب مفاہمت کا کچھ امکان نظر آتا تھا وہ میدان میں کُود پڑا اور سارا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا -

دہلی میں حیدر آباد کا ایجنٹ جنرل

دہلی میں ایجنٹ جنرل کے عہدے کے لئے زین یار جنگ کا انتخاب ہُوا - وہ فن تعمیر کے ماہر تھے اور اگر اُنکی رسائی نظام کے درباریوں میں نہ ہوتی تو اُنکی صلاحیتیں یقینی طور پر فن تعمیر کی حد تک ہی محدود رہتیں ۔ . . . .

[1] کیمبل جانسن Mission with Mountbatten
[2] ہاڈسن H.V. Hodson - The Great Divide

لیکن دربار کی رسائی نے پہلے اُنہیں وزارت تک پہنچایا اور پھر ملک کے اس انتہائی نازک دور میں دہلی جیسے حساس مقام پر حیدر آباد کی نمائندگی کا اعزاز بخش دیا زین یار جنگ کی عام شہرت یہ تھی کہ انہیں کرسیِ اقتدار سے بہت محبت ہے اور وہ اُس کے حصول کے راستے میں رکاوٹوں کو دُور کرنے کے ہر طریقے کو جائز سمجھتے ہیں یہ سب جانتے ہوئے تعجب ہے کہ اتحادالمسلمین جو ہر سیاسی مسئلے اور اہم اور غیر اہم تقررات پر اپنی مرضی منوانے پر اصرار کرتی تھی - - - دہلی میں زین جنگ کے تقرر پر کیسے راضی ہوگئی - حکومت نے اپنا نمائندہ اپنے مفاد کے تحفظ اور دہلی میں اپنے خلاف سیاسی چالوں اور سازشوں پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کیا تھا - یہاں معاملہ بر عکس ہوگیا یعنی دہلی میں زین یار جنگ کی موجودگی حکومت کے لئے ایک دردِ سر بن گئی (اگرچہ اسکا احساس ایسے وقت ہوا جب پانی سر پر سے گذر چکا تھا حکومت کے مفاد کی حفاظت تو کیا کرتے اُنہوں نے اپنی حکومت کو بھارت کے منصوبوں اور معاندانہ کارروائیوں سے بھی بے خبر رکھا حیدر آباد کا کوئی منصوبہ یا راز راز نہیں رہا - بھارت کے " مردِ آہن " سردار پٹیل کے دروازے اُن کے لئے ہمیشہ کھُلے رہتے تھے -

زین یار جنگ سے میری پہلی ملاقات

کراچی میں ایجنٹ جنرل کے عہدے پر اپنے تقرر کے بعد دہلی میں اُن سے اپنی پہلی ملاقات میں جو میں نے تاثر لیا وہ یہ تھا کہ وہ لائق علی اور اتحاد المسلمین دونوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے یا تو وہ جانتے بوجھتے حکومت کی پالیسی اور اُسکے سیاسی مؤقف کے خلاف تھے - ایسی صورت میں ایمانداری اور شرافت کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ یہ ذاتی ذمہ داری قبول نہ کرتے یا لائق علی سے سیاسی رقابت تھی ایسی صورت میں اپنے ذاتی رجحانات اور جذبات کی خاطر ملک کے مفاد کو داؤ پر لگا دینا انتہائی قابل اعتراض فعل تھا اور اتحاد المسلمین کے بارے میں اُن کے ذاتی خیالات جو کچھ بھی ہوں ایک سفیر کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ غیر ملک میں اپنی حکومت اور سیاسی پارٹیوں پر معاندانہ تبصرے کرتا پھرے - وہ مجھ سے ناقابلِ یقین حد تک بے رُخی سے پیش آئے - اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے ہم مرتبہ سفیر کو خوش آمدید کہتے وہ پُورا وقت جلی کٹی باتیں کرتے رہے - زیادہ تر لائق علی

حکومت کی "نااہلی" کا رونا روتے رہے - مجھے یہ بھی تاثر ہوا - کہ وہ سرے سے پاکستان سے حیدرآباد کے کسی قسم کے سفارتی تعلقات اُستوار کرنے کے خلاف ہیں جون ۱۹۴۸ء میں مذاکرات کے انقطاع پر حیدرآبادی قرطاس ابیض جاری کرنے کا مرحلہ آیا تو انہوں نے نہ صرف دانستہ اُس کی اجرائی میں مزاحمت کی - بلکہ حکومت کے واضح اعلان کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے اس واقع کی تفصیل دوسری جگہ آئے گی -

نئے سفارتی انداز

آنے والے واقعات کی روشنی میں بہ یقین سے کہا جا سکتا ہے - کہ دہلی میں زین یار جنگ کا تقرر لائق علی وزارت کی سب سے بڑی اور سنگین غلطی تھی میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ صدر اعظم اپنے دہلی کے نمائندے کی سوچ و فکر کے انداز اور سیاسی رُجحانات سے واقف نہیں تھے ...... اپنے عُہدہ کا چارج لیتے ہی میں نے صدر اعظم کو زین یار جنگ سے ملاقات سے پیدا ہونے والے تاثرات سے مطلع کر دیا تھا اُس کا اعادہ میں نے دہلی میں مئی ۱۹۴۸ء میں بالمشافہ کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے عرصہ تک اس صورت حال کو کیوں برداشت کیا گیا ایک شخص جب اپنے ملک کی سفارت کا عُہدہ سنبھالتا ہے تو وہ اُس کے مفاد کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور بلا کسی ذہنی تحفظات کے اپنی حکومت کے موقف اور حکمت عملی کی ترجمانی کرتا ہے - وہ اپنے جائے تقرر پر اپنی حکومت کی پالیسی کو زیر بحث لاتا ہے اور نہ اُس کے رازوں کا غیروں کے سامنے انکشاف کرتا ہے - کیمبل جانس کی روایت کے مطابق وی - پی - مینن اور زین یار جنگ کی باہمی گفتگوؤں کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ حیدرآباد کے نمائندے[1] نہیں بلکہ فریق مخالف سے تعلق رکھتے ہیں اُسی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ دوران گفتگو آن حیدرآباد کی وزارت میں شامل ہونے کا ذکر آیا تو زین یار جنگ نے کہا کہ یہ اُس وقت ممکن ہے کہ نظام خود اُن سے کہیں اور بھارتی حکومت کا اُس میں دباؤ شامل نہ ہو -

---

[1] کیمبل جانس - Mission with Mountbatten صفحہ ۳۴۱

معلوم نہیں غیر حکومت کے کارپردازوں کے سامنے اپنے ملک کی وزارت بندی کو زیر بحث لانا سفارتی اخلاق کی کون سی دفعہ کے تحت آتا ہے !!

جولائی ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتہ میں جا کر کہیں لائق علی پر یہ انکشاف ہوا - کہ زین یار جنگ کی رپورٹیں متضاد - مبہم اور یک رنگی سے عاری ہوتی ہیں وہ نظام سے کچھ کہتے تھے اور لائق علی سے کچھ اور انقطاع مذاکرات کے بعد بھی بھارتی حکومت کے ارادوں اور رجحانات کے بارے میں بھی اُن کی رپورٹوں میں صریحاً تضاد[1] ہوتا تھا - پھر حکومت کے واضح موقف کے خلاف مرزا اسمٰعیل کی خُفیہ سرگرمیوں میں وہ اُنکے آلۂ کار بن گئے - اس انکشاف کے بعد اُنہیں بالآخر اس عُہدے سے سبکدوش کر دیا گیا لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ سُبکدوشی کے بعد بھی انہیں حیدرآباد ہوس میں قیام کی اجازت دے دی گئی - اس سے آخر کیا سمجھا جائے - کیا یہ ضروری تھا کہ سردار پٹیل کے ذرائع اطلاعات اور جاسوسی کا اڈا کھلا رکھنے میں - ہمارا تعاون بھی شامل ہو - تاریخ عالم سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جو حکومت اپنے وفادار اور غداروں میں تمیز نہیں کر سکتی یا اپنی کمزوری اور سیاسی سوجھ بوجھ کی کمزوری کی وجہ سے انہیں برداشت کرتی ہے . تو گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے مصداق بالآخر تباہی اور بربادی اُس کا مقدر ہو جاتا ہے - اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لندن اور دہلی دونوں جگہ کے سفارت خانوں کے سکریٹری ہندو تھے جو حکومت کے راز شروع ہی سے بھارتی حکومت کو پہنچاتے رہے اور حکومت میں کسی کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ انہیں رُخصت کر دے سقوط حیدرآباد کے چند روز کے بعد دہلی ایجنسی کے سکریٹری نگیندر بہادر اور لندن کے سکریٹری اقبال چند کی طلبی ہوئی - انہوں نے رہے سہے رازوں کا بھی انکشاف کر دیا -

❖

---

[1] لائق علی - ٹریجڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۴۶ - ۲۴۷
Tragedy of Hyderabad

[2] یادداشت - سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد

دوسرے ممالک میں حیدرآباد کے نمائندوں کے تقرر کی تجویز

دوسرے ممالک میں حیدرآباد

کے نمائندوں کے تقرر کے تجویز بھی زیر غور تھی جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ہمارا سفارت خانہ لندن میں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے جب پاکستان بھیجا گیا تو اُس وقت دوسرے ممالک میں سفراء کے تقرر کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ پاکستان کو تجویز پیش کی گئی کہ وہ اپنا نمائندہ حیدرآباد بھیجے۔ وہاں سے جواب ملا۔ کہ فی الوقت کوئی اقدام نہیں ہو سکتا تھا مناسب وقت پر اس تجویز پر غور ہوگا۔ زین یار جنگ کے واسطے سے مجھے ایک مسودہ اس ہدایت کے ساتھ وصول ہوا کہ اُس کے متن کے مطابق میں حکومت مصر اور سعودی عربیہ کو نمائندے مقرر کرنے کی تجویز بھیج دوں۔ یہ مسودہ میری نظر میں قطعی طور پر ناموزوں تھا زین یار جنگ نے مجھے بتایا تھا کہ اسی مضمون کے مراسلے آسٹریلیا امریکہ اور کینیڈا کی حکومتوں کو بھیجے جا چکے ہیں یعنی اُن کے متن کے بارے میں مزید غور و خوض کا وقت گذر چکا ہے۔ بہرحال میں نے اپنا یہ فرض سمجھا۔ کہ اس مسودے میں جو خامیاں مجھے نظر آتی تھیں میں اُن سے صدر اعظم کو آگاہ کر دوں۔ میری دلیل یہ تھی کہ کوئی ایسی تحریر جس سے براہ راست یا بالواسطہ ہمارے سوچے سمجھے موقف پر زد پڑتی ہو۔ اُن غیر ممالک کو جن سے ہم سفارتی تعلقات اُستوار کرنا چاہتے ہیں۔ بھیجنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے خود پاکستان جیسے دوست مُلک میں اس نوع کی تحریر نے بڑی اُلجھن اور پریشانی میں ڈال دیا تھا مسودے کے پہلے فقرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے حیدرآباد کے نمائندوں کا تقرر بھارتی حکومت کی مرضی اور منظوری کے تابع ہے۔ جس حکومت کو بھی اس قسم کا مُراسلہ بھیجا گیا اُس کا پہلا اقدام یہ ہوگا۔ کہ وہ بھارتی حکومت سے پُوچھے کہ آیا اسے ہماری تجویز پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ ایسی صُورت میں بھارت کا جواب آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی میں نے اپنے نُقطۂ نظر کی تفصیلی وضاحت کر کے مسودے میں چند بنیادی ترمیمات کی درخواست کی۔ جواب میں مجھے یہ بتایا گیا کہ مسئلہ کے سب پہلوؤں پر غور کر کے یہ مسودہ تیار کیا گیا ہے۔ اب اُس میں مزید کسی ترمیم یا رد و بدل کی گنجائش نہیں ناچار میں نے حکومت مصر کو

دی تحریر بھیج دی۔ سعودی عربیہ کا سفارت خانہ ابھی پاکستان میں قائم نہیں ہوا تھا اُس کے نام کی دستاویز لندن میں ایجنٹ جنرل کو بھیج دی۔ کینیڈا۔ آسٹریلیا اور امریکہ کی حکومتوں نے کیا جواب دیا مجھے اس کا علم نہیں۔ مصر کی حد تک جو مجھے خدشہ تھا وہ صرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ مصر کے سفیر نے اطلاع دی۔ کہ ہماری تحریر پر بھارتی حکومت سے رجُوع کیا گیا تھا۔ اُس نے نہ صرف شدید مخالفت کی بلکہ اصرار کیا کہ حیدرآباد کو کسی مُلک میں سفارتی حکومت نمائندہ قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔ لُطف یہ ہے۔ کہ لندن میں ہمارا سفارت خانہ دو برس سے کام کر رہا تھا اور مجھے بھی پاکستان میں کام کرتے ہوئے دو تین ماہ گذر چکے تھے بھارتی حکومت نے مصر سے یہ بھی مطالبہ کیا۔ کہ حیدرآباد کی طرف سے اس قسم کی مُراسلت آئندہ قبول ہی نہ کی جائے۔ اس طرح دوسرے ممالک میں سفراء کے تقرر کی تجویز میری دانست میں جرأت مندی کے فقدان کی بھینٹ چڑھ گئی اور ہماری اپنی کمزوری سے "بات بھی کھوئی التجا کر کے" کے چکر میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

حصّہ دوم

پانچواں باب

پاکستان میں حیدرآباد ایجنسی کا قیام اور اسکی ذمّہ داریاں

طرفین کے ذہن میں ایجنسیوں کے قیام کا کیا مقصد تھا معاہدہ انتظام جاریہ کے تحت ایجنسیوں کے قیام کے بارے یہ بات طے ہو چکی تھی۔ کہ حکومت حیدرآباد دوسر ممالک میں اپنی صوابدید اور پسند سے اپنے نمائندے مقرر کر سکیگی یہ فیصلہ کرتے وقت طرفین نے ان تقررات کے مضمرات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ مثال کے طور پر آخر وقت تک یہ بات طے نہ ہو سکی۔ کہ بھارت اور حیدرآباد کے نمائندوں میں رابطے کی نوعیت کیا ہوگی اور اُس کا طریق کار کیا ہوگا۔ اس لئے اس فیصلہ کے بارے میں ابتدا ہی سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ حکومت حیدرآباد کا اپنا ذہن بھی اپنے نمائندے کے دائرہ کار کے بارے میں صاف نہیں تھا۔ اس عہدے کے صحیح القاب کا بھی آخر وقت تک تعین نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ دہلی میں "نظامس ایجنٹ جنرل تھا" لندن میں "ایجنٹ جنرل برائے حیدرآباد سٹیٹ" اور کراچی میں "ایجنٹ جنرل برائے حیدرآباد" اس افسوسناک تضاد کی طرف کئی بار توجہ دلائی گئی مگر آخر وقت تک اس کی وضاحت نہیں ہوئی۔ اور مختلف القاب استعمال ہوتے رہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ وزارت اُمور خارجہ میں بھی اس بارے میں اتفاق رائے نہیں تھا چنانچہ صدر اعظم اور وزیر خارجہ مجھے "ایجنٹ جنرل برائے حیدرآباد" کے لقب سے خطاب کرتے رہے۔ مگر سکریٹری وزارت خارجہ مجھے نظامس ایجنٹ جنرل ہی لکھتے رہے۔

پاکستان میں حیدرآباد ایجنسی پر میرا تقرر دوسرے مُلکوں میں ایک سفارت پر میرا نام زیر غور تھا عام طور پر حیدرآباد میں یہ افواہ گرم تھی کہ مجھے قاہرہ بھیجا جائیگا یا امریکہ۔ مملکت آصفیہ میں میری ساری ملازمت مواصلات کے محکمہ سے متعلق رہی تھی مواصلات اور سیاست میں کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے اس افواہ کو قطعی طور پر کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایکدن میرے جنرل منیجر نے بتایا کہ میرا نام کراچی کی ایجنسی کے لئے زیر غور ہے۔ میرا ردّ عمل واضح طور پر اس کو قبول کرنے کے خلاف تھا لیکن جب یہ معلوم ہوا۔ کہ یہ نامزدگی نظام کے احکامات کے تحت ہوئی تھی تو میں نے حامی بھر لی۔ مجھے تیاری کے لئے صرف تین دن کی مہلت ملی اس دوران مجھے اپنے سارے نجی اور سرکاری کاموں کو نبٹانا تھا۔ بظاہر میرا تقرر چار ماہ کے لئے ہُوا تھا جس کے بعد مجھے واپسی پر ریلوے کی جنرل منیجری کا چارج لینا تھا جس کے لئے میں نامزد ہو چکا تھا۔ لیکن میں اپنے تحت الشعور میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اُس سرزمین کو جہاں میرا شعور بیدار ہُوا تھا اور جس سے میرے بچپن اور جوانی کی یادیں وابستہ تھیں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ معاہدہ انتظام جاریہ کی ایک سالہ مدّت میں چار ماہ گذر چکے تھے ہماری طرف سے دہلی کے علاوہ کہیں اور کسی نمائندہ کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ بھارتی ایجنٹ جنرل کو بھی اپنی ذمّہ داریاں سنبھالے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے ہماری طرف سے اس تساہل کا بظاہر کوئی جواز نہیں تھا اب تقرری میں عجلت کی وجہ بھارتی حکومت کے رویّہ میں تبدیلی تھی جو مختلف عنوانات سے ظاہر ہو رہی تھی۔

سفارتی کاغذات روانگی سے ایک دن قبل منجملہ اور کاغذات کے مجھے وہ خریطہ بھی دیا گیا جو قائداعظم کی خدمت میں بطور اسناد تقرر پیش کرنا تھا۔ اس خریطہ میں میری نظر میں اہم چیز اُس کا متن نہیں تھا بلکہ وہ انداز تخاطب تھا جو "میرے عزیز قائداعظم" کے الفاظ میں نظام نے مملکت خداداد پاکستان کے محترم سربراہ کے لئے استعمال کیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ غیر ممالک کے سربراہوں کو اس طرح خطاب نہیں کیا جاتا تاہم حیدرآباد کے سفارت خانہ کا قیام بھی تو ایک غیر معمولی بات تھی۔

اور مخاطب بھی مملکت اسلامیہ پاکستان کا قائداعظم تھا اور دوسرے کاغذات جو مجھے دیئے گئے اُن میں سے بیشتر میرے تقرر کے بارے میں رسمی نوعیت کے تھے جس عجلت سے یہ تقرر ہوا تھا اُسی وجہ سے میری ذمہ داریوں کے بارے میں مجھے کوئی ہدایات نہیں ملیں۔ اور نہ سیاسی مذاکرات سے متعلق مجھے کوئی کاغذات دیئے گئے۔ پاکستان میں اس اہم ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے ہمارے موقف کے بارے میں واقفیت ضروری تھی اور ان دستاویزات کی تیاری کو اولیت دی جانی چاہیئے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ چار ماہ میں اس کام کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ یہ تساہل دانستہ تھا یا وزارت خارجہ کے کارکنوں کی ایک غیر ذمہ دارانہ حرکت تھی۔

صدراعظم کیطرف سے میری ذمہ داریوں کی وضاحت

روانگی سے چند گھنٹے پہلے صدراعظم نے مجھے شرف باریابی بخشا۔ میں اپنی اہم ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے لئے خالی ہاتھ جانے پر ذرا دل گرفتہ تھا انہوں نے اسے محسوس کر کے مختصراً سیاسی مذاکرات کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں جب میں نے تفصیل میں جانے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر میرا منہ بند کر دیا۔ کہ مجھے کوئی خاص ہدایات دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہیں میرے جذبۂ وفاداری پر مکمل اعتماد ہے۔ اور یقین ہے۔ کہ پاکستان میں حیدرآباد کے موقف کو مؤثر طور پر رُوشناس کرانے کے لئے کسی کوشش اور ایثار سے دریغ نہیں کروں گا اُنکے اس خوش دلانہ اعتماد پر میری انا کی تسکین تو ہو گئی۔ مگر میرا مسئلہ کہ وہاں جا کر مجھے کیا کرنا ہے حل نہیں ہوا۔ انہوں نے میری اس بے بسی کو بھانپتے ہوئے فرمایا کہ مجھے کراچی پہنچتے ہی سب باتوں کا علم ہو جائیگا۔ اور سب کاغذات بھی مل جائیں گے گفتگو کے دوران میرے اس سوال پر کہ اگر بالفرض ہمارے بھارت سے تعلقات اتنے خراب ہو جائیں کہ انقطاع کی نوبت آ جائے تو کیا صُورت حال ہوگی۔ انہوں نے ذرا سے توقف سے جواب دیا۔ کہ بھارت میں تیزی سے بدلتے ہوئے تشدد آمیز حالات مسلمان آبادی کو مجبور کر دیں گے کہ وہ نقل مکانی کرے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ غیر مُسلم آبادی بھی منتقل ہو جائیگی۔ میں نے پُوچھا کہ کیا یہ سب کاروائی

تشدد[1] اور خون خرابہ کے بغیر ممکن ہو سکے گی کیا بھارتی حکومت ایک خاموش تماشائی کی طرح اس کاروائی کو دیکھتی رہے گی۔ گو میں اپنی ملازمت کی نوعیت اور تربیت کیوجہ سے سیاست کے کوچے سے نابلد ہوں۔ مگر حکومت کے اعتماد سے نوازے جانے کے بعد ایک محب الوطن کی حیثیت سے میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اتنے بڑے فیصلے جو قوموں کی قسمت اور اُنکے مستقبل سے متعلق ہوں صرف مفروضات کی بنا پر نہیں ہونے چاہئیں کسی ملک کی کثیر آبادی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ایک انتہائی خطرناک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ میں ابھی ابھی مشرقی پنجاب اور دہلی سے مسلمان آبادی کی منتقلی اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اس لئے اس قسم کے اقدام کے ہر پہلو پر تجربے کی روشنی میں ٹھنڈے دل اور سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ میری اس بات کو انہوں نے خاموشی سے سُنا اور یقین دلایا۔ کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کیا جا چکا ہے اب اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ خون خرابے سے متعلق میرے خدشات کی طرف لوٹتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بھارتی حکومت اپنے داخلی اور خارجی مسائل میں اتنی اُلجھی ہوئی ہے۔ کہ وہ صُورت حال پر قابو نہ پا سکے گی۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد کہا کہ .... اگر بالفرض تمہارے خدشات صحیح ثابت ہوئے تو پاکستان اس قضیہ سے الگ نہیں رہ سکتا۔ میں نے پُوچھا کہ کیا اس ضمن میں پاکستان نے کوئی یقین دہانیاں کرائی ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا۔ کہ یہ سب باتیں تمہیں موقعہ پر پہنچ کر خود معلوم ہو جائینگی اب تک میں نے سُنا تھا کہ جب کوئی سفیر اپنا عہدہ سنبھالنے کے لئے دوسرے ملک میں جاتا ہے۔ تو وہ اپنے ملک کی پالیسی اور موقف سے اس حد تک واقف ہوتا ہے۔ ... کہ وہ دوسروں کو قائل کر سکے۔ مگر میں اس پوزیشن میں ڈال دیا گیا تھا کہ اپنے مُلک کے موقف اور اُسے بروئے کار لانے کے لئے ضروری اقدامات کے بارے میں دوسروں کی رہبری کا محتاج تھا مجھے یہ بھی صاف طور پر نہیں بتلایا گیا کہ پاکستان میں کون بزرگ

---

[1] یہ بات میر لائق علی نے اپنی ملاقات کے دوران گاندھی سے بھی کہی تھی

میری رہبری فرمائیں گے۔ البتہ اتنا کہا گیا۔ کہ کراچی پہنچتے ہی مجھے ملک غلام محمد وزیر خزانہ سے ملنا ہوگا۔ ان باتوں میں رات کا ۱½ بج گیا مجھے صبح تڑکے روزانہ ہونا تھا رخصت ہونے سے پہلے میں نے اپنے عہدہ کا حلف اُٹھایا مجھے بتایا گیا کہ حضور نظام کو حلف اُٹھانے کے بارے میں مطلع کر دیا گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ حیدر آباد سے روانگی سے پہلے حضور نظام کی خدمت میں حاضری دُوں۔ صدر اعظم نے بتایا کہ اب وقت نہیں ہے اور اعلیحضرت کو اس کا علم ہے۔

کراچی کا سفر

میرا سفر بمبئی کے راستہ طے ہوا تھا۔ لیکن روانگی سے دو گھنٹے قبل صدر اعظم کو اطلاع ملی گئی۔ کہ بھارتی حکومت کسی نہ کسی بہانے سے مجھے روک لے گی۔ غیر ملک کے سربراہ کے نام جو خط میری تحویل میں تھا وہ اس اقدام کا جواز بن سکتا تھا اس لئے مجھے آخری وقت پر دہلی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اُس زمانہ میں دکن ایرویز کی بمبئی اور دہلی کی پروازوں کا وقت قریب قریب ایک ہی ہوتا تھا اس لئے میرے پروگرام میں تبدیلی کا کسی نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ تو یہ سپرٹ تھی معاہدہ انتظام جاریہ کی۔ کہ اُسکے تحت کئے جانے والے اقدامات اس طرح دھاندلی سے کالعدم کئے جا سکتے تھے۔ دہلی میں اس وقت فرقہ وارانہ فضا بہت خراب تھی اس لئے مجھے بجا طور پر خدشہ تھا کہ سفر کا راستہ بدلنے سے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ دہلی سے کراچی کی پرواز کے لئے اگلے دن صبح تک ٹھہرنا تھا یہ وقت میں نے نظام پیلس میں گذارا اس مختصر قیام کے دوران مجھے یہ تاثر ہوا۔ کہ میرے ہم رُتبہ سفیر زین یار جنگ میں گرمجوشی کا فقدان ہے۔ اس وقت تو یہ بات پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر آنے والے واقعات سے یہ بات واضح ہو گئی (جیسا کہ گذشتہ باب میں بھی بتا چکا ہوں۔ کہ سفیر صاحب کو پاکستان میں حیدر آباد کی نمائندگی پسند نہیں تھی اور یہ اندازہ ہوا۔ کہ اُنکے خیالات حکومت کی پالیسی سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ بدیں وجہ دہلی سے روانگی کے وقت موہوم خدشات میرے ذہن پر حاوی تھے۔

کراچی میں اسناد کی پیشکشی کا مسئلہ

کراچی پہنچ کر میں سب سے پہلے ملک غلام محمد صاحب سے ملنے گیا وہ مجھے اپنے ساتھ گورنر جنرل ہوس لے گئے اور قائداعظم کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ مجھے لائق علی کو یہ اطلاع کرنے کی ہدایت ملی۔ کہ معاملہ سب ٹھیک ہے یہ کونسا معاملہ ہے۔ جس کے ٹھیک ہونے کی اطلاع دی جارہی ہے اور مجھے اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ میری جھنجلاہٹ بجا تھی مگر اُس وقت صبر کرنے کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔ وزارت خارجہ سیکرٹری محمد اکرام اللہ کو جو میرے کیمبرج کے ساتھی تھے۔ اپنے وزیر خارجہ کا خط دیا جس میں میرے تقرر کی رسمی اطلاع دی گئی تھی۔ معین نواز جنگ نے اپنے خط میں معاہدہ انتظام جاریہ کے اہم جزو Overriding legislation کا ذکر کیا تھا۔ چونکہ پاکستان کو یہ دستاویز نہیں بھیجی گئی تھی اس لئے اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اگر ذکر ناگزیر تھا تو مصدقہ نقل بھیجی جانی چاہیئے تھی۔ اکرام اللہ نے آف دی ریکارڈ، یہ بات بھی کہی کہ خط میں ان سب حوالوں کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھی سی بات تھی حیدر آباد اپنا نمائندہ پاکستان میں مقرر کرنا چاہتا ہے۔ ہم پہلے ہی یہ تجویز منظور کر چکے ہیں۔ یہ خط تو محض ایک رسمی اطلاع تھی۔ اسناد کی پیشکش کا طریق کار میرے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ وزارت خارجہ کے دانشوروں کی سوچ یہ تھی کہ سفراء کی درجہ بندی میں مجھے سربراہ مملکت کی خدمتیں پیش ہونے کی ضرورت نہیں اور وزیراعظم کی خدمتیں اسناد پیش کرنا کافی ہوگا۔ میں نے اس نقطہ نظر پر شدید احتجاج کیا۔ میری دلیل یہ تھی۔ کہ حیدر آباد کے سفارتی مشن کو قبول کر کے حکومت پاکستان نے حیدر آباد کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اُس کے منطقی نتائج سے گریز نہیں کرنا چاہیئے پاکستان میں حیدر آباد کے سفارت خانے کا ایک خاص مقام ہے۔ اگر تکنیکی وجوہ یا قانونی موشگافی کی بنا پر حیدر آباد کے نمائندے کی مناسب پذیرائی نہ ہوئی تو اس مشن کی غرض وغایت ہی ختم ہو جائے گی۔ میں نے یہ بھی یاد دلایا۔ کہ حکومت حیدر آباد نے وزارت خارجہ پاکستان کے نام اپنے مراسلے مورخہ ۲، مارچ ۴۸ء میں خاص طور پر درخواست کی تھی کہ میں اپنے اسناد تقرر قائداعظم کی خدمتیں پیش کروں۔ اب اگر سفارت خانے کے قیام کے آغاز ہی میں یہ رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ تو یہ بڑی بدنصیبی ہوگی۔ اور اُس کے وقار کو دھچکا لگے گا۔ اگر وزارت خارجہ کو اپنے نقطہ نظر

پر اصرار ہے۔ تو مجھے مہلت دی جائے کہ میں اپنی حکومت کو اس صورت حال سے آگاہ کروں۔ میرے اس احتجاج کی بنا پر یہ مسئلہ قائداعظم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انہوں نے عین میری توقع کے مطابق اسناد سفارت کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ حیدرآبادی سفارت خانے کے قیام کی غرض وغائت قائداعظم کی نظر میں بالکل صاف اور واضح تھی۔ اُس وقت میرا خیال تھا کہ دہلی میں ہمارے نمائندے کو بھی یہی رعایت دی گئی تھی بعد میں پتہ چلا کہ گو انہیں اور بہت سی غیر معمولی رعائتیں دی گئی تھیں مگر سربراہ مملکت کو اپنے اسناد پیش کرنیکی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس طرح دہلی اور لندن کے مقابلہ میں کراچی کے سفارت خانے کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اُس کے نمائندے نے اپنے تقرّر کے کاغذات سربراہ مملکت کو پیش کئے۔

پاکستان میں حیدرآباد ایجنسی کی ذمہ داریاں

ایک ہفتہ کے بعد مجھے وہ دستاویزات اور کاغذات وصول ہوئے جو مجھے اپنی روانگی سے پہلے ملنے چاہیئے تھے۔ ان دستاویزات کو دیکھنے اور ملک غلام محمد سے تبادلۂ خیال کے بعد مجھے اپنی ذمہ داریوں کی وُسعت اور دائرہ کار کا اندازہ ہُوا۔ میرے فرائض کا اہم پہلو جسکا انکشاف کراچی ہی آکر ہُوا۔ وہ یہ تھا کہ بھارت حیدرآباد کے مکمل معاشی مقاطعہ پر تُلا ہُوا ہے۔ جس کی شدت سے اس بات کا واضح امکان ہے کہ حیدرآباد کی معاشی زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے۔ اب میری یہ ذمہ داری تھی کہ بھارت کے اس مذموم منصوبے کے توڑ کے لیے جو بھی عملی تدابیر ممکن ہو سکیں بروئے کار لاؤں یعنی مملکت کی معاشی زندگی کو معمول کے مطابق چلانے اور ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے متبادل ذرائع تلاش کروں اور جہاں سے اور جسطرح بھی ممکن ہو۔ یہ ضروری اشیاء کی فراہمی کا انتظام کروں

حیدرآباد دفاعی اعتبار سے بھی بہت کمزور تھا۔ دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی فوری اقدامات ضروری تھے۔ معاشی ضروریات کی فراہمی اور دفاعی سامان کے حصول میں دو بڑی دشواریاں تھیں۔ بیرون ملک سے سامان کی خرید کے لئے زرمبادلہ کی ضرورت تھی جس کے لئے مجھے بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔ دوسری

دُشواری حاصل شدہ سامان کو بحفاظت حیدرآباد پہنچانا تھا۔ بھارت کے اقدامات کیوجہ سے بحری یا فضائی جہاز سے حمل ونقل ممکن نہ تھا۔ ہمارا بہت سا سامان پہلے ہی بمبئی اور دوسری بندرگاہوں میں رُکا پڑا تھا۔ اس طرح کچھ سامان کراچی کی بندرگاہ میں پڑا تھا۔ اس سامان کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے بس ایک ہی صُورت رہ گئی تھی کہ ایک خصوصی تنظیم کے ذریعہ بھارتی فضائی حدُود پر سے خفیہ طور پر پرواز کرکے مقررّہ اڈّوں تک پہنچایا جائے ایسی تنظیم کا ڈھانچہ میرے کراچی آنے سے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا اب یہ میری ذمہ داری تھی کہ اُسے ایک فعّال ادارہ بنا کر اُس سے حسب ضرورت زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ میرے کراچی آنے کے چند ہی روز بعد بھارتی حکومت نے تار ڈاک اور ٹیلیفون پر تجدید عائد کر دی۔ اس لئے حکومت حیدرآباد سے رابطہ قائم رکھنے کا متبادل ذریعہ بھی فوری توجہ کا محتاج تھا اُس کی واحد صورت کراچی اور حیدرآباد میں طاقتور ٹرانسمٹر نصب کرانا تھا آخری دور میں یہی لاسلکی رابطہ تھا جس کے ذریعہ میں اپنی حکومت سے ہدایات حاصل کر سکتا۔۔ طاقتور ٹرانسمٹر پاکستان اور دوسرے ممالک میں حیدرآباد کے سیاسی موقف کو مؤثر تشہیر بھی میرے فرائض کا ایک اہم پہلو تھا۔ حیدرآباد سے رقوم کی وصولی کا مسئلہ بھی توجّہ طلب تھا۔ ابتک یہ کام حبیب بنک کے ذریعہ انجام پاتا تھا لیکن ہنگامی حالات کے پیش نظر ضرُورت اس امر کی تھی کہ کراچی میں حیدرآباد سٹیٹ بنک کی ایک شاخ کھول دی جائے جو ترسیل زر کے سارے معاملات کی ذمہ داری سنبھالے۔ میرے لئے یہ خُوشی کی بات تھی۔ کہ دو ماہ کے اندر ہی یہ شاخ کھول دی گئی۔ میں نے اپنی ذمہ داریاں کا اجمالی طور پر ذکر کیا ہے اُس کا تفصیل ذکر چھٹے باب میں آئیگا۔ ان فرائض اور ذمہ داریوں کی وُسعت اور ہمہ گیری ایسی تھی کہ اُن سے کامیابی سے عہدہ برآ ہونا بڑا ہی دُشوار کام تھا۔ یہ دُشواری اس لئے اور بھی بڑھ گئی۔ کہ فرائض کی نوعیت اور رازداری کے تقاضوں کے پیش نظر مجھے حکومت نے واضح ہدایت کی تھی کہ حتی الامکان یہ سب کام خود ہی کروں اور دفتر والوں کے لئے روزمرّہ کا بندھا ٹکا کام چھوڑ دوں اس لئے سب راز کے کام دفتری اوقات کے بعد انجام پاتے تھے۔

قائداعظم کی خدمت میں اسناد کی پیشکشی

۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء میری زندگی کا ایک یادگار دن ہے میں نے اُس دن ملت اسلامیہ کے سربراہ اور بانی پاکستان حضرت قائداعظم کی خدمت میں اپنے تقرر کے کاغذات پیش کئے۔ میں اُسے اپنی ذات کے لئے ایک خصوصی امتیاز اور اعزاز سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کی کشتی کے کھیون ہارے سے میرا رابطہ ایک منفرد حیثیت سے ہُوا۔ یعنی میں پاکستانی تو تھا ہی لیکن سربراہ مملکت پاکستان کی خدمت میں میری پیشی ایک بیرونی مسلمان حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ہوئی۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کمزور اور منحنی سے انسان جو بلا کی شخصیت اور رُعب داب کا حامل تھا ایک صوفے پر بیٹھا کچھ کاغذات پڑھنے میں مصروف ہے سامنے تپائی پر چند مثلیں اور دستوری قانون کی کتابیں رکھی تھیں۔ میں نے نظام کا سر بمہر خط پیش کیا۔ اُنہوں نے اُسے کھول کر پڑھا اور تپائی پر ایک طرف رکھ دیا۔ نظام کی خیریت دریافت کی اور میری آمد پر مسرت اور میرے مشن میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا۔ کہ نوابزادہ لیاقت علی خان میرے مشن کو کامیاب بنانے میں ہر ممکنہ مدد دینگے۔ پھر چند لمحات خاموش رہنے کے بعد میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور پوچھا "کیا تم خاص حیدر آباد کے رہنے والے ہو؟" جب میں نے اپنی جائے پیدائش کا نام بتایا اور حیدر آباد سے اپنے تعلق کی وضاحت کی تو انہوں نے خفیف سی مسکراہٹ سے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا "ایک پنجابی نژاد۔ پاکستان میں حیدر آباد کی نمائندگی کر رہا ہے۔ بہت دلچسپ! میں مسلمانوں کو اسی طرح ایک جسد واحد کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں" رخصتی کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا "اگر کسی وقت تمہیں مجھ سے کوئی خاص بات کہنی ہو یا کوئی اہم خبر پہنچانا ہو تو میرے پرائیوٹ سکریٹری سے رابطہ قائم کرو۔ میں تمہیں بلا لونگا" اس سے پہلے میں قائداعظم سے نجی ماحول میں ایک دو بار مل چکا تھا یہ اُن سے میری پہلی سرکاری ملاقات تھی جس مشفقانہ انداز میں انہوں نے میری پذیرائی فرمائی۔ اور جو حوصلہ دلایا اُس سے میرے جسم میں چلّوؤں خون بڑھ گیا اور میں ایک نئے عزم اور بڑی خود اعتمادی کے ساتھ قصر گورنر جنرل سے واپس ہوا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء کو میرے اسناد کی پیشکشی کی

رسم کی خبر اعلامیہ (کورٹ سرکلر) میں شائع ہوئی۔ جس کا نوٹس سب سُفراء نے لیا۔ رائے سری پرکاش بھارتی ہائی کمشنر نے بڑے دوستانہ انداز میں ٹیلیفون پر پُوچھا کہ اسناد کی پیشکشی کیسی رہی اللہ ہی جانتا ہے کہ سوال محض ایک طنز تھا یا وہ مجھ سے کچھ اُگلوا لینا چاہتا تھا۔

کراچی میں متعین سفرائے کرام سے واسطے

مجھے اپنی حکومت سے واضح ہدایت ملی تھی کہ میں بھارتی ہائی کمشنر سے خوشگوار تعلقات اُستوار کروں خوش قسمتی سے اُس وقت بھارت کے ہائی کمشنر رائے سری پرکاش بڑے سلجھے ہوئے۔ تعلیم یافتہ اور خاندانی آدمی تھے اُن سے بہت جلد تعلقات اُستوار ہو گئے ۱۵ اپریل کو اُن سے ملنے گیا۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ اپنے عملے کے لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ میرے مشن کے بارے میں کوئی سوال کریں۔ مگر اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یا تو وہ بھارت اور حیدر آباد کے حالیہ سمجھوتہ کی تفصیلات سے واقف نہیں اس لئے مجھ پر جرح کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں یا وہ محض سفارتی گریز کا ایک انداز تھا رائے صاحب نے اُمید ظاہر کی۔ کہ ہم گاہے گاہے باہمی دلچسپی کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہیں گے۔ جی میں تو آیا کہ کہدوں کہ جناب بھارت اور حیدر آباد کے موجودہ تعلقات کو دیکھتے ہوئے وہ کون سے مشترکہ مفاد ہیں جن کے لئے وہ تبادلہ خیال کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر یہ بات سفارتی آداب کے خلاف ہوتی اس لئے میں ٹال گیا۔ دورانِ گفتگو اُنہوں نے مجھ سے ایک ایسی بات پُوچھی جس نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا وہ کہنے لگے "مشتاق صاحب۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ آپ تو ریلوے کے آدمی ہیں آپ کا انتخاب ایک ایسے کام کے لئے جو سفارتی نوعیت کا ہے کیسے ہُوا؟" میرے پاس اس کا جواب کہاں تھا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ اس کام کے لئے مجھ پر حکومت کی نظر انتخاب کیوں اور کیسے پڑی۔ بہرحال بات کو نبھانا ضروری تھا میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل کے فرائض زیادہ تر پاکستان اور حیدر آباد کے مابین تجارت کو فروغ دینے سے متعلق ہیں کیا ایک ایسا شخص جو بھارت کی ایک بڑے ریلوے

نظام اور اُس سے متعلق تجارتی اداروں کا سربراہ رہ چکا ہو۔ ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ میرے اس سوال کا جواب رائے صاحب کے پاس نہیں تھا لئے صاحب کے بیان کے مطابق انہیں میرے مشن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا مگر بظاہر اُس میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا وہ میرے ہاں کئی بار آئے۔ مجھے اور میری فیملی کو اپنے ہاں مدعو کیا نظام کی سالگرہ کی تقریب میں وہ اپنے تمام افسروں کے ساتھ شریک ہوئے۔ دوسرے سُفرا میں سے امریکی سفیر نے ہمارے موقف میں دلچسپی کا اظہار کیا اور بہت سے کاغذات کا مطالبہ کیا جو فوری طور پر مہیا کر دیئے گئے برطانیہ کے سفیر نے شروع ہی سے بے رُخی اختیار کی۔ دہلی میں بھی برطانوی سفارت خانے یہی رویہ روا رکھا۔ مصر۔ سعودی عربیہ۔ عراق۔ انڈونیشا اور برما کے سُفراء سے میرے بڑے گہرے تعلقات تھے اور انہوں نے میرے مشن کو کامیاب بنانے میں بھرپور تعاون کیا۔ عراق کے سفیر سید عبدالقادر گیلانی پاکستان میں میرے آنے کے دو ماہ بعد تشریف لائے اُن سے ہمیشہ میرے برادرانہ تعلقات رہے انڈونیشا کے مسٹر اوسم میرے خاص دوست تھے میر تقرر کے وقت ان کے ملک کی وہی گومگو کی حالت تھی جو حیدر آباد کی تھی ہم دونوں میں کافی تبادلِ خیال ہوتا رہتا تھا۔ اُن سے میرے گہرے تعلقات کو دیکھ کر میرے اکثر احباب یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ اوسم اور مجھ میں "آ عندلیب کریں مل کے آہ و زاریاں" والی بات تھی برما کے سفیر یو۔ پی۔ کن بھی اُن سُفراء میں سے تھے جن سے میرے خصوصی تعلقات تھے۔ حیدرآباد کے المیے کے بعد یو۔ پی۔ کن پاکستان میں غیر ملکی سُفرا کی جماعت کے سربراہ تھے اُس حیثیت میں انہوں نے ہمیشہ مجھے سہارا دیا۔ سفیر جمہوریہ فرانس نے میرے مشن میں خصوصی دلچسپی لی۔ مجھے کئی بار مدعو کیا اور ہمارے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر تبادلِ خیال کیا۔ اُس وقت پانڈی چیری اور ہندوستان میں دوسرے فرانسیسی مقبوضات کے سلسلہ میں فرانس کے تعلقات بھارت سے بہت کشیدہ تھے اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ میرے مشن میں دلچسپی محض "حُبِ علی نہیں بغضِ معاویہ" والی بات ہو، بہرحال یہ امر میرے لئے انتہائی تسکین کا باعث تھا کہ فرانس جیسے بڑے ملک نے ہمارے موقف میں اس طرح دلچسپی لی۔ اس ضمن میں حبیب

بورقیبہ سے ملاقات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو فرانسیسی سفیر کی خصوصی دلچسپی کے بغیر ممکن نہ ہوتی ایک دن سفیر فرانس نے مجھے ایک بجے دوپہر کے وقت خود ٹیلیفون کر کے اُسی وقت خصوصی ظہرانے پر مدعو کیا حبیب بورقیبہ جو ابھی سربراہِ مملکت نہیں تھے اور اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے وہاں مہمانِ خصوصی تھے وہ ابھی دہلی سے آئے تھے جواہر لعل نہرو نے انہیں حیدر آباد کے بارے میں بہت سی غلط باتیں بتائی تھیں۔ سفیر فرانس نے خواہش کی کہ میں معزز مہمان کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھاؤں۔ میں نے تفصیل سے حیدر آباد کے موقف کی وضاحت کی اور حبیب بورقیبہ نے اُن باتوں کو اپنی ڈائری میں درج کر لیا۔

حصّہ دوم

چھٹا باب

حیدر آباد ایجنسی

اہم ترجیحات

لاسلکی مواصلاتی نظام کا قیام

حیدر آباد اور بھارت کے سیاسی تعلقات میں بڑھتے ہوئے کھنچاؤ کے ساتھ ذرائع مواصلات پر بندش اور تحدید میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون - ڈاک - تار کا نظام برہم ہو چکا تھا۔ ڈاک پر بڑا اکثرا سنسر لگ چکا تھا۔ ٹیلی فون کی بھی یہی صورت تھی اس لئے ہمارا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ حیدر آباد اور کراچی کے سفارت خانے کے درمیان رابطہ رکھنے کے لئے ایک لاسلکی نظام کا قیام تھا۔ چنانچہ حکومت پاکستان کے تعاون سے ایک ٹرانسمٹر کراچی میں ایک انتہائی محفوظ جگہ پر نصب کیا گیا اور دوسرا ٹرانسمٹر حیدر آباد میں ایک مناسب مقام پر لگایا گیا۔ اس نظام کو بہت ہی قلیل مدت میں یعنی ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو چالو کر دیا گیا جس مہارت اور عجلت سے یہ سب کام انجام پایا۔ اُس کے لئے وہ تمام لوگ قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے اس کو مکمل کرنے میں حِصّہ لیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اپنی حکومت سے رابطہ رکھنے کے لئے یہ ایک واحد صورت تھی جس کے ذریعہ میرے نام سب ہدایات آتی تھیں بلکہ پاکستان سے باہر بھیجے جانے والے مُراسلات اور پیغامات کے متن بھی وصول ہوتے تھے جنہیں میں ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ آگے بھیجتا تھا اس خصُوصی نظام کے لئے ایک خفیہ کوڈ وضع کیا گیا جس کے لئے فارسی زبان سے واقفیت
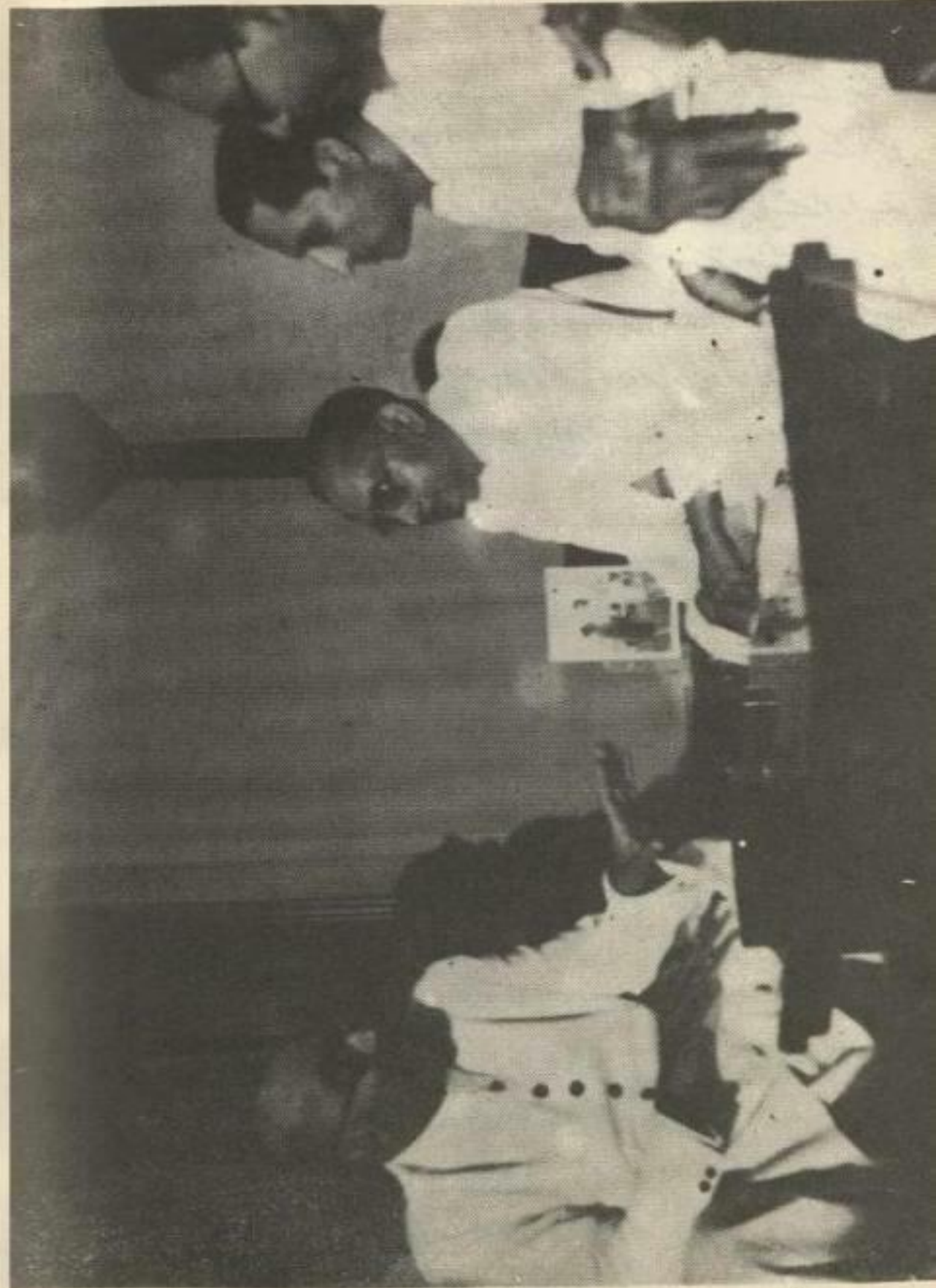
نواب زادہ لیاقت علی خان حیدر آباد ہاؤس میں بجون ۱۹۴۸ء

ضروری تھی۔ حیدرآباد میں تو ایک سے ایک بڑھ کر فارسی داں موجود تھا۔ اس لئے وہاں اس کوڈ کو استعمال کرنے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ مصیبت میرے لئے تھی جسکا مبلغ علم اس زبان کی حد تک ساتویں جماعت کے نصاب تک محدود تھا۔ صدر اعظم کی خاص ہدایت تھی کہ کوڈ سے متعلق کوئی کام ماتحت عملے بشمول میرے سکریٹری کے سپرد نہ کیا جائے۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کیونکہ عام طور پر یہ خیال تھا کہ ٹریڈ کمشنر میری رہائش گاہ یا دفتر کے آس پاس کہیں نصب ہے اس کے چاروں طرف مخبری کا جال بچھا ہوا تھا اور افشائے راز کا شدید خطرہ تھا بعد میں آنے والے واقعات کی روشنی میں اب میں محسوس کرتا ہوں --- کہ صدر اعظم کی یہ ہدایت جس پر عمل کرنا مجھے اُس وقت بڑا کٹھن معلوم ہوتا تھا کتنی بروقت اور مناسب تھی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اپنی فارسی دانی کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے آمد نامہ اور ایک فارسی لُغت سے مسلح ہو کر خود اس مُہم کو سر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت حُسنِ اتفاق سے میرے بیوی بچے کراچی پہنچ چکے تھے اُن کے عملی تعاون سے مجھے اس خفیہ خبر رسانی کے کام میں بہت مدد ملی۔ پیغامات کو راز میں رکھنے کے لئے مختلف شخصیتوں کے ناموں کو بھی کوڈ میں ظاہر کیا جاتا تھا۔ اس میں سے بعض کو یاد کر کے اب ہنسی آتی ہے۔ بہرحال اُس زمانہ میں شخصیتوں کا ان ہی الفاظ سے حوالہ دیا جاتا تھا۔ مثلاً قائد اعظم کو "پیر مُغاں" غلام محمد کو "بنی نجان" صدیقی کاٹن کو "مسٹر روئی" "میجر لشوبر کو "باجے والا" وغیرہ وغیرہ۔ فارسی زبان میں مراسلوں کے مسودے تیار کرنے میں اپنی اہلیہ سے مشورہ کرتا تھا۔ "اور کوڈنگ اور ڈی کوڈنگ" کا کام میری بڑی لڑکی اور لڑکے نے سنبھال لیا۔ یہ کام کافی محنت طلب تھا اور آخری دور میں تو ایک لامتناہی سلسلہ بن گیا تھا رات کے گیارہ بجے سے یہ پیغامات باری باری دو موٹر سائیکل سواروں کے ذریعہ مسلسل آتے رہتے تھے اور چار بجے صبح تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہ دونوں بچے مسلسل تین چار ماہ تک ہر رات کو رتجگا مناکر اس کام کی

لہ ان کا ذکر [illegible] نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ [illegible] حیدرآباد، صفحہ [illegible]

تکمیل کرتے تھے۔ آنے والے پیغامات میں جن باتوں کا فوری طور پر جواب دیا جاسکتا تھا اُن کا جواب اُردو یا انگریزی میں لکھ کر فارسی میں ترجمہ کرتا تھا اور پھر کوڈنگ کا کام شروع ہو جاتا تھا یہ ایک ایسا معمول تھا جس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا جن ہدایات یا سوالات کا جواب فوری طور پر ممکن نہیں تھا اُنکے لئے صبح سویرے متعلقہ افراد سے ان کی رہائش گاہوں پر جاکر اُن کا جواب یا ردِ عمل معلوم کرتا تھا بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ان لوگوں سے صبح سویرے فریر گارڈن میں سیر کے بہانے ملاقات ہوئی اپنی بات کہی اور ان کا جواب حاصل کر لیا اور اپنی حکومت کو مطلع کر دیا ان فارسی مسودوں کو اب جب کبھی میں دیکھتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آتی ہے مگر اناڑی پن سے کام نکل ہی گیا۔ یہ سب کام اتنے راز میں ہُوا کہ میرے ماتحت عملے کو آخر وقت تک ٹھیک طور سے پتہ نہیں چلا کہ ایسے کوئی پیغام آتے ہیں اور آتے ہیں تو کس طرح۔ یہ اچھا ہی ہُوا۔ کیونکہ آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ میرے عملے میں بعض کی وفاداری مشکوک تھی۔ بہرحال میں تن تنہا فارسی مسودہ سازی کے کام سے نبٹتا رہا رات بھر جاگ کر دن میں تھوڑی دیر آرام کر لینے کو میرے عملے والے شاید میری غفلت شعاری اور عیش پرستی سمجھتے ہوں۔

خصوصی فضائی تنظیم کی ضرورت

حیدرآباد ایجنسی کی ذمہ داریوں کی وضاحت کے ضمن میں میں نے ایک فضائی تنظیم کا ذکر کیا ہے۔ بھارت کی طرف سے مکمل مقاطعہ اور معاشی ناکہ بندی سے مملکت حیدرآباد روز بروز ایک محصور قلعہ کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی اشیائے ضروری کی مناسب مقدار کی بروقت فراہمی ایک بڑی اہم ذمہ داری تھی اس کے علاوہ دفاعی ضرورت کو بھی پورا کرنا از حد ضروری تھا۔ ہر قسم کے سامان کی جہاں سے بھی بن پڑے فراہمی اور پھر اُن کا ذخیرہ کرنا کچھ کم دشوار نہیں تھا۔ مگر ان اشیاء کے حصُول سے زیادہ دُشواری فراہم شدہ اشیاء اور دفاعی سامان کو منزل مقصود تک پہنچانا تھا اُس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ایک خصوصی فضائی تنظیم بنائی جائے جس میں بھارت کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرنے کا حوصلہ ہو۔ اور جسکی کارکردگی اتنی معیاری ہو۔ کہ سب سامان کا غذات اور اہم

شخصیتیں بحفاظت آجاسکیں۔

ضروریات کی اشیاء کی خرید کا مسئلہ

جن اشیاء کو پہنچانے کے لیے یہ تنظیم بنائی جارہی تھی پہلے اُنکے حصول کے طریقہ کی وضاحت ضروری ہے معمولی خورد ونوش اور دیگر ضروریات کی چیزوں کا مسئلہ اتنا دشوار نہ تھا۔ کراچی میں اور قریب ترین شہروں میں یہ چیزیں دستیاب ہوجاتی تھیں۔ جس کسی چیز کی ضرورت کی نشاندہی ہوتی تھی میرے نمائندے موقعہ پر تھوک کے بھاؤ خرید لیتے تھے۔ اور ایک مقررہ جگہ پر ذخیرہ کرتے تھے ان چیزوں میں زیادہ تر نمک۔ مصالحے۔ فالتو اور فاضل پُرزے۔ کلورین۔ دوائیں وغیرہ ہوتی تھیں دفاعی ضروریات کی خرید بہت دُشوار تھی۔ اسلحہ کو گوشت ترکاری کی طرح ہر شخص کھلے بازار میں نہیں خرید جا سکتا ان کی خریداری حکومتوں کے مابین معاہدوں کی پابند ہوتی ہے اس لئے ہمیں اس کے لیے حکومت پاکستان کے تعاون کی ضرورت تھی اسلحہ کی خرید سے بہت لوگ وقتاً فوقتاً متعلق رہے۔ مگر یہ بات حیرت سے سُنی جائے گی کہ ہمارے خریداری کے ایک مشن میں اسکندر مرزا اور محمد شعیب بھی شامل تھے میں اُن دونوں کا اور اس اطلاقی نظام کے قیام کے بارے میں مسرت حسین زبیری صاحب کے تعاون اور خوشدارنہ اعتماد کا بدل ممنون ہوں۔

فضائی تنظیم کے قیام میں دشواریاں

جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں مروجہ تنظیم کا خاکہ میرے کراچی آنے سے پہلے صدر اعظم نے اپنے طور پر بنا رکھا تھا۔ مجھے اس خاکے میں رنگ بھرنے اور اُسے ایک فعال اور مؤثر تنظیم بنانا تھا۔ اس کام کے لیے ہم لنکاسٹرین جہاز بھی حاصل کئے جا چکے تھے اس تنظیم کو فعال بنانے میں تین دقتیں تھیں ایک تو سیاسی مصلحتیں اور بین الاقوامی تقاضے جسکی وجہ اس کام کو انتہائی راز میں اور احتیاط کے ساتھ کیا جاتا تھا اور ہر قدم بڑی سوچ اور سمجھ کے بعد اُٹھایا جاتا تھا۔ مگر سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ جس غیر ملکی مہم جو سڈنی کاٹن کو معاہدے کے تحت اس کا کرتا دھرتا بنایا گیا تھا وہ بڑا ہی موقعہ شناس اور کائیاں تھا بد قسمتی سے اُس سے کیا گیا ۔معاہدہ بڑا ڈھیلا ڈھالا تھا جس کی خامیوں سے وہ موقعہ بے موقعہ فائدہ اُٹھانے سے گریز نہیں کرتا تھا اگر کسی وقت اُس کا

مُوڈ ٹھیک نہ ہو۔ تو وہ معاہدہ کو سرے سے بالائے طاق رکھ کر رکاوٹیں پیدا کرتا تھا۔ افشائے راز کی دھمکی دے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتا تھا۔ اُسے قابو میں رکھنے اور کام کو ایک منصوبے کے تحت اور ایک مقررہ پروگرام کے مطابق جاری رکھنے کی پیہم کوشش میں بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔ بعض دفعہ اُس کے مہم جو ساتھی آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے تھے۔ جسکی وجہ عام طور پر روپیہ پیسہ کی تقسیم ہوتی تھی۔ اُن کی صُلح کرانے میں مجھے ثالث کا کردار ادا کرنا پڑتا تھا۔ بعض وقت تو ایسا ہوتا تھا کہ پائلٹ عین وقت پر اپنی ڈیوٹی پر جانے سے انکار کر دیتے تھے اُن کو منانے اور سمجھانے میں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اُن کی باہمی کشیدگی اتنی بڑھ گئی کہ مجھے سڈنی کاٹن کو لالچ دے کر ملک سے باہر بھیج دینا پڑا اور تنظیم کی باگ ڈور میں نے خود سنبھال لی ایک اور موقعہ پر ایک پائلٹ نے شراب پی کر اول فول بکنا شروع کیا۔ رازداری کا تقاضا یہ تھا۔ کہ ایسی صورت حال نہ پیدا ہونے دی جائے۔ جب دُوسری بار اُس نے وہی حرکت کی تو مجھے بدرجۂ مجبُوری اُسے اُسی مدہوشی کی حالت میں حیدرآباد بھیج دینا پڑا۔ وہاں جا کر اُس کا کیا حشر ہوا۔ اس کا ذکر بعد میں آئیگا۔

مہم جو بزرگ کا طریق کار

یہ تو خیر مخصوص واقعات تھے۔ سڈنی کاٹن کے ساتھ مجھے جو روز مرّہ مغز مارنا پڑتا تھا وہ بڑا ہی اعصاب شکن تھا اُس سے معاملہ کرنے کا طریق کار یہ تھا۔ کہ وہ ہر روز آدھی رات کو میری رہائش گاہ پر آتا تھا اور ہم جمع شدہ سامان کی فہرستوں کا جائزہ لے کر یہ طے کرتے تھے کہ کون سے سامان کو ترجیح دی جائے۔ اور اُس رات کو کتنی پروازیں جائیں گی۔ پھر نقشہ دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاتا تھا۔ کہ پروازیں کس راستہ سے اور کس وقت جائیں گی۔ یہ سب طے کرنے کے بعد پھر یہ مسئلہ سامنے آتا تھا کہ حیدرآباد میں وہ کون سے اڈے یا پر اُتریں گی۔ یہ سب صلاح مشورے سے طے ہونے کے بعد بہت کم ایسا ہوا کہ اُس نے اپنے وعدے کو پُورا کیا ہو۔ اور متفقہ فیصلے کی خلاف ورزی نہ کی ہو۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہوٹل پہنچتے ہی ٹیلیفون کرتا تھا کہ مجوزہ چار پروازوں کی جگہ صرف دو جاسکیں گی۔ وجہ پوچھنے پر وہ ٹال مٹول کرتا تھا۔ اس اہم

معاملہ پر ٹیلی فون پر زیادہ بحث یا جھگڑنا احتیاط کے خلاف تھا لیکن وعدے سے پھر جانے کی اُس کی عام طور پر وجہ یہی ہوتی تھی کہ صدر اعظم نے اُس سے یہ اور یہ وعدے کئے تھے وہ جب تک پورے نہیں ہونگے۔ اُس کے لئے تعاون ممکن نہیں۔ طے شدہ پروگرام کو جس کی اطلاع میں حیدرآباد بھیج چکا ہوتا تھا درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھے انتہائی پریشانی ہوتی تھی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔ حیدرآباد سے تقاضے پر تقاضے آتے تھے کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پروازیں جاری رہیں۔ میں اپنی بے بسی پر جھنجھلاتا تھا جس جن کو ہم نے اپنا واسطہ بنایا تھا اُسے بوتل میں بند کرنے کے گُر سے میں ناواقف تھا۔ اُس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے جب اگست ۴۸ء میں صدر اعظم نے خفیہ طور پر ایک رات کے لئے کراچی آنے کے ارادہ کا اظہار کیا۔ تو میں نے سختی سے مخالفت کی۔ میرا کہنا یہ تھا۔ کہ ہماری فضائی تنظیم کی یہ سواری بہت خطرناک ہے۔ جو کسی وقت بھی ناگہانی حالات سے دوچار ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے[1] آپ کو اس خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ پھر اس مُہم جو کو اپنے جلوے مانڈے سے کام تھا۔ اُس کی سوچ اور فکر کے انداز کو دیکھتے ہوئے یہ عین ممکن تھا کہ سفر کے دوران وہ نفسیاتی دباؤ ڈال کر اپنے معاہدہ میں من مانی تبدیلیاں کرالے۔ اُس سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ لالچ میں آ کر انہیں کسی بھارتی ایرپورٹ پر اُتار کر اُنکے حوالے کر دے۔

وہ ایسا کیوں کرتا تھا

اس قسم کی دھمکیاں اور ٹال مٹول کرایہ کے مُہم جوؤں کی عام عادت ہوتی ہے مگر سڈنی کاٹن کو ہم نے خود اُسے اس پوزیشن میں ڈال لیا تھا کہ وہ ہمیں دھمکیاں دیتا رہے۔ پہلی بات افشائے راز کا امکان تھا اگر کوئی قدم اُس کی مرضی کے خلاف اٹھایا گیا تو وہ راز کو راز نہیں رہنے دیگا۔ جس سے بین الاقوامی پیچیدگیوں کا احتمال تھا۔ پھر اُس کے معاہدے کی ایک شق بالکل اُس کے حق میں تھی۔ ہر ٹرپ کا معاوضہ ۵ ہزار روپے فی رونڈ ٹرپ مقرر کیا گیا تھا اُس کی

---

[1] لائق علی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ صفحہ ۲۵۵ کہ انہوں نے کراچی کا سفر میرے بار بار کے اصرار پر اختیار کیا تھا۔ یہ کسی غلط فہمی پر مبنی لکھا گیا ہے۔ میں نے جیسا کہ اوپر لکھا ہے ان کی سختی سے مخالفت کی تھی۔

بُنیادی شرط یہ تھی کہ ایک مقررہ تاریخ تک وہ اپنی سب پروازیں مکمل کرے گا۔ لیکن اس شق میں حکومت نے نہ معلوم کن وجوہ سے اُس کی یہ بات مان لی تھی کہ اگر یہ پروازیں مقررہ تاریخ تک مکمل نہ ہو سکیں تو اُس کے معاوضہ میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ یہ عجیب شرط تھی کیونکہ اس طرح اس کے مفاد میں تھا کہ پروازیں مقررہ مدت میں مکمل نہ ہو سکیں۔ اُس نے اس قانونی سقم سے فائدہ اُٹھایا۔ میں نے حکومت کو جب اس شق کے مضرات اور نتائج کی طرف توجہ دلائی تو مجھے بتایا گیا کہ معاہدے میں تو تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ البتہ مجھے کوشش کرنی چاہیئے کہ کام وقت پر مکمل ہو سکے۔ ایک بین الاقوامی مُہم جو سے اُس کے اپنے فائدے سے ہٹ کر بات کرنا میرے بس میں نہیں تھا علاوہ ازیں اُس کے ساتھ سارا معاہدہ صدر اعظم نے خود کیا تھا اور وہ اب بھی اُنسے براہِ راست مراسلت کرتا تھا اور جواب حاصل کرتا تھا۔ ان حالات میں میرا اُس پر کوئی کنٹرول کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ میں جب بھی کبھی اُس سے گفتگو کرتا تھا وہ ایسی ایسی باتوں کا حوالہ دیتا تھا جن پر اُس کے بیان کے مطابق صدر اعظم نے اُس کی گفتگو ہو چکی تھی۔ جس کا مجھے علم نہیں تھا۔

MERCY PLANE

دھمکیوں اور ٹال مٹول کے علاوہ بعض وقت وہ ایسے اقدامات اور ایسی حرکتیں کرتا تھا جو مجھے انتہائی پریشانی اور اُلجھن میں مُبتلا کر دیتی تھیں۔ مثلاً اُس نے ایک دن اچانک حیدرآباد میں MERCY PLANE لے جانے کا اعلان کیا وجہ یہ بتائی کہ زندگی کی بنیادی ضروریات کی اشیاء اور دوائیوں کی قلت کی وجہ سے حیدرآباد میں بیماری پھیل رہی ہے اور وہ انسانیت کے نام پر ان چیزوں کی فراہمی کا انتظام کرنا چاہتا ہے۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ ہماری سب پروازوں کا یہی مقصد ہے۔ مگر اُس کا مقصد تو سستی شہرت حاصل کرنا تھا۔ حکومت حیدرآباد نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا تھا کہ ہماری اس قسم کی پروازوں کی تنظیم ہے۔ اُس کے اعلان سے یہ بھانڈا سر بازار پھوٹ گیا۔ حکومت پاکستان نے اس کا سختی سے نوٹس لیا میں نے اُسے اس اقدام سے روکنے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کی۔ صدر اعظم نے بھی اُس سے اپیل کی۔ کہ وہ ایسی حرکت نہ کرے مگر وہ نہیں مانا اور جو چاہتا تھا کر گذرا۔ اُس کی ایک اور حرکت میرے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن جاتی تھی۔ جنرل العیدروس

اور اُس کے چیف آف سٹاف کرنل گراہم سے براہ راست اور کھلے بندوں لاسلکی پیغامات کا تبادلہ کرتا تھا۔ مجھے حیرت تھی۔ کہ ہماری حکومت اس کو کیسے برداشت کرتی تھی۔ بیرونی ملک کے ایک مہم جو اور ہمارے کمانڈر میں کیا قدرِ مشترک اور تعلق ہو سکتا تھا۔ میں نے اُسے کئی بار روکنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ بالآخر میں نے حکومت کو اس بے احتیاطی اور ناسمجھی کی حرکت کے خطرات سے آگاہ کیا اور حکومت پاکستان کی برہمی کی اطلاع دی تو پھر کہیں جا کر یہ سلسلہ رکا۔ ان سب دشواریوں اور موانعات کے باوجود میرے لئے یہ بڑی اطمینان بخش بات تھی کہ روزانہ تین پروازیں اوسطاً آخر وقت تک جاری رہیں اور معاشی ضروریات کی حد تک بھارتی ناکہ بندی کی موثر کاٹ ثابت ہوئیں۔

سامان کی وصولی

اس طرف سے جو سامان بھیجا تھا اُس کی بڑی سختی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی اور سامان کی فہرستوں کی چیکنگ مشترکہ طور پر میرا نمائندہ جو ایک حیدر آبادی فوجی افسر تھا اور مقامی نمائندے کرتے تھے۔ حیدر آباد میں جس قسم کی جانچ پڑتال ہوتی تھی اُس کے بارے میں بہت سے شکوک تھے جو بعد میں بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئے۔ میں نے پروازوں کی آغاز ہی سے صدر اعظم کو اس بارے میں صد درجہ کی احتیاط برتنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ میرا خیال یہ تھا کہ اڈوں پر متعین لوگوں کی نہ صرف وطن دوستی اور وفاداری پر سو فیصدی اطمینان ہونا چاہیئے بلکہ اُن کی دیانت اور فرض شناسی بھی شبہ سے بالاتر ہونی چاہیئے۔ اگر ان لوگوں میں سے ایک بھی کالی بھیڑ ثابت ہوا تو ہماری ساری کوششیں رائگان ہو جائیں گی۔ اس ضمن میں میری پریشانی اُس وقت اور بڑھ گئی جب کمانڈر العیدروس نے اپنے تحریری معاہدے جس میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ سامان کی ہر کھیپ کی وصولی کی رسید اگلے دن مل جائے گی کی خلاف ورزی کی۔ پہلی دو کھیپوں میں ہی جب کمی کی اطلاع ملی۔ تو میں نے احتجاج کیا اور کمانڈر العیدروس کو بتایا کہ خصوصی حفاظتی انتظام کے تحت اِدھر سے ...... جو سامان کی ترسیل ہوتی ہے۔ اُس میں کسی کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے جو بھی کمی بتائی گئی ہے۔ میں اُسے تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اپنے خط کی نقل صدر اعظم کو بھی بھیج دی اور اُن سے درخواست کی کہ جو لوگ سامان کی وصولی پر متعین ہیں یا آئندہ اس کام پر لگائے جائیں اُن کے ذاتی ریکارڈ کو دیکھ کر مناسب اور موثر حفاظتی

جانچ پڑتال کی جائے۔ میرے اس احتجاج کے باوجود سامان کی وصولی کی رسید ہی آنا بند ہو گئی۔ اور نہ ہی حکومت کی طرف سے اس صریح بے قاعدگی کا کوئی نوٹس لیا گیا۔ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" کی اس سے بدتر مثال کیا ہو سکتی ہے!

اِدھر سے آنے والا سامان

یہ تو تھی اِدھر سے جانے والے سامان کی کیفیت۔ واپسی کی پروازوں میں آنے والے سامان اور مسافروں کی صورت حال ایک معمہ تھا۔ اچانک پتہ چلتا تھا کہ فلاں صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ اور کافی سامان اپنے ساتھ لائے ہیں اُن کی آمد کس مقصد سے ہے اور لائے جانے والے سامان کی کیا نوعیت ہے اور وہ کس کی ملکیت ہے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا اور میں نے بار بار توجہ دلائی تھی کہ آنے والے مسافروں کی مجھے پیشگی اطلاع ملنی چاہیئے اور اُن کے سفر کا مقصد واضح ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہر کس و ناکس کا اس طرح ایک انتہائی ذریعہ سفر سے چلے آنا میزبان ملک کی سیکیورٹی کے تقاضے اور ہمارے اپنے مفاد کے خلاف تھا۔ علاوہ ازیں کراچی پہنچنے پر اُن میں سے بیشتر لوگ مجھ سے رابطہ پیدا کرنے سے گریز کرتے تھے بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں سے بیشتر آنے والوں کا مقصد سیاسی نہیں بلکہ ذاتی حفاظت کی خاطر حیدر آباد سے بھاگ کھڑا ہونا تھا۔ رہا سامان کا معاملہ۔ اگر وہ سرکاری سامان تھا تو مجھے اُس کی پیشگی اطلاع ملنی چاہیئے تھی تاکہ اس کی حفاظت کا مناسب انتظام کیا جا سکے۔ اگر ایسے سامان کی سرے سے کوئی اطلاع ہی نہ بھیجی جائے تو اسے خورد برد ہونے سے کون بچا سکتا ہے۔ ان کاروائیوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خفیہ تنظیم والے ہوائی جہاز نہیں بلکہ معمولی ہوائی جہاز ہیں جن پر ہر کس و ناکس بلا ٹکٹ اور بلا روک ٹوک سفر کر سکتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے (میں اُنکے نام لیکر اُنہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا) ان جہازوں کو تفریحی اغراض کے لئے بھی استعمال کیا ایسی صورتیں یہ پروازیں راز کیسے رہ سکتی تھیں۔ کئی لوگوں نے حیدر آباد کے سقوط سے بہت پہلے سے اپنا ذاتی سامان اس ذریعہ سے منتقل کرنا شروع کر دیا۔ دشواری یہ بھی کہ مجھے یا میرے سٹاف میں سے کسی کو جہاز کے قریب پھٹکنے کی ممانعت

تھی ورنہ شاید تھوڑا بہت انتظام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن احتیاط کے تقاضے کے تحت یہ ممکن نہ تھا۔ اس طرح سے دو طرفہ ٹریفک کی دیکھ بھال اور چیکنگ حیدر آباد ہی میں ہو ہو سکتی تھی جو کسی وقت بھی نہیں ہوئی۔

تشہیری محاذ

ان خصوصی فرائض کے علاوہ سفارتی معمولات بھی جاری تھے۔ وزرائے کرام۔ مشاہیر۔ سیاست دانوں اور مذہبی سربراہوں سے مسلسل رابطہ قائم رہا۔ میرا شام کا وقت عموماً اس کے لئے مختص رہتا تھا۔ موثر تشہیر بھی وقت کا سب سے بڑا تقاضا تھا۔ غیر ممالک کا تو کیا ذکر خود پاکستان میں ہمارے موقف سے بلکہ ہماری مملکت کے حدود اربعہ اور وسائل سے واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی حتیٰ کہ اُس وقت کے بعض وُزراء ہمارے موقف اور اُس کے مضمرات سے ناواقف تھے اس لئے تشہیر کا کام بڑے پیمانے پر فوری طور پر اُستوار کیا گیا۔ حیدر آباد ریڈیو سے مانیٹر کر کے اور دیگر سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے حاصل شدہ اطلاعات مقامی اور عالمی پریس کو باقاعدگی کے ساتھ دی جانے لگیں مقامی پریس میں شائع شدہ خبروں کا جائزہ لیکر اُن پر حسب ضرورت مناسب کاروائی کیجاتی تھی۔ ایسے مواد کی جو میری نظر میں معاندانہ یا غلط بیانی پر مبنی ہوتا تھا فوری طور پر تردید کر کے صحیح صورت حال کی وضاحت کی جاتی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کی گمراہ کن خبروں اور بھارتی حکومت کے اعلانوں میں بیان کی ہوئی بے سروپا داستانوں کی تردید پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مقامی اور غیر ملکی صحافیوں سے مسلسل رابطہ قائم تھا اور بڑے دوستانہ ماحول میں تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ صحافیوں اور ہمارے سفارت خانے میں اعتماد اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ بعض وقت وہ خود ایسی خبریں میرے پاس لے آتے تھے جو اُن کی نظر میں ہمارے موقف کے خلاف ہوتی تھیں اور ہمارا نقطۂ نظر معلوم کر کے اُن پر تبصرہ کرتے تھے۔ صحافی برادری کے میرے گہرے اور پُر اعتماد تعلقات کے بارے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ پریس میں ہماری مسلسل اور موثر تشہیر کو دیکھ کر اس وقت کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین صاحب نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "مشتاق صاحب۔ پریس کو قابو کرنے کے لئے آپنے کتنا خرچ کیا؟" میں نے عرض کیا، "جناب قابو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ میں نے اُن سے بھائی چارے کی بنیاد پر ایسا رابطہ قائم کیا ہے کہ کسی بڑے خرچ کی نوبت ہی نہ آئے۔ میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مفروضہ ہے کہ ہر آدمی کی قیمت ہوتی ہے۔ ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا۔ اس گئے گزرے دور میں بھی خلوص۔ نیک نیتی اور دوستانہ تعلقات کی بنا پر بھی اپنی بات دُوسروں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ جس جوش اور جذبہ سے پاکستانی صحافیوں اُس وقت مجھ سے جو تعاون کیا وہ بے مثال تھا جس کے لئے میں ہمیشہ اُن کا ممنون رہوں گا۔

جلسے۔ جلوس۔ مظاہرے

اخباری اور ریڈیائی تشہیر کے علاوہ بعض وقت جلسوں اور مُظاہروں کی بھی ضرورت پڑتی تھی اُس کے لئے موزوں ترین میدان شمال مغربی سرحدی صُوبہ اور بلوچستان کے سرحدی علاقے تھے جہاں جلسے جلوس اور مظاہرے اخباروں سے زیادہ موثر ثابت ہو سکتے تھے چنانچہ وہاں کے قبائلی علاقوں سے رابطہ پیدا کیا گیا اور اُن کے مشورے سے جلسے جلوسوں کا ایک باقاعدہ پروگرام ترتیب دے کر اُس پر عملدر آمد کا مقامی طور پر انتظام کیا گیا ان مظاہروں کی مصدقہ رُوداد اور تصاویر ہمیں فوراً پہنچ جاتی تھیں اور اگلے دن کے اخباروں میں شائع ہو جاتی تھیں۔ بظاہر یہ کام آسان تھا مگر مجھے اس میں بھی بہت سی دشواریوں اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ضمن میں بعض بڑے لوگوں نے ہمدردی کے دعوے کے ساتھ مجھے چرکے بھی دیئے۔ ایسے کاموں میں خوشگوار ساتھ ناخوشگوار باتوں کو بھی سہنا پڑتا ہے۔ اس طرح پاکستان کی حد تک ہمارا تشہیری محاذ توقع سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ حضور نظام کی سالگرہ کی تقریب سے بھی بڑی تقویت ملی۔ چھ سات سو مہمانوں جن میں تمام سفرائے کرام (سوائے سفرائے برطانیہ اور رُوس کے) وزراء اعلیٰ عہدہ دار علمائے کرام۔ تجار۔ صنعت کار۔ صحافی سب اس تقریب میں شریک ہوئے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد کراچی میں یہ سب سے بڑی تقریب تھی۔ عوام و خواص سب نے اس میں گہری دلچسپی لی۔ اخباروں نے خصوصی نمبر نکالے۔ مختلف طبقوں سے میرا تعارف ہو گیا جسکی وجہ سے ہمارے سیاسی موقف اور نقطہ نظر کی اچھی طرح تشہیر ہو گئی۔

❖

بیرونی ممالک میں تشہیری سرگرمی

جب کہ پاکستان میں ہماری تشہیر بے حد موثر تھی مجھے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ بیرونی ممالک میں ہماری تشہیری سرگرمیاں ہمارا بڑا کمزور پہلو تھا۔ برطانیہ میں وہ ایک حد تک کامیاب رہی مگر جس ملک کے ہاتھوں ہماری بُری گت بنی اُس میں اگر ہمارے تشہیری محاذ کی کامیابیوں کا دعوٰے بھی کیا جائے تو اُس سے کیا حاصل۔ نتیجہ تو بالآخر صفر کا صفر ہی رہا۔ مشرق وسطےٰ میں تشہیر کی بہت ضرورت تھی وہاں اس وقت کے حالات میں ہماری بروقت حمایت اور تائید مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ اس خیال کے تحت میں نے تجویز پیش کی کہ فوری طور پر فلسطینی فنڈ میں ایک بڑی رقم کے چندے کا اعلان کیا جائے چنانچہ منظوری حاصل کرنے کے بعد میں نے مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کو فوری طور پر ۱۰ ہزار پونڈ کے چندے کی اطلاع بھی کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ عرب ممالک میں اس اعلان کا نفسیاتی اثر ہمارے لئے مفید ہوگا۔ مگر اس کو کیا کیجئے۔ کہ بروقت ترسیل رقم نہ ہونے کی وجہ سے اُس کی ادائیگی نہ ہو سکی۔ اور بار بار یاد دہانی کرنے کے باوجود اس میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ مشرق وسطیٰ میں ہمارے وفود وقتاً فوقتاً بھیجے جاتے رہے لیکن اُن کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان وفود نے مقامی نمائندوں سے بے رُخی برتی۔ مثلاً کراچی میں ان وفود نے مجھ سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ وہ چپکے سے آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ حالانکہ اُن کے لئے زرمبادلہ کے حصول کا انتظام میری ذمہ داری تھی جب وہ جاتے تھے تو یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کتنے دنوں کا پروگرام ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس میں کون کون بزرگ شامل ہیں اگر حکومت کی طرف سے مجھے پہلے اطلاع مل جاتی تو اُن ممالک کے سُفرا کے واسطے سے اور ذرائع ابلاغ سے اُن کے لئے میدان ہموار کیا جا سکتا تھا مگر انہوں نے ایسا موقعہ ہی نہیں دیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ متوازی ادارے ہیں جو مقامی نمائندے سے رابطے کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں ان وفود میں کوئی معروف شخصیت نہیں ہوتی تھی۔ جو اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو کام میں لا سکے۔ ان وفود کے سامنے کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل بھی نہیں تھا۔ صرف گنتی کی چند شخصیتوں سے مل کر

ہفتہ عشرہ میں لوٹ آنا کافی نہیں تھا۔ اس مختصر مُہم کا اگر کچھ اثر ہوتا بھی تھا تو وہ محض وقتی اور عارضی نوعیت کا ہوتا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اُس علاقے میں ہمارا تشہیری محاذ وہی سرگرمی دکھائے۔ - - - - - - جو بھارتی پروپاگنڈا مشین دکھا رہی تھی چند جرائد میں مضامین کا شائع ہو جانا اور چند مشاہیر کے تبصرے اس مسئلہ کا حل نہیں تھا تشہیری محاذ کا ایک ایسا ڈھانچہ بنانے کی ضرورت تھی جس میں ہماری طرف سے ایک معرُوف اور اُس علاقے میں جانی پہچانی شخصیت وہاں کے ذی اثر اصحاب سے مسلسل رابطہ رکھے۔ میں نے اس اہم ذمہ داری کے لئے عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کا نام تجویز کیا تھا۔ مگر نامعلوم وجوہ سے اس تجویز کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ شاہ فاروق کے سابق پریس اٹاچی کریم ثابت بے کا نام بھی تجویز ہُوا۔ مگر وہ بھی منظور نہیں ہُوا۔ منصُوبہ بندی کے اس فقدان کی وجہ سے اس علاقے میں ہمارا تشہیری محاذ آخر وقت بہت کمزور رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ نازک وقت پر مصر و شام جیسے اسلامی ممالک نے بھی اقوام متحدہ میں ہمارے مقدمے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

حیدرآباد ایجنسی کے بارے میں حکومت کیطرف سے عدم وضاحت

جن حالات میں مجھے حیدرآبادی ایجنسی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اور جس عجلت سے مجھے چارج سنبھالنے کے لئے بھیجا گیا تھا اس سے یہ بات واضح تھی کہ میری ذمہ داریوں کے تعیّن کے بارے میں کوئی غور و فکر نہیں کیا گیا تھا جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ کہ روانگی سے پہلے جب میں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق کھوج لگانے کی کوشش کی تو یہ کہہ کر دلاسا دیا گیا۔ کہ مجھے کراچی میں جا کر سب پتہ چل جائے گا۔ جس سفیر کو اس حد تک دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اُس کی بے بسی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کراچی پہنچتے ہی غلام محمد سے معاملہ کے ٹھیک ہونے کے بارے میں جواب حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ جب میں نے "معاملہ" کی وضاحت چاہی تو پھر وہی بات دہرائی گئی کہ کراچی میں سب پتہ چل جائیگا غلام محمد نے میرے سوال کا اثبات میں جواب دیا مگر "معاملہ" کی نوعیت کی اُنہوں نے بھی وضاحت نہیں کی۔ ذمہ داری

سنبھالتے رہی یہ صُورت حال میرے لئے خُوش آئندہ نہیں تھی کیونکہ مطلب بظاہر یہی تھا۔ کہ حکومت کو مجھ پر وہ اعتماد نہیں جو اُسے اپنے نمائندے پر ہونا چاہئے اُس کے بعد مسلسل ۸۔۱۰ روز تک کئی افراد حیدرآباد سے آتے جاتے رہے۔ اُنھیں نمایاں شخصیت یوسف یار جنگ کی تھی وہ کسی خُفیہ مشن پر آئے۔ میرے ساتھ قیام کیا مگر اپنی آمد کے مقصد کو راز میں رکھا وہ قائداعظم سے بھی ملے۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کیا یہ سب کام نامزد نمائندے کے ذریعہ نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ رابطے کسی وجہ سے ناگزیر تھے تو تب بھی مقامی نمائندے کو اعتماد میں لیا جانا چاہیئے تھا۔ میں یہ جانتا تھا۔ کہ یوسف یار جنگ حیدرآباد سول سروس کے ایک سنیئر رکن تھے مگر وہ سب رابطے کس حیثیت سے کر رہے تھے اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ یہ تو کئی برس کے بعد میر لائق علی کی کتاب سے پتہ چلا کہ وہ "ایڈیشنل ایجنٹ جنرل تھے"۔ بہرحال یہ خُفیہ راز کی ملاقاتیں اور پاکستان کے ارباب اقتدار سے رابطے میرے لئے بڑے حوصلہ شکن تھے[له] چنانچہ میں نے صدرِاعظم سے شدید احتجاج کیا اور درخواست کی۔ کہ اگر میری وفاداری یا حُبّ الوطنی پر سو فیصدی یقین نہیں یا میری سمجھ بُوجھ کے بارے میں شکوک ہیں تو مناسب یہی ہوگا کہ مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش کر کے واپس بلا لیا جائے کیونکہ ان حالات میں یکسُوئی اور خودداری کے احساس کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ صدرِاعظم نے میری گذارشات سُن کر وعدہ کیا۔ کہ آئندہ ایسا نہیں کیا جائیگا۔ مگر مجھے اُن راز کی ملاقاتوں کے مقصد اور نوعیت سے مطلع نہیں کیا۔ اس طرح خدا خدا کر کے مئی ۱۹۴۸ء کے آخر میں ان اصحاب کی آمدورفت بند ہوگئی۔ لیکن مشرق وسطیٰ کے وفود کا تانتا بندھا رہا۔ جن کے اراکین مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کراچی میں اپنے قیام کے دوران مجھ سے رابطہ پیدا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات اپنی ذمہ داریوں سے تجاوز کر کے میرے کام میں دخل دیتے تھے۔

❊

Tragedy of Hyderabad

له لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۱۵۵۔

حکومت پاکستان سے رابطہ

اسناد تقرر کے پیش کرنے سے پہلے میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی سے مل چکا تھا اور ہفتہ میں ایک بار اُن سے بلاناغہ ملاقات ہو جاتی تھی۔ بہت سی باتیں میں نواب صدیق علی اُنکے پولیٹیکل سیکرٹری کے ذریعہ اُن تک پہنچا دیتا تھا۔ نوابزادہ صاحب ... اوّل دن ہی سے مجھ سے بہت اپنائیت کا برتاؤ کرتے تھے وہ خاندانی شرافت کا مجسمہ اور بڑی مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے میری ہر درخواست پر وہ بہت ہمدردانہ غور کرتے تھے اور اگر کسی وجہ سے میری کسی بات کی پذیرائی نہیں ہوتی تھی تو انہوں نے اپنے انکار سے مجھے کبھی یہ تاثر نہیں کہ اُنہیں ہمارے موقف سے دلچسپی نہیں ہے یا ہماری ضروریات کی شدت اور اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ اُنہوں نے مجھے پہلے ہی دن بتا دیا تھا۔ کہ میرے کام میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اُنہوں نے ملک غلام محمد وزیر خزانہ کو پاکستان اور میرے درمیان بطور افسر رابطہ نامزد کر دیا ہے۔ چنانچہ انہی سے میں سیاسی اور غیر سیاسی معاملات میں مشورہ کرتا تھا اس میں شک نہیں کہ میرے کراچی آنے کے بعد سے حیدرآباد کے لیتے تک انہوں نے بہت سے مسائل کو سلجھانے میں بہت مدد کی۔ نوابزادہ نے تمام متعلقہ عہدہ داران چودھری محمد علی۔ کرنل اسکندر مرزا۔ محمد شعیب۔ مشرت حسین زبیری۔ ابوطالب نقوی اور جی احمد اور دیگر حضرات کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ میرے ہر کام میں مکمل تعاون کریں۔ اور اگر کوئی معاملہ اُن کے اختیارات سے باہر ہو تو وہ متعلقہ وزارت سے یا بااختیار افسر اسے رابطہ قائم کر کے اُسے سلجھانے کی کوشش کریں۔

ملک غلام محمد کا بدلتا رویہ

اگرچہ ابتدا میں ملک غلام محمد نے میرے معاملات کو طے کرانے میں کافی امداد کی۔ لیکن اوّل دن ہی سے ملک صاحب کے طریق کار اور انداز فکر سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ محض وزیر رابطہ ہی نہیں بلکہ انہیں حیدرآباد کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں اپنی رائے کو منوانے پر اصرار ہے۔ بعض وقت تو اُنکے رویّہ سے میں سوچنے لگتا تھا۔ کہ میں آزاد حیدرآباد کا نمائندہ ہوں یا حکومت پاکستان کا کوئی ماتحت تنخواہ دار عہدہ دار۔ اُنکی خواہش تھی کہ میں اپنی دن بھر کی مصروفیات کی انہیں ڈائری دوں اور "کیوں" "کیسے" کی نوعیت کے سوالات کا جواب دوں اس وجہ

سے جون کے مہینہ سے ہی ہمارے روابط میں کشیدگی پیدا ہو گئی مجھے اس کی شدت کا احساس نظام کی سالگرہ کے موقع پر ہوا۔ انہوں نے تقریب کے بعد . . . . مجھے بلوا بھیجا۔ اور بڑی ترش۔ روئی اور ترش گفتاری سے شکایت کی کہ حکومت حیدرآباد نے بعض معاملات بالخصوص نقل وحمل کی تنظیم کے بارے میں اُن سے بروقت مشورہ نہیں کیا میں نے عرض کیا " میرے کراچی آنے سے پیشتر جتنے بھی فیصلے ہوئے تھے وہ بلاشبہ آپ کے مشورہ سے کئے ہوں گے۔ اُن کے بارے میں مجھے پوری واقفیت نہیں آپ نے اب جو کچھ فرمایا ہے وہ فوری طور پر من وعن میں صدر اعظم کو پہنچا دوں گا" اس سے پہلے وہ اسی نوعیت کی شکایت کر چکے تھے اور میں نے اُن کا نقطۂ نظر صدر اعظم تک پہنچا دیا تھا۔ مگر وہاں سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ اس تلخ گفتگو کے بعد میں نے سوچا کہ شاید یہ بہتر ہو۔ کہ میں خود حیدرآباد جا کر وضاحت حاصل کروں۔ کیونکہ ملک صاحب یہ بدلا ہوا موڈ اور تنگ مزاجی میرے کاموں میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر سکتی تھی۔

قائداعظم کیطرف سے طلبی

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ قائداعظم نے مجھے طلب فرمایا اور حیدرآباد کے حالات کے بارے میں پوچھتے ہوئے سوالات کئے میں نے محسوس کیا کہ وہ دن بدن بگڑتی ہوئی صورت حال سے فکرمند ہیں۔ میں نے یقین دلایا۔ کہ ہر قسم کی مشکلات اور آزمائش کے باوجود حیدرآبادی عوام کے حوصلے بلند ہیں اور اُن میں اپنی آزادی کو قائم رکھنے کا جذبہ اور اُمنگ ہے۔ میں نے اپنی طرف سے تو کہہ دیا مگر قائداعظم کا ردعمل ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے واضح تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری یقین دہانی سے زیادہ مطمئن نہیں ہوئے دوران گفتگو انہوں نے ایک مسئلے کی طرف اشارہ کیا جو خطرے کی حالت میں بہت نزاکت اور اہمیت کا حامل ہو سکتا تھا یہ مسئلہ تھا نظام کی دولت کا وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس کے متعلق نظام نے کیا فیصلہ کیا یہ بالکل ظاہر تھا کہ اگر انہیں اس بارے میں فیصلہ کا انتظار ہے۔ تو یہ مسئلہ یقیناً میر لائق علی اور اُن کے مابین کسی مرحلے پر گفتگو کا موضوع بنا ہوگا میرا قیاس تھا کہ فضائی تنظیم کے قیام کے موقعہ پر یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہوگا۔ قائداعظم کے ایک اور سوال سے میرے اس قیاس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ انہوں نے فرمایا " یہ

بحر وٹریفک کب تک چلتا رہیگا" مجھے اس بارے میں کسی گفتگو کا علم نہیں تھا اور نہ مجھے اس مسئلہ پر حکومت پاکستان سے کسی گفتگو سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اپنی عدم واقفیت کو چھپاتے ہوئے میں نے عرض کیا " حضور نظام انشاءاللہ اس مسئلہ پر جلد کوئی فیصلہ کریں گے" اس کے ساتھ ہی ملک غلام محمد کی ترش گفتگو سے میرے ذہن میں جو منصوبہ جنم لے رہا تھا وہ یکایک اُبھر آیا۔ میں نے عرض کیا " اس معاملہ کو آگے بڑھانے کے لئے میں خود حیدرآباد جانے کے لئے سوچ رہا ہوں" انہوں نے ایک دم پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پوچھا " تم نظام کو ذاتی طور پر کب سے جانتے ہو" میرا جواب سُن کر فرمایا " تم سے زیادہ عمر رسیدہ اور زیادہ تجربہ کار لوگ انہیں قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ بہرحال میں تمہیں حیدرآباد جانے سے نہیں روکتا تم اپنی کر دیکھو۔ مگر ذرا احتیاط رہے کیونکہ میری اطلاع یہ ہے کہ بھارتی حکومت پہلے سے ہی تمہاری فکر میں ہے بالفرض اگر تم وہاں جانے میں کامیاب ہو گئے۔ تو واپس آکر مجھے بتاؤ۔ کہ تمہارے مشن کا کیا نتیجہ نکلا"

وزیر خارجہ سے ملاقات

گھر پہنچتے ہی میں نے وزیر خارجہ معین نواز جنگ سے رابطہ قائم کیا اُن سے پتہ چلا کہ صدر اعظم بھارتی حکومت سے مذاکرات کے لئے دہلی گئے ہوئے ہیں میں نے جب اُن مسائل کا ذکر کیا جن کے بارے میں مجھے حکومت سے ہدایات حاصل کرنی تھیں تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے خود دہلی جاکر اُنکے بارے میں صدر اعظم سے ہدایات حاصل کرنی ہونگی - یہ بات میرے لئے زیادہ اطمینان بخش نہیں تھی کیونکہ اس سے لامحالہ میرے سفر اور قیام کی مدت میں اضافہ ہو جاتا اور اسی مناسبت سے خدشات بڑھ جاتے - میں سمجھتا تھا - کہ وزیر خارجہ جیسی مقتدر حیثیت کا حامل اپنے سفیر کو ہدایات دینے کے موقف میں ہوگا - مگر ایسا نہیں ہوا - بہرحال مجھے اپنا مشن مکمل کرنا ضروری تھا - خالی ہاتھ لوٹنے کے لئے تو میں نے یہ خطرہ مول نہیں لیا تھا - اس لئے ناچار دہلی کا پروگرام بنانا پڑا - حالانکہ وہاں جانے میں شدید خطرہ تھا - مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی - کہ اگر دہلی میں سیاسی مذاکرات ہو رہے ہیں تو وزیر خارجہ وہاں کیوں نہیں ہیں اور یہ کیسے مذاکرات ہیں جن میں خارجہ اُمور سے متعلق وزیر صاحب کی شمولیت ضروری نہیں سمجھی گئی -

شاہی محل سے رابطہ

وزیر خارجہ کی رہائش گاہ سے واپسی پر میں نے کنگ کوٹھی ٹیلیفون کیا اور اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ناگہانی حالات کے تقاضے کے تحت اگلے ہی دن میری واپسی ضروری ہے فوری باریابی کی درخواست کی - جس کی چند منٹ ہی میں پذیرائی ہوگئی - $6\frac{1}{2}$ بجے شام میں شاہی محل کے بڑے دروازے پر پہنچا - افسر رابطہ نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا - " آپ اپنا عہدہ سنبھال کر پہلی بار پاکستان سے آئے ہیں واپسی کی ایسی بھی کیا جلدی ہے ؟ " میں نے جواب دیا کہ صورت حال کا یہی تقاضا ہے ورنہ گھر آکر کون ٹھہرنا پسند نہیں کرتا - اُس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اُسکے پیچھے پیچھے چلوں - میں یہ چھوٹی چھوٹی تفاصیل اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ سب ہمارے شاندار ماضی کی روایات اور آداب کی نشاندہی کرتی ہیں - وہ وقت جلد آنے والا ہے - جب ہماری تہذیب . روایات اور آداب معاشرت کی یہ نشانیاں تاریخ کے صفحات میں گم ہو کر رہ جائینگی اور اُن کا ذکر ہمارا نہیں بلکہ کسی دُوسری

گم شدہ قوم کا تذکرہ سمجھا جائیگا - والد محترم کی معیت میں حضور نظام کی خدمت میں یوں تو کئی بار باریابی ہو چکی تھی اور سالگرہ ہمایونی کے موقعہ پر ہر سال پابندی سے حاضری ہوتی تھی لیکن ان موقعوں پر میری ذاتی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی - اس مرتبہ میری باریابی ایک اہم قومی کام اور ایک نازک مشن کے ضمن میں تھی اس لئے میں کسی قدر اضطراری کیفیت سے دوچار تھا - یہ اُسی کیفیت کا کرشمہ تھا - یا یہ محض بدحواسی تھی کہ سونے کی جو اشرفی میں درباری دستور کے مطابق نذر پیش کرنے کے لئے لایا تھا اور ایک سفید رُومال میں لپیٹ کر ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا صدر دروازے میں داخل ہوتے وقت نیچے گر پڑی - یہ محض حسن اتفاق تھا اور ایک شاہی چوبدار نے اس حادثہ کو بروقت دیکھ لیا اور اشرفی کو اُٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا - اگر چوبدار صاحب اپنے روائتی رویّہ پر عمل کرتے اور مجھ پر یہ ناقابل یقین کرم نہ فرماتے تو اس کی چاندی ہی نہیں سونا ہو جاتا - مگر میرا جو حشر ہوتا اُس کے تصور سے آج بھی جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے -

بارگاہ ہمایونی میں پیشی

داخلہ کے دروازے سے کوئی سو دو گز کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے برآمدے میں آصف سابع تاجدار دکن رہن سہن اور لباس کی مشہور عالم سادگی کے ساتھ بید کی ایک خستہ حال کرسی پر تشریف فرما تھے - سامنے ایک تپائی پر دو اُردو اخبار جن میں ایک رہبر دکن تھا اور چند کاغذات رکھے ہوئے تھے اُس سے پہلے بچپن میں میں نے اُنکے سالگرہ کے دربار کے چکا چوند کرنے والے مناظر اور شاہی جاہ وجلال دیکھا تھا آج جو منظر میرے سامنے تھا وہ سادگی اور فقیرانہ شان کا ایک اچھوتا نمونہ تھا میں درباری آداب کے مطابق نیچی نظریں کئے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھا - اور اعلیٰحضرت کی نشست سے چند گز کے فاصلے سے فرشی سلام کر کے آداب بجا لایا - انہوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے چوبدار کو ایک کرسی لانے کا حکم دیا - میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ کرسی میرے لئے منگوائی جا رہی ہے - لیکن جب اُنہوں نے اُس کرسی کو میرے پاس رکھنے کیلئے فرمایا تو میرے کانوں کیلئے یہ حکم بہت حیران کن تھا کیونکہ درباری آداب کے مطابق باریابی کے وقت باادب کھڑا رہنا پڑتا تھا میں نے سر علی امام مؤتمد الملک سے لیکر نواب چھتاری سعید الملک اور مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنہ کو حاضری کے وقت کھڑے دیکھا تھا -

اور اپنے والد محترم کو ساری مُلازمت کے دوران انہی آداب کی پابندی کرتے دیکھا تھا اس لئے میں اپنی حاضری کے وقت اس پابندی کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا اس لئے میرے لئے یہ استشنائی صورت ایک غیر معمولی اور ناقابل یقین رعایت تھی کرسی کے آنے پر اعلیٰحضرت نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کے لئے فرمایا۔ میرے تامّل کو دیکھ کر فرمایا" بیٹھو۔ میں جو کہتا ہوں بیٹھو" ناچار حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ چند لمحات میری طرف اپنی عُقابی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ گفتگو کا آغاز یہ سوال پوچھ کر کیا" میں نے پہلے بھی کہیں تمہیں دیکھا ہے" میں نے عرض کیا" میں اپنے والد محترم فخر یار جنگ کی ہمرکابی میں کئی بار باریابی کی سعادت حاصل کر چکا ہوں علاوہ ازیں مجھے کئی بار سرکار اور ولیعہد والاشان کی سپشیل ٹرینوں کی مشائیعت کی بھی سعادت حاصل ہو چکی ہے" والد محترم کا نام ہی سنتے ہی فرمایا" ہاں ٹھیک ہے۔ تم فخر یار جنگ کے بیٹے ہو۔ تمہارے تقرّر کے وقت مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ تمہارے والد میرے جان نثاروں میں مُنفرد حیثیت رکھتے تھے افسوس ہے کہ صحت نے اُن کا ساتھ نہیں دیا اور انہیں قبل از وقت ملک کے اس نازک مرحلے پر اپنے فرائض سے سُبکدوش ہونے پر مجبور کر دیا جب مجھے اُنکے مشورے کی ضرورت تھی اب وہ کہاں ہیں" میں نے عرض کیا" سرکار ہی کے قدموں سے وہ دُور کہاں جا سکتے ہیں وہ حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں" اس میں انہوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا" مگر تم تو پاکستان چلے گئے ہو۔ کیا وہ بیماری کی حالت میں یہاں اکیلے ہیں" میں نے عرض کیا" میرا چھوٹا بھائی اشفاق سرکار کی خدمتیں حاضر ہے۔ پھر میرے دوسرے بھائی بھی دامن دولت سے وابستہ ہیں" اس پر انہوں نے فرمایا" ہاں ٹھیک ہے۔ میں اشفاق کو خوب جانتا ہوں۔ اُس نے بڑی جان نثارانہ خدمات انجام دی ہیں۔ تم کو میں نے زیادہ نہیں دیکھا" میں نے عرض کیا۔ " سرکار نے جس اعتماد سے اس ناچیز کو نوازا ہے وہ اُس کے خاندان اور اس کے لئے باعث صد افتخار ہے میں اپنے آپ کی سرکار کے اعتماد کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کروں گا" اس پر انہوں نے خفیف سا سر ہلا دیا۔ گفتگو کا یہ آغاز بڑا خوشگوار اور حوصلہ افزا تھا لیکن اُنکے اگلے سوال نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ انہوں نے پوچھا" پاکستان میں اپنے فرائض سنبھالنے سے پہلے تم میرے پاس کیوں نہیں آئے" یہ واقعی ایک فروگزاشت تھی۔ جسکا میرے ذہن

پر بار تھا اس کی ذمہ داری تو مجھ پر نہیں تھی۔ مگر بہر حال فروگذاشت ضرور تھی۔ میں نے عرض کیا " صدر اعظم نے مجھے بتایا تھا کہ سرکار کا منشا یہ ہے۔ کہ میں فوراً پاکستان کے لئے روانہ ہو جاؤں اور وہاں اپنے عُہدہ کا چارج لینے کے بعد سرکار کی خدمتیں حاضری دُوں۔ وقت کی تنگی کیوجہ سے میں نے اپنے عُہدہ کا حلف روانگی سے قبل آدھی رات کو اُٹھایا تھا۔ جسکی اطلاع ٹیلیفون سے سرکار میں کرائی گئی تھی" یہ جواب سُن کر وہ چند لمحات خاموش رہے اور میں نیچی نظریں کیئے ہوئے سامنے مؤدب بیٹھا تھا اسکے بعد انہوں نے اپنی سالگرہ کے بارے میں کئی سوال کر ڈالے میں نے ساری تفصیلات بتلاتے ہوئے عرض کیا کہ اس واسطے سے ہمارے موقف کا سفارتی حلقوں اور پاکستان کے خواص و عوام میں بڑے مؤثر انداز میں تعارف ہو گیا اور پاکستانی جرائد اور ذرائع ابلاغ نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں اس کا نمایاں طور پر ذکر کیا۔ اس پر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سر ہلایا اور فرمایا" ہاں۔ چند پرچے میرے ملاحظے سے بھی گذر چکے ہیں اچھا یہ بتاؤ۔ کہ قائد اعظم اس تقریب میں کیوں شریک نہیں ہوئے" میں نے عرض کیا" قائد اعظم کی عدم شمولیت کی وجہ اُنکی اچانک بیماری تھی اُنہوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر طبیعت ذرا بھی سنبھل گئی۔ تو وہ شریک ہوں گے۔ مگر انہوں نے مبارکباد کا ایک خصوصی پیغام بھیجا تھا۔ یہ سُن کر وہ مطمئن ہو گئے۔

ہمارے سیاسی موقف کے بارے میں پاکستان کی رائے

پھر اُنہوں نے سوال کیا" ہمارے سیاسی موقف کے بارے میں پاکستان کی رائے عامہ کا کیا رجحان ہے اور حکومت پاکستان کا نقطۂ نظر کیا ہے اور ہمارے موقف کی کس حد تک تائید اور حمایت کرے گی" میں نے جواب دیا" ۲-۳ ہفتوں کی قلیل مدّت میں اس بارے میں کسی قطعی اور حتمی رائے کا اظہار ممکن نہیں۔ دینی اور صحافی حلقوں میں تبادلۂ خیال سے میرا ذاتی تاثر یہ ہے۔ کہ رائے عامہ اور پاکستانی عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ اور انشاء اللہ رہینگے بشرطیکہ ہمارے موقف میں خلوص اور استقامت ہو۔ نیت میں مجاہدانہ عزم ہو اور لائحہ عمل صاف اور واضح ہو۔ جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے۔ اُس نے مجھے خاص تیقنات نہیں دیئے۔ مگر اُس کا رویّہ انتہائی ہمدردانہ ہے اور میرے تقرّر کی منظوری دے کر اُس نے حیدرآباد کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔

اور اُن کا مجھے ہر طرح تعاون حاصل ہے البتہ بعض حلقوں میں ہمارے موقف کے بارے میں کچھ شبہات ہیں جنہیں میں دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر اس میں کچھ وقت لگے گا۔" شبہات کا لفظ سُن کر اعلیٰحضرت نے بڑے اضطراب کا اظہار کیا اور بڑی دلسوزی کے ساتھ فرمایا "شبہات۔ کیسے شبہات۔ کیا وہ یہ نہیں چاہتے کہ جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ مملکت آزاد رہے۔ میں نے اپنے پورے دورِ حکومت میں انتہائی صاف دلی اور پُرخلوص جذبہ کے ساتھ مسلمانوں کے ہر کام میں ہاتھ بٹایا ہے اور ریاست کے وسائل کی حد تک ہر اسلامی تحریک میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ میں یہ اُمید کرنے میں حق بجانب ہوں۔ کہ حیدرآباد کے اس نازک دور میں ویسی ہی صاف دلی۔ خلوص اور ملی جذبے کے ساتھ اس کی حمایت ہوگی۔" اُن کو مطمئن کرنے کے لئے میں نے عرض کیا "سرکار۔ سیاست میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں جسکی وجہ سے اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس کی وجہ کچھ تو اصل حالات سے ناواقفیت ہوتی ہے اور کچھ ذاتی تعصبات۔ عالمی حالات بھی بہت حد تک پالیسی کو متاثر کرتے ہیں میں اپنی حد تک کوشاں ہوں کہ اپنے موقف کے ہر پہلو سے سب طبقوں کو واقف کراؤں۔ اور اگر کوئی ایسی بات ہے جو بھرپور تعاون کے راستہ میں حائل ہے۔ (جسکا فی الوقت مجھے کوئی سُراغ نہیں ملا) تو اُسے رفع کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے یقین واثق ہے۔ کہ جب یہ سب شکوک رفع ہو جائینگے تو پاکستان قوم حیدرآباد کی اُسی جذبہ سے حمایت کرے گی۔" یہ سُنکر وہ چند لمحات میری طرف دیکھتے رہے۔ اور میں نظریں جھکائے ہوئے سامنے بیٹھا رہا۔ اس مرحلہ پر وہ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور برآمدہ میں اپنے خیالات میں گم گم ٹہلنے لگے۔ انہیں اُٹھتے دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو گیا انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں پھر بھی کھڑا رہا تو انہوں نے فرمایا۔ "میں جو کہتا ہوں بیٹھ جاؤ" اسی دوران ٹہلتے ٹہلتے ہی انہوں نے میرے سفر کے مقصد کے بارے میں پوچھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گفتگو کے آغاز ہی میں اصل بات کہہ دوں میں نے ٹالنے کی غرض سے عرض کیا۔ کہ "مجھے اپنی سفارتی ذمہ داریوں کے ضمن میں صدرِ اعظم سے کچھ ہدایات لینی تھیں چونکہ وہ دہلی میں ہیں اسلئے مجھے وہاں اُنکی خدمت میں حاضر ہونا پڑیگا۔"

اس پر اُنہوں نے پوچھا "کیا تم معین نواز جنگ سے نہیں ملے۔ وہ تو یہیں ہے۔ مذاکرات میں لائق علی تنہا گیا ہے۔" میں نے عرض کیا "میں وزیر خارجہ سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے دہلی جاکر ہدایات لینے کا مشورہ دیا ہے۔"

معروضہ خصوصی

گفتگو کے اس مرحلہ پر میں نے ایک معروضہ پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ "معروضہ" کا لفظ سُنکر وہ اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے میں نے عرض کیا "بھارت کی ہٹ دھرمی سے ملک میں داخلی انتشار اور افراتفری پھیلنے کا شدید خطرہ ہے۔ اس کے پیش نظر مملکت حیدرآباد اور خانوادہ آصفیہ کے مفاد کا تقاضا ہے۔ کہ حیدرآباد کی املاک کو جو ۵ سو برس سے مسلمانوں کے خون اور پسینہ کا ثمرہ ہے۔ جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ اعلیٰحضرت نے میری اس تجویز کو تعجب اور تشویش کے ملے جلے جذبات سے سُنا۔ شاید میری اس بات نے اُن کے ذہن میں اُن تمام خدشات کو بیدار کر دیا۔ جنہوں نے انہیں الجھن اور خلجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پریشانی اُن کے چہرے سے عیاں تھی اُسی حالت میں انہوں نے مجھ سے پوچھا "تمہیں کس قسم کے خدشات کا ڈر ہے۔ جن کی بناء پر مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو میری حکومت کو ان خدشات کا علم ہونا چاہیئے۔ صدرِ اعظم اور اربابِ حکومت نے تو اس بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تم نے کراچی میں بیٹھ کر ان خدشات کا کیسے اندازہ کر لیا؟" میں ابھی اس کا جواب بھی دینے نہیں پایا تھا کہ ایک شاہی چوبدار نے کورنشات بجا لاتے ہوئے عرض کیا "سرکار نے آم کا جو ٹوکرا بمبئی بھیجنے کے لئے فرمایا تھا اُس کی تعمیل نہیں ہو سکی۔ کیونکہ حیدرآباد کا اسٹیشن ماسٹر اُسے لینے سے انکاری ہے۔" یہ سُن کر اعلیٰحضرت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے بڑے غصہ میں انگریزی زبان میں فرمایا "میرے اپنے ملک میں اپنی رعایا اور اہلکاروں کے ہاتھوں میری یہ گت بن رہی ہے میں غیروں کی کیا شکایت کروں" پھر شاید انہیں یاد آگیا کہ میرا ریلوے کے محکمہ ہی سے تعلق تھا۔ چنانچہ انہوں نے خشمگین نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے فرمایا۔ "اور یہ تمہارے محکمہ والوں کی حرکت ہے۔" میں سناٹے میں آگیا۔ اور سوچنے لگا کہ کیا انہیں بھارت کی طرف سے عائد کردہ معاشی مقاطعہ کے اقدامات سے واقف نہیں کرایا گیا۔

چنانچہ میں نے تفصیل سے ساری بات بتاتے ہوئے عرض کیا "بھارت کی طرف سے
معاشی ناکہ بندی کی وجہ سے کوئی سامان ہمارے جنکشن سے آگے نہیں جا سکتا ان حالات میں
سٹیشن ماسٹر بے قصور ہے۔ وہ بالکل مجبور ہے" اعلیٰ حضرت کے لئے یہ وضاحت ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ بالکل ایک انکشاف تھا انہوں نے تعجب سے سُنا اور فرمایا "ٹھیک ہے۔
اگر پارسل بمبئی تک نہیں جا سکتا تھا تو اُس کا واپس کر دینا ہی مناسب تھا۔ مگر یہ ساری
باتیں مجھے کیوں نہیں بتائی جاتیں اور بھارتی حکومت مجھ پر ناجائز دباؤ ڈالنے کے لئے ایسے
چھچھورے حربے ہی کیوں استعمال کر رہی ہے۔" میں نے موقعہ غنیمت جان کر عرض کیا "سرکار۔
اس غلام کے ذہن میں یہی وہ چھچھورے حربے ہیں جن کا استعمال بھارتی حکومت بے دھڑک
کر رہی ہے اور آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کرتی رہیگی اُس کی طرف سے جارحانہ اقدامات
یا اُس کی شہ پر پیدا ہونے والی اندرونی خلفشار ان دونوں صورتوں میں ہماری املاک کا بروقت
تحفظ اس غلام کی ناچیز رائے میں قرین مصلحت ہے" میری ان گذارشات کو حضور نظام
نے انتہائی پریشانی کے عالم میں سُنا جو الفاظ اُن کی زبان سے نکل رہے تھے ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے مخاطب ہیں۔ اُن کی خود کلامی اور گفتگو
کا یہ انداز اُن کی شخصیت سے بالکل مختلف تھا اور اُن کی ذہنی پریشانی کی غمازی کرتا تھا۔
"یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے میں نے ہمیشہ ہندو مسلمانوں کو اپنی مملکت کی
دو آنکھیں سمجھا ہے میں نے کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی مجھے ہمیشہ
اپنی رعایا کا مفاد عزیز رہا ہے۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ ایک طرف میری رعایا ایک
ناقابل فہم اضطراب میں مبتلا ہے اکابر سلطنت کی نظریں بدل گئی ہیں دوسری طرف بھارتی
حکومت میری عزیز مملکت کی کسی نہ کسی بہانہ سے تباہی کے درپے ہے۔ یہ سب
لوگ آخر کیوں میرے اتنے خلاف ہو گئے ہیں" میں نے اُن کی باتیں انتہائی دکھ کے
ساتھ سنیں۔ آخری فقرہ کان میں پڑتے ہی جذبات کی شدت سے بے قابو ہو گیا۔ آنکھوں میں
آنسو آ گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں عرض کیا "میں اپنی جسارت پہ نادم ہوں۔ مگر

اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "یہ سب اس لئے آپ کے خلاف ہیں کہ آپ کلمہ گو
ہیں۔ سرکار نے مملکت میں رہنے والے سب طبقوں اور فرقوں میں تفریق گوارا نہیں
رکھی تاریخ اس کی شاہد اور ساری دنیا اس سے واقف ہے۔ مگر وہ یہ کیسے بھول سکتے
ہیں کہ سرکار حضور سرور کائنات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں سے
ہیں۔ اور سرکار کے بزرگوں نے برسوں بھارت کے نئے حکمرانوں کے بزرگوں پر حکومت
کی ہے اور وہ اس علاقہ میں سرکار کو اپنے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں"
اعلیٰ حضرت نے میری ان گذارشات کو توجہ سے سُنا اور "ٹھیک ہے" بھرائی ہوئی آواز
میں کہہ کر برآمدے میں ٹہلتے رہے۔ اُن کے چہرہ پر کرب و پریشانی کے آثار دیکھ کر یقین
نہیں آتا تھا کہ یہ وہی دبدبہ اور جاہ و جلال والا پشتینی بادشاہ ہیں جن کے سامنے بڑے
سے بڑے آدمی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اب وہ وسیع دنیا میں تن تنہا ہیں۔
اُن کے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جس سے وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کر کے دماغ
کے بوجھ کو کم کر سکے۔ چند منٹ کے سکوت کے بعد انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے
ہوئے مجھ سے سوال کیا "بالفرض تمہارے بتائے ہوئے خدشات کو صحیح مان لوں۔ تو قابل
انتقال املاک کے مناسب تحفظ کے لئے تم کیا انتظام تجویز کرتے ہو" میں نے روہانسی
آواز میں عرض کیا "سرکار یوں تو یہ غلام بڑی سے بڑی ضمانت پیش کر سکتا ہے۔ مگر میں
جان بخشی کی درخواست کرتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میرے والد
محترم نے اپنی ساری عمر سرکار کی جان نثاری میں گذار دی ہے اور اس طرح میرا بھائی بھی
اپنی جان نثاری اور وفاداری کے ثبوت پیش کر چکا ہے حال میں سرکار نے اس غلام کو
اپنے اعتماد سے نوازا ہے اب اُس کی باری ہے کہ اُسے جو بھی ذمہ داری تفویض فرمائی
جائے وہ اُسے اپنے لئے باعث عزت و سعادت سمجھے گا اس لئے خارجی ضمانتیں
پیش کرنے کی بجائے سرکار کی امانت کے لئے وہ اپنے خاندان اور اپنی جان نثاری
کا ضمانت پیش کرتا ہے" حضور نظام میرے اس جذباتی انداز گفتگو اور لہجہ سے کسی قدر
متاثر ہو کر خاموش ہو گئے، مگر وقفہ وقفہ سے وہ میری طرف دیکھتے تھے اور پھر اپنے

خیالات میں گم ہو جاتے تھے۔ روپیہ پیسہ کے معاملے میں اعلیٰ حضرت کی روایتی احتیاط
کے پیشِ نظر میں نے انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر عرض کیا "سرکار۔ میں یہ عرض کروں۔ کہ ملک
کی مجوزہ منتقلی پر بار برداری پر کچھ خرچ نہیں آئیگا میں نے یہ بات کہہ تو دی مگر فوراً ہی محسوس
کیا کہ میں نے یہ بات چھیڑ کر خواہ مخواہ اپنے آپ کو الجھن میں ڈال لیا ہے مگر ہوا وہی جسکا
مجھے ڈر تھا۔ اعلیٰ حضرت نے جو بڑے ذہین اور فرلیس آدمی ہیں اسی بات کو پکڑ لیا اور
متعجب ہو کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے ہیں نے۔ جھجکتے ہوئے عرض کیا "جیسا کہ سرکار
کو علم ہے۔ میں نے فضائی نقل و حمل کی ایک خصوصی تنظیم قائم کی ہے۔ جسکا مقصد حیدرآباد
کے لئے روزمرہ کی اُن ضروری اشیاء اور بنیادی ضروریات کی دوسری چیزوں کی باربرداری
اور فراہمی ہے جن کی بھارتی ناکہ بندی سے ملک میں قلت ہو گئی ہے اس تنظیم کے ذریعہ
سے میری گذارش پر بغیر کسی دقت اور خرچ کے عمل ہو سکتا ہے۔ اور غلام اس کے لئے
پوری ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہے" یہ سُن کر اعلحضرت نے متعجب ہو کر پوچھا۔
"مگر تم تو ریلوے کے آدمی تھے۔ ہوائی جہاز کب سے چلانے شروع کر دیئے" ملک کے
لئے ضروری اشیاء کی فراہمی سے متعلق مجوزہ اقدامات سے صدر اعظم اور باب حکومت
نے مجھے کیوں ناواقف رکھا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کہ میں نے باب حکومت کی ملک
کے نظم و نسق سے متعلق کسی تجویز کو مسترد کر دیا ہو۔ پھر پوری صورت حال مجھے کیوں نہیں بتائی جاتی۔
"میں بھلا اس کا کیا جواب دیتا۔ ہوائی جہازوں کی تنظیم کے بارے میں اُن کا سوال دو ہی صورتوں
میں پوچھا جاسکتا تھا ایک تو جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا باب حکومت (کیبنٹ) نے
اس معاملہ میں انہیں اعتماد میں نہیں لیا اور وہ دفاعی اور ملک کے تحفظ اور سلامتی سے
متعلق دوسرے انتظامات کی نوعیت۔ اہمیت اور وسعت سے ناواقف ہیں اگر
یہ بات ہے۔ تو میں نے حکومت کے انتظامات کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کر کے
حکومت کی مصلحت اور شاید منشاء کے خلاف افشائے راز کر دیا ہے۔ جو ظاہر ہے میری
ذمہ داریوں کے حامل شخص کے لئے نامناسب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ
وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے مجھے دانستہ الجھن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

اسی کشمکش و پیچ میں میرے لئے اُن کے دوسرے سوالات جو فضائی تنظیم کے بارے
میں پوچھے گئے تھے مثلاً جہاز کہاں سے آئے۔ اُن پر کتنی لاگت آئی۔ اُس کے منتظمیں
کون ہیں۔ وغیرہ وغیرہ کا جواب دینا بڑا مشکل ہو گیا۔ بالآخر بڑی کوشش اور ترکیب سے
میں گفتگو کا رُخ موڑنے میں کامیاب ہوا۔

شاہی مُہر

اس موقعہ پر انہوں نے ایک سفید بند لفافہ منگوایا جس پر صدر اعظم کا نام لکھا
تھا۔ میرے سامنے اُس پر اپنی پرائیویٹ مُہر ثبت کی۔ اس شاہی مہر کو دیکھنے
کے میرے لئے پہلا موقعہ تھا اُس کے بعد ۱۹۵۲-۳ء میں اس مہر کے چھپے لگے ہوئے
مُراسلے میرے پاس آتے رہے۔ مہر لگا کر انہوں نے فرمایا "اگر تم کل تک ٹھہر سکتے ہو۔
تو میں کچھ کاغذات بھی بھیجنا چاہتا ہوں" میں نے عرض کیا پاکستان میں مملکتِ آصفیہ
کی نمائندگی کے جس اعزاز سے سرکار نے مجھے نوازا ہے وہ میرے خاندان اور میرے
لئے سرمایہ صد افتخار ہے۔ سرکار کی امانت جو اس وقت تفویض فرمائی جارہی ہے وہ
مجھے جان سے زیادہ عزیز ہوگی۔ ایک دن اور ٹھہرنے کے بارے میں سرکا حکم سر آنکھوں
پر مگر اتنا عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ کہ میں انتہائی خفیہ طریقہ اور فرضی نام سے
حیدرآباد آیا ہوں اگر میری آمد کی اطلاع کسی طرح عوام یا پریس کو ہو گئی۔ تو یہی تاثر لیا جائیگا
کہ پاکستان نے مجھے کسی خاص مشن پر بھیجا ہے۔ ایسی حالت میں میری واپسی مخدوش ہو جائے
گی" حضور نظام نے اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ "مگر تم کو تو سفارتی درجہ
حاصل ہے۔ اور بھارتی حکومت کو اس کا علم ہے۔ کسی سفیر کو اُس کے فرائض کی انجام
دہی میں روکنا یا اُس کی نقل و حرکت میں رُکاوٹ ڈالنا مسلمہ سفارتی آداب کے خلاف
ہے۔" میں نے عرض کیا "عام طور پر تو یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا چاہیئے مگر بھارتی حکومت
کا باوا آدم ہی نرالا ہے وہ تو وہی کرے گی جو اُس کے مفاد میں ہو وہ عام اخلاقی یا قانونی
تقاضوں کو کوئی اہمیت دیتی ہے اور نہ ہی اُن کی پرواہ کرتی ہے" یہ سُن کر اعلیٰ حضرت
نے بے بسی کے عالم میں فرمایا۔ "اچھا تو ایسی صورت میں تمہاری جلد واپسی ہی مناسب
ہے"

ایک نازک مرحلہ

گفتگو شروع ہوکر ڈیڑھ گھنٹے سے زائد وقت گذر چکا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اجازت حاصل کروں۔ مگر میری طرف سے پہل کرنا شاہی آداب کے منافی ہوتا۔ رخصتی کی اجازت تو انہی کی طرف سے ملنی چاہیئے۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ چند لمحات کے بعد اعلیٰحضرت برآمدہ میں ٹہلتے ٹہلتے میرے قریب آئے اور اپنی عادت کے خلاف بڑی دھیمی آواز اور رازدارانہ انداز میں فرمایا "اچھا۔ تم نے جو تجویز پیش کی ہے میں اس پر غور کروں گا۔ ایسے نازک اور اہم مسائل پر بڑے گہرے غور و فکر کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔" والد محترم کے نام اپنی مراسلت میں وہ غور و فکر پر ہمیشہ زور دیا کرتے تھے۔ اس لئے مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ ایک طرح اُن کا تکیہ کلام تھا جسے میں سننے اور دیکھنے کا عادی تھا۔ مگر معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے جرأت رندانہ سے کام لیکر عرض کیا "غلام کو یقین ہے کہ سرکار پورے غور و فکر کے بعد جو بھی فیصلہ فرمائیں گے۔ وہ ہر طرح مناسب اور احسن ہوگا۔ مگر یہ خانہ زاد مؤدبانہ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ کہ حالات تیزی سے خطرے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ملک کی سلامتی کے خطرے اور داخلی اور خارجی انتشار کی صورت میں قومی املاک نہ صرف ہمارے تصرف سے نکل جائیں گی بلکہ خاکم بدہن اُمت مسلمہ کے خلاف استعمال ہوں گی۔ اس لئے مصلحت کا تقاضا ہے کہ مسلمان قوم کی ۸ سو سالہ دولت کے تحفظ کے لئے جس کے سرکار امین ہیں فوری اور بروقت انتظامات کئے جائیں۔" یہ سُن کر حضور نظام نے خشمگین نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ذرا درشت لہجے میں فرمایا "تم سمجھتے ہو کہ میں املاک کا صرف امین ہوں اور میرے خاندان کے خون اور پسینہ کا ثمرہ نہیں ہے تمہارے والد فخر یار جنگ بھی بعض وقت ایسی ہی باتیں کہدیا کرتے تھے۔" اب مجھے محسوس ہوا۔ کہ میں نے اپنے جذبے کی شدت اور نادانی سے ایسی بات کیوں کہہ دی جو مجھے نہیں کہنی چاہیئے تھی اس موقعہ پر والد محترم کی ذات کے حوالے ہی نے مجھے سہارا دیا۔ اپنی جسارت پر معذرت پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا۔ "غلام کی جان بخشی فرمائی جائے۔ وہ اپنی جسارت پر نادم ہے۔ میرے والد سرکار اور خانوادہ آصفیہ کے جاں نثاروں میں سے ہیں وہ جو کچھ

سمع ہمایونی تک پہنچاتے تھے اُس کا مصرف سرکار کی ذات والاصفات سے وفاداری اور جاں نثاری کا جذبہ ہوتا تھا۔ غلام نے بھی جو کچھ عرض کرنے کی جسارت کی ہے اُس کا محرک بھی یہی جذبہ ہے۔" میری اس وضاحت کو سُنکر اعلیٰ حضرت کے موڈ میں ذرا خوشگوار تبدیلی ہوئی۔ انہوں نے فرمایا "ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارے والد کے کیا کہنے اُن کی اصابت رائے کی میں قدر کرتا تھا۔ افسوس ہے۔ کہ ملک کے اس نازک دور میں کوئی ایسا آدمی نہیں نہیں جو صحیح اور دیانتدارانہ رائے دے سکے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً مشورے دیتے رہے۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں انہوں نے ایک ضخیم دستاویز مرتب کرکے بھیجی تھی۔ جس کی میں نے بہت قدر کی۔" یہ سُنتے ہی بلا ارادہ میرے مُنہ سے نکل گیا "سرکار۔ مجھے اس کا علم ہے۔" اس پر انہوں نے بڑے تعجب سے پُوچھا "وہ کیسے؟ وہ تو سخت ترین راز تھا۔ تمہیں کیسا معلوم ہوا۔" مجھے بتانا پڑا۔ "سرکار۔ چونکہ بیماری کی وجہ سے وہ اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھ سکتے تھے اس لئے انہوں نے سرکار کی خدمت میں اپنے معروضات کو ہم دونوں بھائیوں سے لکھوانے کی اجازت کی درخواست کی تھی جو سرکار نے منظور فرمائی تھی جس دستاویز کا سرکار نے ذکر فرمایا ہے اُن کے مندرجات کا علم ہے لیکن وہ راز اُس کے سینے میں بند ہے اور کوئی تیسرا شخص انشاءاللہ اُن سے کبھی واقف نہیں ہوگا" یہ سن کر "ٹھیک ہے مجھے یاد آگیا" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اُن کے مزاج کی کیفیت میں خوشگوار تبدیلی محسوس کرکے

میں نے سوچا کہ خالی ہاتھ جانے کے بجائے پائیگاہ والوں کی املاک کا ذکر کرکے دیکھوں شاید اُس میں کامیابی ہو جائے میں نے عرض کیا "سرکار صرف خاص کی املاک کے بارے فیصلہ کرنے میں اگر فی الوقت کوئی رکاوٹ مانع ہو تو پائیگاہوں اور سالار جنگ کی املاک کے بارے میں حکم صادر فرمایا جائے" میرے اس اصرار کو اعلیٰ حضرت نے پسند نہیں فرمایا معمولی حالات میں شاید مجھے اس جسارت کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے اس لئے انہوں نے تیوری چڑھا کر بظاہر ٹالنے کی غرض سے فرمایا "تمہیں ان املاک سے کیا واسطہ یہ معاملہ تو اُمرائے پائیگاہ اور سالار جنگ کے طے کرنے کا ہے۔" میں نے

پھر جرأت سے کام لیکر عرض کیا "سرکار کے زیر سایہ حیدرآباد میں ۲۵ برس رہنے کے بعد غلام کے لیے یہ باور کرنا دشوار ہے کہ اُمرائے پائیگاہ یا سالار جنگ سرکار کی مرضی، منشاء علم یا اشارے کے بغیر اس نوع کا کوئی اقدام کر سکتے ہیں" یہ سن کر وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر فرمایا "اچھا۔ میں تمہاری دونوں تجاویز پر غور کرونگا۔ فی الوقت میں مزید غور و فکر کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا" مجھے رخصت ہونے کی اجازت دیتے وقت انہوں نے فرمایا "پاکستان میں جو خدمات تم انجام دے رہے ہو۔ ان کی میں قدر کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ جس اعتماد کا میں اور میری حکومت نے تمہیں مستحق سمجھا ہے۔ تم ہر طور پر اُس کو پورا کرو گے" اور پھر اچانک "اب پھر کب آؤ گے؟" اُن کی طرف سے اعتماد کے اس اظہار پر جہاں میرا خون چلوؤں بڑھ گیا وہاں اس سوال نے کہ تم پھر آؤ گے مجھے افسردہ کر دیا۔ میں نے عرض کیا "سرکار یہ سب حالات پر منحصر ہے۔ خدا وطن عزیز کو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھے اور اس غلام کو سرکار کی قدم بوسی کا جلد موقعہ ملے" میں نے فرشی سلام کیا اور ½ ۹ بجے نبست کر اس تاریخی اہم ملاقات کی یادوں کو جس میں مجھے اُن کے رجحان فکر اور سوچنے اور سمجھنے کے انداز کا انکشاف ہوا۔ بھرے دل کے ساتھ اور اس عزم راسخ کے ساتھ گھر واپس ہوا۔ کہ جو کچھ بھی حالات ہوں۔ میں انشاءاللہ العزیز آخری دم تک اپنے حلف پر قائم رہوں گا۔

صدر اعظم سے دہلی میں ملاقات اگلے دن صبح میں دہلی کے راستے سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوا۔ میں نے صدر اعظم سے حضور نظام سے اپنی گفتگو کا تفصیلی ذکر کیا اور بتایا کہ اُس سے میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ وہ حکومت کے تمام منصوبوں اور مجوزہ اقدامات سے پوری طرح واقف نہیں ورنہ شاید وہ ہماری فضائی تنظیم کے بارے میں اس انداز کے سوال نہ کرتے۔" انہوں نے کہا "تم تو ان کو جانتے ہو۔ اگر وہ پوری تفصیلات سے واقف ہو جائیں تو خیالوں کی جس دنیا میں وہ رہتے ہیں وہ سب کچھ اپنے درباریوں کو بتا دینگے۔ جس سے سارا بھانڈا پھوٹ[1] جائیگا اور ہمارا منصوبہ خطرے میں پڑ جائے گا۔" مجھے یہ سُن کر تعجب بھی ہوا اور تشویش بھی۔ تعجب اس لئے کہ قومی زندگی کے اس نازک

[1] اس کے خلاف لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۲۸ میں یہ کہتے ہیں کہ نظام کو ساری سکیم کا علم تھا اور اُن کے اخراجات ۳ ملین پونڈ کی منظوری بھی دی تھی۔

مرحلے پر سربراہ مملکت اور اُس کی حکومت کے مابین عدم اعتماد ایک ناقابل فہم بات ہے۔ اور تشویش اس لئے کہ جہاں قوم کی موت و حیات کا مسئلہ سامنے ہو۔ یہ صورت حال مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس احساس کے تحت میں نے دبی زبان میں عرض کیا کہ قومی زندگی کے مخدوش حالات میں اتحاد خیال و عمل بے حد ضروری ہے۔ ورنہ اُسکا نتیجہ لازمی طور پر بربادی ہوگا۔ صدر اعظم نے میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا۔ مگر جو صورت حال ہے وُہ تمہارے سامنے ہے اُس سے صرف نظر کیسے کیا جا سکتا ہے میں پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے عرض کیا "میری ناچیز رائے میں ملک کے حالات اب اس نازک مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا اشد ضروری ہے کہ کیا اعلیٰ حضرت کے تعاون کے بغیر صرف اتحاد المسلمین کی پشت پناہی سے حکومت اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اپنی پسند کی پالیسی پر کار بند ہو سکے۔ تو پھر اعلیٰ حضرت کے ذاتی رجحانات کو حکومت کی پالیسی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کوئی موثر قدم اُٹھانا چاہیئے ورنہ مفاد پرست عناصر اس صورت حال سے فائدہ اُٹھائیں گے اگر جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں۔ میرے اختیارات اور مرتبے سے تجاوز سمجھا جائے تو میں ادب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں۔ اُس کے پیش نظر مسئلے کے اس پہلو پر غور کرنا وقت کی اولین ضرورت ہے" یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے میری رائے زنی کو پسند نہیں کیا۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے عرض کیا "اعلیٰ حضرت سے گفتگو سے مجھے یہ بھی تاثر ہوا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے باب حکومت کی کسی سفارش یا تجویز کو مسترد نہیں کیا اور نہ ہی اُس کے تجویز کردہ کسی اقدام پر کوئی مزاحمت کی۔ اگر یہ بات صحیح ہے۔ تو اُسکا صاف مطلب یہ ہے۔ کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے باب حکومت کی اپنی سفارش اور پالیسی کے مطابق ہو رہا ہے ایسی صورت[1] میں تو اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ ان حالات میں قومی مفاد کا تقاضا ہے۔ کہ اعلیٰ حضرت کو مکمل اعتماد میں لیجئے۔ اُن پر صورت حال کو واضح کیجئے اور قومی سلامتی کے نام پر اپیل کیجئے کہ وہ صحیح فیصلہ کریں۔ اس

Tragedy of Hyderabad

[1] میر لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۲۷ انہوں نے واضح طور پر اس کی تصدیق کی ہے۔

ناچیز کی رائے میں ملک کے نازک حالات میں ہماری ایک آواز ہونی چاہیئے۔ اور جو اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں یا آئندہ کئے جائیں اُنکے بارے میں سربراہ مملکت اور حکومت میں فکر و عمل کا مکمل اتحاد ہونا چاہیئے، اُن کی خاموشی سے مجھے خدشہ ہو گیا کہ وہ ان باتوں کو حدود سے تجاوز کرنا نہ سمجھ لیں۔ اس لئے میں نے یہ بات یہیں ختم کر دی۔
اس موقعہ پر صدر اعظم سے بہت سی باتوں پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اُن چیدہ چیدہ باتوں کا ذکر اس لئے ضروری ہے۔ کہ یہ اُن سے میری آخری تفصیلی ملاقات تھی جس میں مجھے اُنکے اور انہیں میرے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ حضور نظام کی دولت کا مسئلہ جو میرے اس خفیہ سفر کا اصل محرک تھا بھی زیرِ گفتگو آیا۔ اُن کی باتوں سے مجھ پر تاثر ہوا۔ کہ اُنکے چند ماہ قبل کراچی کے سفر میں یہ معاملہ زیرِ بحث آیا تھا اور انہوں نے نظام کو اس بارے میں قائل کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ لیکن کچھ مصروفیت اور کچھ ناسازگار حالات کی وجہ سے اس وقت تک انہوں نے نظام سے اس پر تبادلۂ خیال نہیں کیا اور مناسب موقعہ کی تلاش میں ہیں۔
جب میں نے پوچھا کہ میں قائد اعظم کو کیا جواب دوں ...... تو انہوں نے کہا کہ انہیں بتا دیا جائے کہ یہ مسئلہ ابھی زیرِ غور ہے جیسے ہی کوئی صورت نکلی تو وہ مطلع کر دیئے گے
یہ جواب سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہ واپسی پر میں قائد اعظم کو کس طرح مطمئن کر سکوں گا۔ فضائی معاہدہ کے موضوع پر بھی جو ملک غلام محمد کی شدید ناراضگی کا باعث بن گیا تھا تبادلۂ خیال ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ غلام محمد کی ناراضگی بلاوجہ ہے۔ جو کچھ طے ہوا ہے وہ سب ان کے علم سے ہوا ہے معاہدے کی ہر شق پر اُن سے مشورہ کرنا غیر ضروری تھا۔ بہر حال اب اس مرحلے پر اُس معاہدے میں کمی بیشی یا ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں نے اُس معاہدے کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس میں دو تین باتیں مجھے بہت غیر مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو اس کی یکطرفہ ذمہ داریاں ہیں اگر دوسرا فریق جسکا رویہ اب تک بہت مشکوک رہا ہے۔ شرارت پر اُتر آئے اور تعاون نہ کرے تو معاہدے کی رازدارانہ نوعیت اور عملی مشکلات کے پیشِ نظر اس کے خلاف کوئی مؤثر قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا علاوہ ازیں ہمارا کام عجلت کا متقاضی ہے ہم قانونی کاروائیوں

میں اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے پھر معاہدے کی ایک شق ایسی ہے جسکا فائدہ اُٹھا کر وہ کام میں تاخیر کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں اُسکا فائدہ ہے۔ یہ کام ہماری موت و حیات کا مسئلہ ہے مگر اُس کے لئے محض ایک کاروباری معاملہ ہے۔ ابتک کے تجربے کی روشنی میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ وہی کریگا جو اُس کے مفاد میں ہوگا۔" صدر اعظم نے میری ان گذارشات کو توجہ سے سُنا انہیں اس مہم جو بزرگ کی نیک نیتی پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا چنانچہ انہوں نے کہا کہ جیسا کہ وہ پہلے کہہ چکے ہیں۔ اس معاہدے میں اب کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ معاہدہ جلدی میں طے ہُوا تھا قانونی نقطہ نظر سے اُس جانچ پڑتال نہیں ہوئی اُس کے متن میں اگر کوئی خامی رہ گئی ہے تو یہ ایسی بات نہیں کہ اُس کی وجہ سے پریشانی ہو۔ اور پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "تمہارے خدشات میں وزن ہے مگر مجھے یقین ہے۔ کہ کاٹن ایسی حرکت نہیں کر سکتا آپ میری طرف سے اُس سے کہہ دیجئے کہ میں اُس سے معاہدے پر نیک نیتی سے عمل کرنے کی توقع کرتا ہوں"
میں نے انہیں اپنی اُس یادداشت کی طرف بھی توجہ دلائی۔ جسمیں میں نے حیدر آباد سے وفود اور بااختیار افراد کی میرے علم کے بغیر پاکستان میں آمد پر احتجاج کیا تھا۔ میں نے خاص طور پر یوسف یار جنگ کے خفیہ مشن کا ذکر کیا۔ میں نے بتایا کہ وہ بلا اطلاع کراچی آئے۔ میرے ساتھ قیام کیا۔ مگر اپنی آمد کے مقصد کو سخت ترین راز بنا لیا۔ اور پھر اپنے طور پر قائد اعظم اور پاکستان کے دیگر اکابر سے مل کر واپس چلے گئے۔ میں نے عرض کیا۔ کہ اس طریق کار سے نہ صرف مجھ پر حکومت کی طرف سے عدم اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ حکومت پاکستان اور یہاں کے عوام کی نظروں میں میری سفارتی وقار بھی متاثر ہوتا ہے اگر کسی خاص مقصد کے تحت کسی فرد یا وفد کو میرے سفارتی علاقے میں بھیجنا ضروری سمجھا جائے تو انصاف کا تقاضا ہے۔ کہ مجھے اُس کا علم ہونا چاہیئے اور اُس کی ضرورت اور دائرہ کار کے بارے میں مجھے اعتماد میں لیا جانا چاہیئے اس طرح جو بھی مذاکرات ہوں تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے مقامی سفیر کو اس میں شریک کیا جانا چاہیئے۔ صدر اعظم نے میرے نقطہ نظر سے اتفاق کیا اور بڑے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ ان لوگوں کو بھیجنے کی وجہ

یہ نہیں ہے کہ مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے کہ بہت اہم کاموں مصروف ہوں اور مجھے چھوٹے چھوٹے کاموں میں نہیں الجھانا چاہیئے میں نے عرض کیا کہ پاکستان کے اکابر سے اور خود قائد اعظم سے سیاسی گفتگو یا مذاکرت کوئی غیر اہم اور چھوٹی چیز نہیں ہے یہ تو

میرے فرائض کا ایک انتہائی اہم پہلو ہے اگر مجھے اُس سے بے تعلق کر دیا جائے تو تو میرا کیا مصرف باقی رہ جاتا ہے۔ میں نے حضور نظام کی دولت کے معاملے کی مثال دی۔ اس بارے میں کب اور کس طرح گفتگو ہوئی۔ کوئی یقین دہانی کرائی گئی یا نہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتایا گیا اس طرح ملک غلام محمد سے فضائی تنظیم کے بارے میں جو بھی بات چیت ہوئی ہو اُس کا مجھے علم نہیں۔ اس وجہ سے اس نوعیت کے اہم مسائل کو سلجھانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ علاوہ ازیں کسی ملک کے سفیر کے اختیارات اور ذمہ داریاں سب مسائل پر حاوی ہوتے ہیں اُنکو بانٹا نہیں جا سکتا اگر سفیر پر زیادہ بوجھ ہو تو اس کی مدد کے لئے کسی ذمہ دار شخص کو جو اُس سے تعاون کرے بھیجا تو جا سکتا ہے لیکن اس کے اختیارات میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے درخواست کی کہ آئندہ مجھے ایسی مشکل میں نہ ڈالا جائے۔ صدر اعظم نے میرے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ اس بارے میں مناسب ہدایات جاری کر دی جائیں گی۔

العیدروس کا معاملہ

اس کے بعد میں نے اپنے کمانڈر میجر جنرل العیدروس کا ذکر کیا اور بتایا کہ جیسا کہ میں دو بار اپنے خطوط میں عرض کر چکا ہوں۔ حکومت پاکستان کی نظر میں اُن کی عسکری مہارت اور وفاداری مشکوک ہیں یہ مجھے دو تین بار نواب زادہ لیاقت علی خان کی طرف سے بالمشافہ غیر مبہم طور پر بتایا جا چکا ہے۔ صدر اعظم نے یہ سن کر مسکرا کر فرمایا "تمہارے خطوط کے علاوہ مجھے دوسرے ذرائع سے بھی پاکستان میں اس نوع کے تاثرات کی اطلاع مل چکی ہے مگر مجھے یقین ہے۔ کہ ان افواہوں میں کوئی حقیقت نہیں اور مجھے کمانڈر العیدروس پر مکمل اعتماد ہے۔" میں نے وضاحت کی اور جو کچھ مجھ تک پہنچا ہے وہ سرکاری اور غیر سرکاری اطلاعات۔ اور تاثرات کی عکاسی کرتا ہے اس لئے میں نے اسے اپنا فرض سمجھا۔ کہ یہ بات بطور

خاص آپ کے نوٹس میں لائی جائے۔ میری ناچیز رائے میں ان اطلاعات یا افواہوں میں اگر آپ کی اطلاع کے مطابق حقیقت نہ بھی ہو۔ تب بھی قوم کی زندگی کے اس نازک مرحلے میں انکو سرے سے نظر انداز کر دینا بھی قرین مصلحت نہیں۔ ایسے موقعوں پر خفیہ خبر رساں ایجنسیاں غلطیاں بھی کر سکتی ہیں۔" العیدروس کے بارے میں میرا اس طرح زور دینے کو اُنہوں نے پسند نہیں کیا اس لئے میں نے اس بات کو وہیں ختم کر دیا۔ مگر انہوں نے خود ہی فرمایا "ہنگامی حالات میں مختلف قسم کی افواہیں پھیل جاتی ہیں۔ مثلاً میں نے یہ خواہ بھی سُنی ہے کہ ہمارے دہلی کے نمائندے زین یار جنگ کی وفاداری کے بارے میں بھی بعض حلقوں میں کچھ شبہات ہیں۔ اگر اس قسم کی افواہوں پر بھی اپنا وقت ضائع کروں تو بہت سے اہم کام رہ جائینگے" وہ شاید سمجھتے تھے کہ میں اس افواہ کے بارے میں کچھ کہوں گا میں خاموش رہا۔ جب انہوں نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے عرض کیا "یہ افواہ میں نے بھی سُنی ہے۔ مگر فی الوقت میں اُس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے میرے پاکستان میں تقرر کے موقعہ پر مجھے یہ تاثر دیا جو میں آپ کی خدمت میں پہنچا چکا ہوں کہ وہ پاکستان میں حیدرآباد کی نمائندگی پسند نہیں کرتے۔" یہ گفتگو ۲-۳ گھنٹوں پر محیط رہی رات کے ۱۱ بجے چکے تھے ۶½ بجے صبح کراچی کے لئے روانہ ہونا تھا میں نے اجازت چاہی صدر اعظم نے میری پانچ ہفتوں کی کارکردگی پر اظہار اطمینان کیا اور بڑے مشفقانہ انداز میں فرمایا "مجھے تم پر کامل اعتماد ہے۔ تم اللہ کا نام لیکر کام کئے جاؤ۔ اچھا اب تم آرام کرو۔ اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔"

دہلی سے واپسی

دوران کی اہم مصروفیتوں کی وجہ سے مجھے ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی تھکان تھی۔ پھر یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں واپسی کے سفر کے کسی مرحلے میں میرا راز افشا نہ ہو جائے۔ مگر نیند جب آتی ہے تو سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ صبح ۴ بجے اُٹھ کر تیار ہوا اور ہوائی اڈہ پہنچ گیا۔ آدھ گھنٹہ میں وہاں کا انتظار بھی بڑی کڑی آزمائش تھی۔ جہاز کی پرواز شروع ہو کر تھوڑی سی دیر ہوئی تھی کہ ہمارا ڈکوٹا صحرائے راجستان میں باد و باراں کے طوفان میں گھر گیا اور بُری طرح ڈگمگانے لگا کبھی وہ بادلوں کے

اوپر جاتا تھا اور کبھی نیچے آتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے بادلوں کا لحاف اوڑھ لیا ہے۔ مسافروں میں بیشتر لوگ طوفان کے اثرات کی تاب نہ لاکر بیمار پڑ گئے تھے میں آنکھیں بند کرکے حافظ حقیقی سے سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا اس اعصابی ہیجان میں کئی بار یہ خیال آیا۔ کہ قدرت کی ان گنت اور مہیب طاقتوں کے سامنے ان انسانی کھلونوں یعنی اُڑن کھٹولوں کی آخر کیا حقیقت ہے۔ سائنس کے اس دور میں جب کہ بُر خود غلط انسان کو اپنی محدود عقل اور سمجھ پر اتنا زُعم ہے۔ کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا ایسے ہی موقعوں پر اُسے لامحالہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ ضرور کوئی ایسی طاقت ہے جس کے دست قدرت میں موت وحیات کا نظام ہے۔ اگر اُس کی رضا ہو۔ تو مچھلی کے پیٹ میں بھی اپنے بندوں کی حفاظت کرسکتا ہے اور اگر اُس کی مشیت کا تقاضا اُس کے خلاف ہو۔ تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے نہیں بچا سکتی۔ خُدا خُدا کرکے طوفان کی شدّت میں کمی ہوئی تو سب کی جان میں جان آئی۔ لیکن مجھے ذہنی سکون اس وقت حاصل ہوا۔ جب ہمارا جہاز بھارت کی فضائی حدود عبور کرکے پاکستان میں داخل ہوگیا۔

حصّہ دوم

آٹھواں باب

معاہدہ انتظام جاریہ سے انقطاع مذاکرات تک

ایک سال کی قلیل مدّت کے لئے انتظام جاریہ کا معاہدہ کرتے وقت فریقین کے دلوں میں کیا تھا۔ یہ واضح نہیں ہے۔ لیکن آنے والے واقعات سے یہ تاثر ہوتا ہے۔ کہ یہ محض "دفع الوقتی" تھی۔ اس مہلت کو فریقین اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ بھارت اُس وقت کشمیر اور دیگر مسائل میں اُلجھا ہوا تھا اُس کی سوچ غالباً یہ ہوگی کہ معاہدے کے ایک سال کی مدّت میں وہ انہیں سُلجھا لیگا اُس کے بعد وہ اطمینان اور یکسُوئی سے حیدرآباد پر بھرپُور دباؤ ڈال سکیگا۔ اس خیال کی تصدیق وی۔پی۔مینن کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ کہ جب اُس نے اس معاہدے کو نہرو کی دستخط کے لئے پیش کیا تو اُس نے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہمیں سال بھر امن نصیب ہوجائے گا" یہ حکومت حیدرآباد بھی شاید یہی سمجھتی ہو کہ یہ ..... مہلت صورتِ حال کے سنبھالنے اور اپنی مدافعت کے انتظامات کے لئے مفید ہوگی۔[1] لیکن حالات کی اُفتاد کچھ ایسی پڑی۔ کہ یہ معاہدہ اوّل دن ہی سے غیر موثر ہوکر رہ گیا۔ بھارت نے فوری طور پر اس سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ کنہیا لال منشی جیسے کٹر مہاسبھائی کو حیدرآباد میں اپنا ایجنٹ جنرل مقرر کرکے اُسے تخریبی کارروائیوں کا اڈا بنالیا جسکی وجہ سے سیاسی فضا کیسر زہر آلودہ ہوگئی۔ اور مہلت کا زیادہ وقت منشی کی کارروائیوں کی کاٹ میں صرف ہوگیا۔ اسی زمانے میں حیدرآباد نے زین یار جنگ کو دہلی میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ لیکن جہاں بھارتی نمائندے کو اپنے رویّہ اور جوڑ توڑ سے اپنی حکومت کے عزائم کو پروان چڑھانے کے لئے کھلا میدان

---

[1] وی۔پی۔مینن۔ Integration of States. صفحہ ۳۲۶

مل گیا حیدر آباد کے نمائندے کو یہ مواقع حاصل نہیں تھے۔ مزید برآں اگر اسکا تقرر دھڑے بندی اور اندرونی مصلحتوں سے ماورا ہو کر کیا جاتا تو شاید منشی کی کارروائیوں کا کچھ توڑ ہو جاتا۔ مگر تقرر کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ نمائندہ مقرر کرنے سے حکومت حیدر آباد کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچا کیونکہ دہلی میں حیدر آباد کا ایک نمائندہ متعین تھا۔ مگر حیدر آباد کے مفاد کا تحفظ تو بڑی بات تھی اُس کی پالیسی اور مجوزہ اقدامات دہلی میں کوئی راز نہ رہے۔ پاکستان میں اپنا نمائندہ مقرر کرنے میں حکومت نے ۴ ماہ لگا دیئے یعنی معاہدے کی مدت کا ایک تہائی وقت سوچ بچار کی نذر ہو گیا اس طرح بہت قیمتی وقت ضائع ہو گیا اور جب بالآخر یہ تقرر ہوا تو اُس کے متعلقہ کاغذات تیار تھے نہ نمائندے کے دائرہ کار اور لائحہ عمل کے بارے میں کوئی سوچ بچار کیا گیا تھا اس لئے اُسے وقت پر کوئی واضح ہدایات نہیں دی جا سکیں۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ کہ حیدر آباد دہلی۔ لندن اور کراچی میں متعین نمائندوں کے عہدے کے نام میں بھی یکسانیت نہ تھی۔ یہ عہدہ بھی ایک چیستان بن کر رہ گیا۔ ۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے سفر کے ایک ساتھی یوسف یار جنگ کو میر لائق علی نے اپنی کتاب میں "اڈیشنل ایجنٹ جنرل" لکھا ہے یہ واضح نہیں کہ وہ دہلی میں متعین ایجنٹ جنرل کے اضافی ساتھی تھے یا کراچی میں ہونے والی ایجنسی سے اُن کا کوئی واسطہ تھا وہ محض ایک سفری سفیر Roving Ambassador تھے۔

لائق علی کی گاندھی اور پٹیل سے ملاقاتیں

صدارت عظمٰی کا عہدہ سنبھالتے ہی لائق علی دہلی گئے اور رسمی مذاکرات سے پہلے بھارتی اکابر گاندھی اور پٹیل سے ملے اُس نے بغیر لگی لپٹی کے کہہ دیا کہ وہ معاہدہ انتظام جاریہ کے خلاف تھا اُسے پہلے ہی معلوم تھا۔ کہ وہ ناکام ہو گا اُس نے بدرجہ مجبوری اپنے رفقا کی رائے کی مخالفت نہیں کی تھی۔ حیدر آباد کے مسئلہ پر گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہوئے اُس نے بڑے طنز سے کہا کہ چونکہ نظام کو بھارتی اکابر سے زیادہ ماؤنٹ بیٹن

Tragedy of Hyderabad

لہ میر لائق علی - ٹریجڈی آف حیدر آباد صفحہ ۱۵۵

پر اعتماد ہے۔ اس لئے لائق علی کو اُنہی سے بات کرنی چاہیئے مگر نظام کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے کہ ماؤنٹ بیٹن ایک دستوری گورنر جنرل ہے۔ وہ بھارتی حکومت کی مرضی اور ایما کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا اور بالآخر نظام کا بھارتی اکابر سے ہی واسطہ پڑے گا۔ یہ ملاقات بڑی رکھائی اور ناخوشگوار ماحول میں ہوئی۔ پٹیل سے گفتگو کے بعد میر لائق علی نے ماؤنٹ بیٹن سے حیدر آباد کے معاملے میں اس کی صحیح پوزیشن کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ حکومت برطانیہ سے نظام کے خصوصی تعلقات کی وجہ سے بھارتی حکومت نے اس مسئلے کو سلجھانے کیلئے اُسے خصوصی اختیارات دے دیئے ہیں۔ آنے والے واقعات کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان خصوصی اختیارات کو اُس نے حیدر آباد سے مراعات حاصل کرنے کے لئے تو استعمال کیا۔ لیکن اُسکی دستوری گورنر جنرلی بھارتی حکومت کے رویّہ میں لچک پیدا کرنے میں اُسکی معذوری کا ایک بہانہ بن گیا۔ پٹیل سے ملاقات کے اگلے دن یعنی ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی سے ملاقات ہوئی اُس نے چھوٹتے ہی کہا کہ بھارت اور حیدر آباد کے مابین مفاہمت کے راستے میں بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ حیدر آباد ابھی تک پرانی طرز حکومت پر چل رہا ہے جبکہ بھارت میں ۱۵۔ اگست سے جمہوری طرزِ حکومت قائم ہو چکی ہے لائق علی نے اُسے بتایا کہ حیدر آباد میں جمہوری طرزِ حکومت کے قیام میں تاخیر بھی تو بھارت اور حیدر آباد میں عدم مفاہمت کی وجہ سے ہے حیدر آباد صدیوں سے مسلم تہذیب اور ثقافت کا مرکز رہا ہے اور فوری طور پر اُسے بھارتی حکومت کے کنٹرول میں ایک ہندو ریاست میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا گاندھی نے جواب دیا۔ کہ وہ خود اس قسم کی تبدیلی کے حامی نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی خواہش ہے کہ حیدر آباد کو بھارت میں مسلم تہذیب و ثقافت کے مرکز کے طور پر قائم رہنا چاہیئے۔ دوران گفتگو لائق علی نے کہا۔ کہ انکی رائے میں شاید یہ مناسب ہو۔ کہ مسلمانوں کو ایسے علاقوں سے بڑی تعداد میں منتقل کر دیا جائے جہاں وہ اقلیت ہونے کی وجہ سے اپنے آپکو غیر محفوظ خیال کرتے ہوں۔ گاندھی نے

لہ میر لائق علی صفحہ ۱۴۲ ، کہ میر لائق علی صفحہ ۱۴۳ ، سلہ میر لائق علی صفحہ ۱۱۲-۱۱۷

Tragedy of Hyderabad

جواب دیا۔ کہ یہ مسئلہ بڑے غور و خوض کا محتاج ہے وہ ایک، دو دنوں میں پھر اُن سے بات کریں گے۔ لیکن اگلے دن وہ قتل کر دیے گئے۔

پاکستان کو دی جانے والی تمسکات

۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء کی ملاقات میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو ۲۰ کروڑ کی تمسکات دیئے جانے کا مسئلہ اُٹھایا اور کہا کہ بھارتی حکومت اُسے خارجہ تعلقات کی حد تک معاہدہ انتظام جاریہ کی خلاف ورزی سمجھتی ہے۔ وی۔ پی۔ مینن نے کہا کہ حیدر آباد کو اس قسم کا سرے کوئی حق ہی نہیں تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ شکایت تھی کہ اس اقدام کو حکومت حیدر آباد کو راز میں نہیں رکھنا چاہیئے تھا اور معاہدے کے وقت اسے ریکارڈ پر لانا چاہیئے تھا۔ بہرحال معاہدے کے فوراً بعد اس انکشاف سے ایک اُلجھن پیدا ہو گئی۔ لائق علی نے پیشکش کی کہ وہ کراچی جا کر کفالتی تمسکات کو بازار میں نہ لانے کے لئے پاکستان کو رضامند کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ وہاں جا کر مثبت جواب بھی لائے مگر یہ اس طرح سے معاہدے کی خلاف ورزی کا اقرار تھا جس سے لائق علی کی پوزیشن متاثر ہوئی۔ بھارت کو حیدر آباد کے مزید دو اقدامات پر بھی اعتراض تھا۔ ایک غیر ملکی کرنسی کے استعمال کی ممانعت کا قانون دوسرے قیمتی دھاتوں کی برآمد پر تحدید۔ ان دونوں اعتراضات پر گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ ان سے متعلق جاری شدہ قوانین میں ترمیم کر دی جائیگی۔ دوسری طرف حیدر آباد کو بجا طور پر شکایت تھی کہ اس کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اور دن بدن اُس پر سختی سے عملدر آمد ہو رہا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ انتقال اقتدار سے پہلے سے ملحقہ صوبوں کی حکومتیں ناکہ بندی کر رہی تھیں اور اب یہ کام دھڑلے سے ہونے لگا تھا اپریل ۱۹۴۸ء میں سر والٹر مانکٹن نے ماؤنٹ بیٹن کا مہمان بننے سے گریز کیا اور ۱۰ اپریل کی ملاقات میں شکایت کی کہ تین ماہ سے حیدر آباد میں ہر چیز کی درآمد اور برآمد پر بندش ہے جس کی وجہ سے ۵۰ لاکھ کی رقم تاوان کی شکل میں ادا کرنی

لـه ایچ۔ وی ہاڈسن صفحہ ۳۰۳

پڑی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ افواہ گرم ہے کہ بھارت کسی نہ کسی بہانے سے حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ حیدر آباد میں بھارت کا نمائندہ کھلے بندوں "ڈی۔ ڈے" کا ذکر کرتا ہے۔ اشیائے خوردنی اور تجارتی مال پر بندش کے علاوہ ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے جس اسلحہ کی فراہمی کی بھارت نے ذمہ داری قبول کی ہے اُسے تعویق میں ڈال دیا ہے۔ جس کی وجہ سے امن و امان کی حالت دن بدن مخدوش ہوتی جا رہی ہے ایک طرف اسلحہ کی فراہمی سے گریز دوسری طرف سرحدوں پر شورش پسندوں کو اکسایا جا رہا ہے کہ وہ ملحقہ سرحدوں علاقوں کے امن کو تہ و بالا کر دیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے پوچھا کہ کیا وہ انہیں ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ تو سر والٹر نے جواب دیا۔ کہ چونکہ انہوں نے ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ذاتی طور پر یقین دہانی کرائی تھی کہ حیدر آباد پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس لئے اب جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اُس سے وہ غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ ماؤنٹ بیٹن نے یقین دلایا کہ بھارتی حکومت کیطرف سے ایسی کوئی ہدایات جاری نہیں ہوئیں ممکن ہے۔ کہ صوبائی حکومتوں نے حب الوطنی کے غلط تصور کی بنا پر ایسا کوئی اقدام کیا ہو۔ پنڈت نہرو نے بھی یقین دلایا۔ کہ انہیں ذاتی طور پر اس قسم کی ہدایات کا کوئی علم نہیں!!

منشی میدان میں

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ لائق علی تمسکات کے بارے میں پاکستان کا مثبت جواب لا چکے تھے۔ متنازعہ قوانین میں ترمیم کا وعدہ ہو چکا تھا ان یقین دہانیوں پر بھارتی حکومت نے معاشی ناکہ بندیوں کو ختم کرنے اور سرحدی حملوں کو روکنے کا وعدہ کیا امید بھی کیجاتی تھی کہ اس کے بعد مفاہمت کے ایک نئے دور کا آغاز ہو جائیگا۔ مگر مشترکہ بیان کے مسودے پر تنازعہ شروع ہو گیا اور جو مفاہمتی فضا قائم کرتی تھی وہ دھندلی پڑ گئی۔ اس صورت حال پر نظام نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط میں ان تمام اقدامات اور کوششوں کا ذکر کیا جو مفاہمتی فضا قائم کرنے کے لئے کئے گئے تھے اور امید ظاہر کی کہ مکمل مفاہمت کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں ہیں وہ ان کو دور کرنے کی کوشش کریں گے مشترکہ بیان کے بارے میں تنازعہ کیوں پیدا ہوا۔

لـه خط ۲۲ - حیدر آبادی وفد کے قائد کا ایک خط مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء Collateral letter

اور سر والٹر مانکٹن کا تیار کیا ہوا مسودہ جو خوشدلی سے کئے ہوئے فیصلوں کا مستند ریکارڈ تھا کیوں مسترد کردیا گیا۔ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ہوسکتا ہے۔ کہ یہ محض بھارتی حکومت کی تلوّن مزاجی ہو جو یہ بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ فیصلے دوستانہ ماحول میں کئے گئے ہیں جس سے بھارت اور حیدرآباد کے مابین مساوی حیثیت کی عکاسی ہوتی ہے یا اندرون خانہ کچھ اور عوامل ہوں لائق علی کی روایت یہ ہے کہ ان فیصلوں کی بھنک منشی کے کان میں پڑچکی تھی۔ اور وہ تلملا رہا تھا کہ ایسے اہم فیصلے اُس سے صلاح مشورے کے بغیر کیسے کرلئے گئے اُس نے بھارتی لیڈروں کو متنبہ کیا کہ اگر مشترکہ بیان جاری کیا گیا تو وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہوجائیگا۔ اور اس مسئلہ کو بھارتی اسمبلی میں پورے زور سے اُٹھائیگا۔ اس دھمکی سے بھارتی حکومت کا رویّہ بدل گیا اور مشترکہ بیان تعطّل کا شکار ہوگیا۔ اس کے بعد منشی نے لائق علی سے اس مسئلہ کو سلجھانے[1] کے لئے بات چیت کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ کئی دنوں کے بحث مباحثہ کے بعد اُس نے معین نواز جنگ کے ساتھ مل کر ایک مفاہمتی فارمولا تیار کیا جسے وہ اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ وہاں سے واپسی پر بجائے اس کے وہ اُس فارمولے کی بات کرتا اُس نے بھارتی حکومت کا ایک خط مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء جو اپنے متن۔ انداز اور لہجے سے کسی طرح الٹیمٹم سے کم نہیں تھا۔ لائق علی کے حوالے کیا اور اپنی گفتگو میں ... بغیر لگی لپٹی کے واضح الفاظ میں یہ کہا۔ کہ بھارتی حکومت ملک کے قلب میں ایک مسلم حکومت کو برداشت نہیں کرسکتی اور وہ ہروہ اقدام کریگی جو اُس کے خاتمہ پر منتج ہو۔ نظام نے اس پر سخت احتجاج کرتے ہوئے گفتگو کے متن کو ماؤنٹ بیٹن کو بھیج دیا۔ ۲۲ مارچ کے اُس خط کے جواب میں لائق علی[2] نے نہرو کے نام اپنے مکتوب مورخہ اپریل ۱۹۴۸ء میں سب نکات کا تفصیلی جواب دیا اور یہ پیشکش کی کہ اگر اس تفصیلی وضاحت کے بعد بھی کوئی شکوک ہوں تو ثالثی کرالی جائے

سلہ میر لائق علی Tragedy of Hyderabad صفحہ ۱۶۶

سلہ میر لائق علی Tragedy of Hyderabad صفحہ ۱۷۰

جس کی معاہدہ انتظام جاریہ[1] میں گنجائش رکھی گئی ہے۔

قاسم رضوی کا اسلحہ کا ہفتہ

۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو سر والٹر مانکٹن دہلی آئے تو بھارتی حکومت کے نمائندے اُن سے بڑی سرد مہری سے پیش آئے اڈسن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یادداشتوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سر مانکٹن نے لارڈ موصوف کی میزبانی قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وجہ یہ بتائی کہ انہیں باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے۔ کہ ۱۰ اور ۱۱ اپریل کے درمیان حیدرآباد کے خلاف کوئی جارحانہ کاروائی زیر غور ہے۔ اس لئے وہ اور ماؤنٹ بیٹن انگلستان میں کشمیری محاذ پر ایک دوسرے کے خلاف ہونگے۔ ۷ اپریل کو ہندوستان ٹائمز نے حیدرآباد سے بھیجی ہوئی ایک کہانی شائع کی۔ جس میں مبینہ طور پر ہندوؤں کے خلاف بہت زہر اُگلا گیا تھا۔ کیمبل جانسن نے ERTC BURTAR لندن ٹائمز کے دہلی کے نامہ نگار کے حوالے سے بتایا ہے۔ کہ جس دن قاسم رضوی کی مبینہ تقریر ہوئی تھی اُس نے چار پانچ سو رضاکاروں کی سلامی کی تقریب تو دیکھی تھی لیکن اس موقعہ پر کوئی تقریر نہیں ہوئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان ٹائمز نے یہ رپورٹ مفاہمتی مذاکرات کو ختم کرنے کے لئے تصنیف کی تھی اس میں اُسے نمایاں کامیابی ہوئی۔ کیونکہ آئندہ ہونے والے مذاکرات اور مفاہمتی ماحول پر اتنا اثر پڑا کہ چھوٹے درجہ کے لیڈروں کا تو کیا ذکر نہرو جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل شخص تک نے یہ کہدیا کہ وہ مطمئن ہیں کہ یہ تقریر ہوئی تھی۔ اور اگر بالفرض نہیں ہوئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس قسم کی تقریریں قاسم رضوی پہلے بھی کرچکا ہے!!

چار نقاطی پروگرام

"ہفتہ اسلحہ" کی خبر کی شر انگیزیوں سے پیدا ہونے والی گرما گرمی میں بھارتی اکابر اور حیدرآبادی نمائندوں میں ایک چار نقاطی پروگرام زیر بحث آیا۔ جو مندرجہ ذیل فیصلوں پر مشتمل تھا (۱) رضاکار تنظیم پر تحدید۔

Hyderabad Relations with Dominion of India, volume

لہ خط ۲۷ -

(۲) کانگریس کے لیڈروں کی رہائی (۳) حکومت کی سرِنو تشکیل جس میں سب فرقوں کی نمائندگی ہو۔ (۴) سال کے آخر تک دستور ساز اسمبلی کا قیام اور ذمہ دار حکومت کا نفاذ۔ ان نقاط کے فارمولے کے ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے۔ جو مینن نے مانکٹن سے منسوب کی ہے کہ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ وہ نظام کو مشورہ دیں گے کہ ان نقاط کی منظوری کے ساتھ وہ اپنے وزیر اعظم کو بدل دیں۔ یہی بات کیمبل جانسن نے بھی کہی ہے۔ مگر اس اضافہ کے ساتھ کہ اس نے لائق علی کی جانشینی کا مسئلہ بھی طے کر دیا[1] مانکٹن نے یہ بات کہی یا نہیں کہی اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کیا جا سکتا[2] لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بھارتی حکومت دل سے چاہتی تھی کہ لائق علی اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائیں۔ چنانچہ گفت و شنید کے اُس دور میں پٹیل نے ایک سے زائد مرتبہ لائق علی سے کہا کہ وہ مستعفی ہو جائیں ۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو متفقہ نقاط کے پروگرام میں ذمہ دار حکومت کے ضمن میں نظام نے اپنا فرمان جاری کیا جس کے الفاظ پر دہلی میں بہت مایوسی کا اظہار کیا گیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں نہرو نے ایک شر انگیز تقریر کی جس میں حیدر آباد کو بڑے سخت الفاظ میں الحاق یا جنگ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا مشورہ دیا۔ اور علی الاعلان کہا کہ حیدر آباد کے معاملہ میں بھارت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ جب اس تقریر پر لے دے ہوئی۔ تو نہرو نے بہانہ بنایا کہ اس کی تقریر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ اُسی دوران ماؤنٹ بیٹن نے زین یار جنگ کے واسطے سے نظام کو دہلی آنے کی دعوت دی جسے انہوں نے اس بنا پر مسترد کر دیا کہ اس سے مقامی طور پر غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ جس سے وہ بچنا چاہتے ہیں۔ ہٹلر کی دعوت پر جرمنی میں آسٹریا کے چانسلر کی جو گت بنی تھی شاید وہ تاریخی واقعہ اُنکے ذہن میں تھا وہ

---

[1] وی پی مینن The Integration of Indian States

[2] کیمبل جانسن Mission with Mountbatten

[3] میر لائق علی Tragedy of Hyderabad

سمجھتے ہونگے کہ جب تک بھارت کی تیار کردہ دستاویز پر وہ دستخط نہیں کریں گے اُنہیں دہلی میں بے دست و پا کر کے روک لیا جائیگا اس کی تصدیق منشی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس سے اپنی پہلی ملاقات میں نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔ اگر ایک مرتبہ نظام حیدر آباد سے یہاں چل کر آ گیا تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر کے واپس جائیگا۔ اس کے بعد ہم رضوی سے سمجھ لیں گے۔ نظام نے اُس کے جواب میں ماؤنٹ بیٹن کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔ جسے[1] اس نے مسترد کر دیا۔ ماؤنٹ بیٹن اپنے طور پر حیدر آباد کی صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی کم ظرفی کے سوا کیا کہا جائے۔ کہ اس نے برطانیہ کے "یار وفادار" سے گفتگو کرنے کے لئے اپنے پریس اتاشی سے اونچے مرتبے کا کوئی شخص نہیں ملا۔ بہرحال کیمبل جانسن حیدر آباد آیا۔ بھارت کے ایجنٹ جنرل اور لائق علی سے ملا۔ نظام نے بھی اُسے باریابی کا موقعہ دیا۔ اور بہت کھل کر اور کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے نمائندے کی رپورٹ یہ تھی کہ بھارت سے تعلقات کے بارے میں اب بھی نظام کی رائے پر عمل ہوتا ہے۔ اور نظام اپنی رائے کے اظہار میں جارحانہ انداز میں تقدیر کے قائل ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن اپنے اصلی رنگ میں

جون ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتے میں لائق علی سے ماؤنٹ بیٹن نے بڑی طویل گفتگو کی۔ اور بھارتی وسائل اور اُس عسکری طاقت کا ہوا دکھا کر اُن پر گہرا نفسیاتی اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ یعنی وہی کیا جو وہ نظام سے کرتے اگر وہ اُنکی دعوت قبول کر لیتے اس نے کہا کہ اُنکی روانگی کے بعد بھارتی حکومت کسی نہ کسی طرح حیدر آباد پر حملہ کر کے قبضہ کرے گی۔ حیدر آباد چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے اور اپنے کمزور اور ناکافی وسائل سے اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا[2]۔ اب تک اگر بھارتی حکومت نے ایسا اقدام نہیں کیا تو اُس کی وجہ اُن کی یعنی ماؤنٹ بیٹن کی موجودگی تھی اس کے جانے کے بعد پٹیل کا وہ ث

---

[1] کے ایم منشی - The End of an Era

[2] میر لائق علی - Tragedy of Hyderabad صفحہ ۲۰۳

باقی نہیں رہیگی۔ نیز بھارتی حکومت نے اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ تمام دنیا میں حیدرآباد کے خلاف ایک ایسا محاذ قائم کر دیا ہے۔ جو کسی وقت بھی جارحانہ اقدام کا جواز بن سکتا ہے۔ حیدرآباد اقوام متحدہ کا رکن نہیں ہے۔ جبکہ بھارت ایسی پوزیشن میں ہے کہ وہ اپنے اقدامات کو بین الاقوامی پلیٹ فارم پر جائز ثابت کر سکے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ گو اُسے ذاتی طور پر لائق علی کے خلوص اور نیک نیتی پر اعتماد ہے۔ مگر بھارتی حکومت ایسا نہیں سمجھتی اُس کا خیال ہے۔ کہ لائق علی کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں اس لئے ماؤنٹ بیٹن کے خیال میں لائق علی کا صدارت عظمیٰ سے استعفیٰ بھارتی حکومت کے اطمینان کا باعث ہوگا۔ یہ وہی راگنی تھی جسے نہرو ذرا دبے فلسفیانہ انداز میں اور پٹیل اپنے اکھڑ طریقے سے کئی بار چھیڑ چکے تھے۔ اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے آقاؤں کی آواز کو دہرا رہا تھا۔ لائق علی نے جواب دیا کہ اگر اُنکی دست برداری سے حیدرآباد اور بھارت کے تعلقات میں کوئی بہتری کی صورت نکل سکتی ہے تو وہ فوری طور پر سُبکدوش ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اُن کے ہم وطن اور نظام یہ سمجھیں کہ سُبکدوشی وطن کے مفاد میں نہیں ہے تو وہ ایسا نہیں کریں گے۔ لائق علی کہتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کی گفتگو کے پیش نظر اُنہوں نے نظام سے یہ درخواست کی کہ اُنہیں سبکدوش کر دیا جائے۔ جسے نظام نے اُسی وقت مُسترد کر دیا۔

استصواب رائے کی پیشکش

۲ رجون کی ملاقات میں ماؤنٹ بیٹن نے لائق علی کو یہ تاثر دیا تھا کہ حیدرآباد کی پوری غیر مسلم آبادی الحاق کے حق میں ہے مگر مسلم اقلیت اس کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے اُس کی رائے میں الحاق کا فیصلہ جمہوری طریقہ سے ہونا چاہیئے اس پر لائق علی نے بالکل غیر متوقع طور پر استصواب رائے کی پیشکش کر دی۔ اس اچانک اقدام سے ماؤنٹ بیٹن کو بہت تعجب ہوا۔ مگر اُس نے اتنی اہمیت دی کہ اس بارے[2] میں منعقدہ لقاء کی رُوداد تیار کروالی استصواب رائے کی شرائط یہ طے پائی تھیں۔ (ا) استصواب رائے اس امر پر کہ حیدرآباد الحاق کرے

[1] میر لائق علی صفحہ ۲۰۳ TRAGEDY OF HYDERABAD
[2] میر لائق علی صفحہ ۲۰۶ تا ۲۰۸

یا آزاد رہے۔ (ب) استصواب رائے کے واسطے سے طویل مدت سمجھوتہ اُسی وقت مفید ہو سکتا ہے۔ جب حیدرآباد اور بھارت میں خوشگوار تعلقات ہوں اس لئے تعلقات کے فروغ کے لئے ایک عارضی سمجھوتہ ہونا چاہیئے۔ (پ) ایسے عارضی سمجھوتے کے لئے حسب ذیل اقدامات مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ (i) بعض عہدہ داران کا تبادلہ (ii) گورنر جنرل کا حیدرآباد جانا (iii) معاشی ناکہ بندی کا اٹھایا جانا (iv) مساوات کی بنیاد پر نئی حکومت کا قیام (v) نئی حکومت ۱۰ یا ۱۲ ارکان پر مشتمل ہوگی جس میں نصف بشمول وزیر اعظم اکثریتی فرقے میں سے ہونگے اور قلمدانوں کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر ہوگی (vi) تین ماہ میں مساوات کی بنیاد پر دستوری اسمبلی قائم کیجائے گی (vii) دستور ساز اسمبلی کے قیام تک موجودہ مقننہ کا اجلاس نہیں بلایا جائیگا۔ (viii) استصواب رائے کی نگرانی کسی بیرونی ادارے کے واسطے سے ہوگی۔ (ix) استصواب رائے کی تیاری میں پوری آزادی تقریر ہوگی اور سب کو ذرائع ابلاغ استعمال کرنے کا حق ہوگا۔ یہ فیصلہ لائق علی اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان ہُوا تھا۔ بھارتی حکومت کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اب تک بھارتی لیڈر جمہوریت کی باتیں کرتے تھے جب استصواب کی پیشکش ہوئی۔ تو وہ بغلیں جھانکنے لگے اور صاف کہدیا۔ کہ حیدرآباد کو بہرحال بھارت سے الحاق کرنا ہے۔ وہ استصواب رائے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اگر حیدرآباد کو عوام کی رائے معلوم کرنے پر اصرار ہے۔ تو پہلے الحاق کرلے۔ اور پھر..... رائے عامہ معلوم کرنے کا اپنا شوق پورا کرلے۔ اب کون اُن سے کہتا کہ الحاق کرنے کے بعد استصواب رائے کس بات کا؟ بھارتی حکومت کے اس ردعمل سے ماؤنٹ بیٹن اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ کشمیر میں اس حکومت نے کب استصواب رائے کرایا تھا جو حیدرآباد میں راضی ہو جاتی۔ مگر اس موقعہ پر استصواب رائے سے گریز سے یہ حقیقت واضح ہو گئی۔ کہ حیدرآباد کی رائے عامہ کے بارے میں اُسے وہ اعتماد نہیں ہے جسکا وہ دعوےٰ کرتی چلی آئی تھی۔ لائق علی کے بیان سے یہ تاثر ہوتا ہے۔ کہ یہ تجویز اچانک پیش کی گئی تھی اور اُسے نظام کی منظوری حاصل نہیں تھی بدرشکیب کی روایت یہ ہے کہ گویہ تجویز کا بنیر میں

پیش نہیں کی گئی تھی مگر یامین زبیری کی سرکاری رہائش گاہ پر جب اتحاد المسلمین[1] کے سربرآوردہ ارکان جمع تھے تو یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔ جس کی سب ارکان نے مخالفت کی تھی مگر قاسم رضوی نے لائق علی کو اس بارے میں اپنی مثبت رائے سے آگاہ کر دیا تھا۔

مذاکرات آخری دور

استصواب رائے کی تجویز کے ختم ہونے کے بعد مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔ ۹ جون کو شرائط مدات Paramountcy کے مسودے پر غور ہوا وہ شرائط یہ تھیں۔

(ا) امور خارجہ۔ دفاع۔ مواصلات سے متعلق معاملات پر حیدرآباد ایسے قوانین نافذ کرنے پر رضامند ہو۔ جنہیں بھارتی حکومت نافذ کرنے کی درخواست کرے اگر حیدرآباد کی حکومت ایسا نہ کرے یا بلاجواز تاخیر کرے تو حکومت بھارت کو اختیار ہوگا۔ کہ ایسے قوانین وہ خود نافذ کر دے .... حیدرآباد کی فوج ۲۰ ہزار سے زائد نہ ہوگی جسے بھارتی حکومت کو معائنہ کرنے کا اختیار ہوگا، ساری بے قاعدہ فوج بشمول تمام عسکری تنظیمیں اور ادارے ختم کر دیئے جائیں۔ بھارتی حکومت حیدرآباد میں بجز ناگہانی حالات کے اپنی فوج متعین نہ کر سکیگی۔ حیدرآباد کو کسی غیر ملک سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہ ہوگی البتہ تجارت کے فروغ کے لئے تجارتی نمائندے مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ جو بھارتی حکومت کے نمائندوں کی نگرانی میں کام کریں گے مسودے کے دوسرے حصے میں یہ بتایا گیا کہ اس کی تکمیل کے فوراً بعد ایک عارضی حکومت وجود میں آئے گی۔ جس میں وزیر اعظم سمیت ارکان کابینہ نصف غیر مسلم ہونگے۔ یہ عارضی حکومت یکم جنوری ۴۹ء سے پہلے دستور ساز اسمبلی کو طلب کرے گی۔ جسکا انتخاب پیشہ ورانہ بنیاد کی بجائے علاقہ وارانہ بنیاد پر ہوگا۔ اس اسمبلی میں ۶۰ فیصدی غیر مسلم ہوں گے۔ اس اسمبلی کے قیام کے بعد عارضی حکومت تحلیل ہو جائے گی اور ایک نئی کابینہ اقتدار سنبھالے گی جسے دستور ساز

[1] بدر شکیب حیدرآباد کا عروج و زوال صفحہ ۱۹۸۔

اسمبلی کا اعتماد حاصل ہوگا۔ مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی خطرات کے لئے برس کے لئے تحفظ دیا جائے گا۔ سرکاری ملازمتوں میں فرقہ واری تناسب رکھا جائے گا جو یکم جنوری ۱۹۵۶ء تک ساٹھ فیصد ہو جائے گا حیدرآباد کی طرف سے پیش کیا جانے والی ترمیم کو مینن نے بہت اچھالا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ انہیں منوانے کے لئے ماؤنٹ بیٹن کو دہرہ دون جانا پڑا اور سردار پٹیل نے اُس کی خصوصی اپیل پر ہی اپنی رضامندی کا اظہار کیا اُن میں ایک ترمیم Overriding Legislation کے بارے میں تھی۔ متبادل تجویز یہ تھی .... اگر حکومت حیدرآباد قانون کو منظور کرنے میں تاخیر کرے تو نظام اپنے اختیارات خصوصی سے اُسے نافذ کر دیں گے۔ دوسری ترمیم میں دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کا حصہ حذف کر دیا گیا۔ ۱۲ جون کو حیدرآباد کی کابینہ نے معاہدے کے آخری مسودے کے مندرجات پر غور کیا اور نظام کو مزید مندرجہ ذیل سفارشات پیش کیں۔ (ا) امور خارجہ دفاع اور مواصلات کی حد تک حیدرآباد میں متوازی قوانین رائج کر دیے جائیں گے۔ (ب) رضاکاروں کی فوجی اہمیت ختم کر دی جائے گی اور اس جماعت کو تدریجاً برخواست کر دیا جائے گا۔ (پ) فوج کی ۲۰ ہزار کی تعداد مان لی گئی۔ مگر یہ شرط عائد کی گئی کہ اگر اسلحہ اور گولا بارود کی بروقت سپلائی نہ ہوئی تو حیدرآباد کو اختیار ہوگا کہ وہ باہر سے درآمد کرے ایسی درآمد کی نقل و حمل پر بھارت کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ حیدرآباد کو کسی شکل میں اقتدار اعلیٰ منظور نہیں ہوگا (ٹ) حیدرآباد کی معاشی آزادی کی ضمانت ہونی چاہیئے (ث) ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے نظام کے فرمان میں اس کی صراحت ہونی چاہیئے کہ مجوزہ دستور ساز جماعت حیدرآباد کے لئے ایک ایسے جمہوری دستور بنائے گی جو حیدرآبادی روایات کے مطابق اور اُس بنیاد پر ہوگی جسے نظام اپنے صوابدید سے تجویز کریں۔ (ج) فریقین میں اختلاف کی صورت میں معاہدے میں ثالثی کی شق ہونی چاہیئے۔ جب ۱۴ جون کو حیدرآبادی وفد دہلی پہنچا۔ تو اُسے دو نئی باتیں بتائی گئیں۔ حیدرآباد کی فوج پر برطانیہ کے دور کی ریاستی فوج کی سکیم ۱۹۳۹ء کا قانون لاگو کر دیا گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ اقتدار اعلیٰ اس

شکل میں نافذ کر دیا جائے گا دوسرا یہ مطالبہ تھا کہ ہر قسم کے ناگہانی حالات میں حیدرآباد میں کسی جگہ بھی بھارتی فوج متعین ہو سکے گی۔ علاوہ ازیں بھارت حیدرآباد کو معاشی اور تجارتی آزادی کی ضمانت دینے میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ وہ اختلاف کی صورت میں ثالثی کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ نظام کے فرمان کے مسودے میں حیدرآبادی وفد کے علم کے بغیر مندرجہ بالا شرط (ث) "حیدرآباد کی روایات کے مطابق اور اس بنیاد پر جو نظام تجویز کریں" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔ بھارتی فوج کی تعیناتی کے بارے میں حیدرآباد کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ناگہانی حالات میں بھی فوج کی تعیناتی صرف سرحدی علاقوں میں ہو سکے گی۔ ان اختلافات اور بالخصوص معاشی آزادی کی ضمانت نہ دینے اور ثالثی کو نہ ماننے پر گفت و شنید کا انقطاع ہو گیا لائق علی کی روایت ہے کہ ان شرائط پر اصرار کرنے پر ماؤنٹ بیٹن نے غصہ میں زور سے میز پر مکہ مارا اور بڑے غیر مہذب رویّہ کا مظاہرہ کیا۔[1] ۱۸ جون کو نہرو نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ حیدرآباد یا اقتدار اعلیٰ منظور کرے یا الحاق۔ تیسری کوئی متبادل صورت نہیں ہے۔ اپنی تقریر میں اس نے بھارت کی فوجی طاقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ کہ وہ فوجی حملے سے آسانی سے یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ مگر فی الوقت وہ مفاہمت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ حیدرآباد کسی وقت بھی اس معاہدہ پر دستخط کر سکتا ہے۔

مرزا اسمٰعیل کی خفیہ سرگرمیاں

اس زمانہ میں افواہیں گرم تھیں کہ نظام نے مرزا اسمٰعیل سے بالا بالا رابطہ قائم کر رکھا ہے جس کے بارے میں انہوں نے حکومت کو کچھ نہیں بتایا۔ مرزا اسمٰعیل کے بارے میں شاید انہیں یہ خوش فہمی تھی کہ ان کا کانگریسی حلقوں میں بہت اثر ہے ممکن ہے کہ حالات کو سازگار بنانے کے لیے کچھ کر سکیں۔ اگر یہ رابطہ تھا تو کب سے۔ اس بارے میں صرف مرزا اسمٰعیل کی اپنی روایت پر ہی انحصار کیا جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں۔ کہ انہوں نے سب سے پہلے یکم مئی کو نظام کو لکھا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن کو حیدرآباد آنے کی دعوت دیں۔ تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل

Tragedy of Hyderabad

[1] میر لائق علی ٹریجڈی آف حیدرآباد صفحہ ۳۲۰۔

آئے۔[1] لیکن ماؤنٹ بیٹن حیدرآباد آئے نہ نظام ان کی دہلی جانے کی دعوت قبول کر سکے اس کے بعد نظام اور مرزا اسمٰعیل میں وقتاً فوقتاً خط و کتابت ہوتی رہی مرزا اسمٰعیل نے کبھی ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھے اور کبھی نظام سے التجائیں کیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح بھارت سے مفاہمت کر لیں۔ مرزا اسمٰعیل کہتے ہیں۔ کہ نظام نے ان سے کہا کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے مواہدید سے گورنر جنرل اور بھارت کے وزیر اعظم سے ملیں۔ جولائی کے آخری ہفتے میں مرزا اسمٰعیل دہلی گئے[2] ۔ وہاں اس وقت تک راجگوپال چاری گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ وہاں تبادلہ خیال کرنے کے بعد انہوں نے نظام کو لکھا کہ اقوام متحدہ میں حیدرآباد کا مسئلہ لیجانا دانشمندانہ اقدام نہیں اور متنبہ کیا۔ کہ حالات بجد کشیدہ ہو چکے ہیں اس لئے یہ بہت ضروری ہے۔ کہ لائق علی فوری طور پر دہلی آئیں تاکہ وہ ان کے ساتھ مل کر کوئی پیش رفت کر سکیں۔ لائق علی وہاں نہیں گئے۔ بلکہ انہوں نے حیدرآباد ریڈیو سے ایک بیان نشر کروایا۔ کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ مرزا اسمٰعیل نظام کے اشارے یا ایماء سے دہلی گئے ہیں۔ وہ وہاں بالکل اپنی ذاتی حیثیت میں گئے ہیں۔ لائق علی دہلی اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک کسی ذی وقار سمجھوتے کا امکان نہ پیدا ہو۔ ان سرگرمیوں کی اطلاع مجھے کراچی میں بھی مل گئی تھی۔ میرے استفسار پر صدر اعظم نے مجھے ہدایت کی کہ میں ان افواہوں کی سختی سے تردید کر دوں۔ کہ مرزا اسمٰعیل نے خفیہ سرگرمیاں شروع کی تھیں مگر انہیں مسترد کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مرزا اسمٰعیل نے زین یار جنگ کو اپنا قاصد بنایا اور نظام کو کہلایا۔ کہ اب حالات اتنا بدل گئے ہیں کہ متفقہ معاہدہ کالعدم ہو گیا ہے۔ لیکن اگر نظام فوری طور پر اسے منظور کر لیں۔ تو اب بھی وہ مسئلہ سلجھ سکتا ہے۔ ۱۷ اگست

[1] مرزا اسمٰعیل۔ My Public Life صفحہ ۱۰۹

[2] مرزا اسمٰعیل۔ My Public Life صفحہ ۱۱۳

کے خط میں مرزا اسمٰعیل نے نظام کو بتایا کہ انہوں نے دہلی میں سب واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ وہ نظام کے کہنے سے دہلی گئے ہیں وہ حیدرآباد کی طرف سے گفت و شنید کرنے کے موقف میں نہیں اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کی ذاتی حیثیت میں ہے حیدرآباد کے سفارتی نمائندے زین یار جنگ ان کے ہمراہ تھے جس سے غلط فہمیاں پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ ۳۰ اگست کے خط میں انہوں نے نظام کو بتایا کہ میں نے زین یار جنگ کی موجودگی میں کہا کہ اگر بھارتی فوج کو بلارم میں آنے کی اجازت دے دیں تو پھر الحاق[1] کی ضرورت رہے گی نہ کسی معاہدے کی مرزا اسمٰعیل نے بنگلور کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ فوج کی وہاں تعیناتی سے حکومت میسور کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ پہنچا اس طرح وہ بھی بلارم میں بھارتی فوج کو دو شرائط کے تحت آجانے دیں ایک شرط یہ ہونی چاہئے کہ فوج جہاں بھی تعینات کی جائے وہ علاقہ نظام کے حد اقتدار میں رہے گا اور دوسری شرط یہ ہے کہ یہ تعیناتی ایک محدود مدت کے لئے ہوگی۔ جس کے بعد وہ وہاں سے ہٹالی جائے گی۔ مرزا اسمٰعیل کی اس تجویز کو راجگوپالچاری گورنر جنرل نے اپنے خط مورخہ ۳۱ اگست میں بھی دہرایا۔ مرزا اسمٰعیل کی ان سرگرمیوں کے بارے میں جب لائق علی نے نظام سے ذکر کیا تو انہوں نے بہت جھنجھلا کر کہا کہ وہ اپنے شاہی اختیار تمیزی کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے۔ اس پر لائق علی نے نظام کو اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ نظام نے انہیں بلا بھیجا اور کچھ جھاڑ پلانے کے بعد اپنی جیب سے مرزا اسمٰعیل کے چند خطوط اور اپنے جواب ...... نکالتے ہوئے پوچھا ان کو پڑھ کر دیکھو ان میں کیا بات قابل اعتراض ہے۔ اس خط و کتابت میں لائق علی کے نقطہ نظر سے کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی۔ اس خط و کتابت کی اشاعت کی نظام نے اجازت نہیں دی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ریڈیو سے جو بیان نشر ہوا وہ انکے علم اور ایما سے ہی جاری ہوا تھا۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں۔ کہ یہ سب خفیہ کاروائیاں مرزا اسمٰعیل

[1] میر لائق علی۔ ٹریجڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۴۸ [2] مرزا اسمٰعیل۔ صفحہ ۱۲۲
Tragedy of Hyderabad

نے اپنی ذاتی حیثیت ہی میں کی تھیں مگر معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے حکومت بھارت کو اپنی حیثیت کے بارے صحیح صورت حال نہیں بتائی۔ ورنہ راجگوپالچاری اپنے خط مورخہ ۳۱ اگست کو مرزا صاحب کا ذکر کرتے ہوئے Who came here on your Exalted Highness's Encouragement and on your behalf. کے الفاظ استعمال نہ کرتے۔ ان خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے لائق علی کا استعفےٰ منظور نہیں ہوا[1] مگر زین یار جنگ کو جو ان میں بری طرح ملوث تھے ایجنٹ جنرل کے عہدے سے ہٹا دیئے گئے۔ اور مرزا اسمٰعیل کو دہلی سے واپس لوٹنا پڑا۔

[1] مرزا اسمٰعیل - My Public Life - صفحہ ۱۲۲

حصّہ دوم

نواں باب

ہیجانی دَور

ناکام مشن

جس مقصد سے میں نے فرضی نام سے ایک ایسا سفر کیا تھا جو میرے لئے انتہائی خطرناک ہو سکتا تھا - وہ بدقسمتی سے پورا نہیں ہوا - دورانِ سفر بھی حسب منشا نتائج حاصل نہ کر سکنے کا خدشہ میرے ذہن پر مستولی تھا - جب یہ خدشہ ایک حقیقت بن کر سامنے آیا تو میری پریشانی بہت بڑھ گئی ..... میں سوچتا تھا کہ میں ملک غلام محمد اور پھر قائداعظم کا سامنا کیسے کر سکونگا اور انہیں کیسے مطمئن کروں گا - ملک غلام محمد سے مل کر جب میں نے انہیں بتایا کہ متذکرہ امور کے بارے میں جو بھی انتظامات کئے گئے ہیں وہ حتمی ہیں اور اِن میں کسی ترمیم یا اضافہ کی گنجائش نہیں تو انہوں نے سخت برہمی کا اظہار کیا اور غصہ میں لال پیلے ہو کر کہا " معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی من مانی کرو گے ، اور اب اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے - ایسی صورت میں مجھ سے کسی قسم کی توقع نہ کرو " ذرا اندازہ لگائیے کہ ایک ایسا شخص جو میرے اور حکومت پاکستان کے درمیان میرے اہم مشن کی تکمیل کے لئے رابطہ کا ذریعہ تھا وہ اگر عدم تعاون کی بات کرے تو مجھ پر کیا اثر ہو سکتا ہے - میں نے انہیں دبی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ برابر غصہ میں جلی کٹی باتیں کرتے رہے دلچسپ بات یہ ہے - کہ وہ اپنی اس تلخ نوائی میں نظام - حکومت حیدرآباد کے اکابر بشمول میر لائق علی جن سے انکے گہرے دوستانہ تعلقات تھے پر سخت قسم کی تنقید کے تیر برساتے رہے - حیدرآباد کے نظم و نسق جس سے اُن کا بھی تین برس تک تعلق رہا تھا کو بھی نہیں بخشا - میں خاموش بیٹھا اُن کی یہ سب باتیں سنتا رہا - میری خاموشی جو ایک طرح سے انکے رویہ کے خلاف میرا احتجاج تھا وہ اور زیادہ برافروختہ ہو گئے اور

بڑی برہمی کے لہجہ میں کہا " تم گم سم کیوں بیٹھے ہو جواب کیوں نہیں دیتے ؟ " میں نے عرض کیا " میں نے اپنی حکومت کے ردِ عمل اور پالیسی سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے اس کے علاوہ میں کیا کہہ سکتا ہوں - اگر میں مزید کچھ عرض کرنے کے موقف میں ہوتا تو تب بھی مجھے یقین ہے کہ اس موضوع پر مزید گفتگو آپ کی ناراضگی کا باعث ہوگی " یہ سن کر وہ بلا کچھ کہے اٹھ کر چلے گئے ، چند لمحے انتظار کے بعد میں بھی واپس آ گیا - راستے میں میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا انتظام ہے - کہ خالصتاً ایک سفارتی کام میں مجھے وزیر مالیات کی پسند ناپسند اور رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور جس وزارت سے میرا تعلق ہونا چاہیئے تھا اُسے سرے سے کسی بات کا علم ہی نہیں - میں نے اس تلخ گفتگو کی روداد اُسی دن صدر اعظم کو بھیجدی - انہوں نے جواب میں تسلی دیتے ہوئے صبر و تحمل سے اس صورت حال کو برداشت کرنے کی تلقین کی اگلے دن میں قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا - اُن کے سوال کا کوئی معقول جواب دینا میرے لئے انتہائی دشوار تھا میں اپنی ناکام کوشش کی ناخوشگوار حقیقت کو بیان کرنے کے لئے موزوں الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ انہوں نے خود پہل کر کے میری مشکل آسان کر دی انہوں نے شاید میرے چہرہ ہی سے اپنی فراست سے صورت حال سمجھ لی تھی اور فرمایا " مجھے بتانے کی ضرورت نہیں .... مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کامیابی نہیں ہوئی " مجھے دبی زبان سے لامحالہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا - مگر اس کے ساتھ ہی میں نے عرض کیا " حضور نظام نے مجھ سے وعدہ کیا ہے - کہ وہ اس معاملہ میں میری عرضداشت پر غور کریں گے - " قائداعظم نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا " تم بالکل یقین نہ کرو - وہ تم کو بھی ویسے ہی ٹال رہے ہیں - جتنا کہ اب تک دوسروں کو ٹالتے آئے ہیں - " پھر ذرا سے توقف سے فرمایا " تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخ میں ایسے لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے جو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے فرار کی کوشش کرتے ہیں - " قائداعظم کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ سے میرے ذہن کو ایک شدید دھچکہ لگا - میں سوچتا تھا کہ کیا اس عظیم انسان کی دوررس نگاہوں نے

حیدر آباد کے مستقبل کو دیکھ لیا ہے۔ ایک سفارتی نمائندے کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں اکثر و بیشتر اپنے ملک کے بارے میں کڑوی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ یہ میرا مقصد تھا۔ کہ میں نے اُمت مسلمہ کے قائد کی زبان سے ایسی بات سُنی جس سے میں مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا یہ قائداعظم کے کردار کی عظمت تھی کہ اُس کے بعد انہوں نے پھر کبھی اس مسئلہ پر تبصرہ کیا نہ اس بارے میں کبھی پوچھا۔

حیدر آباد کے فوجی اور سول ملازمین کی واپسی میں رکاوٹیں

مئی ۱۹۴۸ء کے آخری دنوں میں مجھے پتہ چلا کہ حیدر آباد کے فوجی اور سول ملازمین کو جو پاکستان میں چھٹی پر آئے ہوئے ہیں۔ یا مختلف اداروں میں زیر تربیت ہیں۔ واپسی میں بمبئی سے لوٹا دیا جاتا ہے۔ جون میں اس رویہ میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ میں نے اس معاملہ میں بھارتی ہائی کمشنر سری پرکاش سے تعاون کی درخواست کی انہیں بتایا گیا۔ کہ یہ سب لوگ چھٹی پر آئے ہوئے ہیں یا زیر تربیت ہیں اور اب اپنی ڈیوٹی پر واپس جا رہے ہیں۔ یہ نئی بھرتی نہیں ہے۔ اس لئے انہیں اپنی ڈیوٹی پر واپس جانے پر روکنے کا کوئی جواز نہیں ہے انہوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ اپنی حکومت کو اس بارے میں توجہ دلائیں گے چند روز کے بعد سری پرکاش نے مجھے لکھا کہ اُن کی حکومت ان لوگوں کو سفر کی سہولت دینے کے لئے تیار نہیں۔ مگر مجھے ذاتی طور پر یقین دلایا۔ کہ اُن کی رائے میں یہ رویہ ناقابل فہم ہے اور اُس کا کوئی جواز نہیں سفارتی ذرائع سے جب یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ تو مجھے ان لوگوں کے لئے پاکستان میں ہنگامی انتظامات کرنے پڑے بڑا دشوار مسئلہ اُن کی رہائش کا تھا۔ اُنکی تنخواہوں کی ادائیگی اور اس سے متعلق مسائل بھی حل طلب تھے۔ فوجیوں کی رہائش کا مسئلہ کرنل سکندر مرزا سکریٹری وزارت دفاع کے تعاون سے حل ہو گیا انہوں نے ان لوگوں کو کراچی کے ٹرانزٹ کیمپ میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی مگر جب ان لوگوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو ٹرانزٹ کیمپ کی محدود جگہ بھی اپنی تنگ دامانی کی شکایت کرنے لگی۔ سول ملازمین تعداد میں بہت کم تھے اس لئے اُنکی رہائش کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا۔

رہائش کے انتظامات کے علاوہ ان دونوں قسم کے ملازمین کی تنخواہوں اور واجبات کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔ اس بارے میں میں نے حکومت حیدر آباد اور میجر جنرل العیدروس سے رجوع کیا۔ میجر جنرل العیدروس نے وعدے وعید تو بہت کئے۔ مگر کیا کچھ نہیں حکومت حیدر آباد کی طرف سے بھی اس معاملہ میں کوئی اقدام نہیں ہوا۔ میں نے اپنے محدود بجٹ میں سے اُن کی فوری ضرورتیں پوری کیں جب میرا محدود بجٹ ان سب لوگوں کے واجبات کے بوجھ کا متحمل نہ ہو سکا۔ اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے کاموں میں زیادہ وقت دے سکوں۔ تو میں نے انہیں اپنی خصوصی پرواز سے بھیجنا شروع کر دیا۔ اس سے یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ حفاظتی نقطہ نظر سے یہ اقدام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ہنگامی حالات میں خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ الحمدُللہ کہ یہ ساری کاروائی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔

تم انسان ہو یا بھیڑوں کا گلہ

جون کے آخری ہفتہ میں ایک دن قائداعظم نے مجھے طلب کیا اور حیدر آباد کی صورت حال کے بارے میں کئی چبھتے ہوئے سوالات کئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ انہیں وہاں کی خبروں اور حالات کا پہلے سے علم تھا اور میری کوئی بات اُنکے لئے نئی نہیں تھی۔ جب میں نے انہیں عوام کی اخلاقی حالت اور اعتماد نفس کے بارے میں اطمینان دلانے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میری باتوں سے قائل نہیں ہوئے وہ وہاں کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے واضح طور پر غیر مطمئن تھے گفتگو کے دوران وہ اچانک رُک گئے اور چند لمحات کے توقف کے بعد میری طرف دیکھ کر فرمایا "بعض لوگ مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ میں حیدر آباد کا کشمیر سے تبادلہ کر لوں۔ اس تجویز کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" اس سوال کا جواب دینا میرے لئے انتہائی دشوار تھا میں تو آزاد حیدر آباد کے موقف کی تشہیر اور اُس کے لئے حمایت حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔ میں کیسے کہہ دیتا۔ کہ وہ میرے وطن کا کشمیر سے تبادلہ کر لیں۔ ایسی کسی رائے کا اظہار میرے سفارتی اختیارات

سے تجاوز ہوتا اور یہ سمجھا جاتا۔ کہ آزادی کا ہمارا دعویٰ سودا بازی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس بات کا بھی مجھے احساس تھا کہ میں اُمت مسلمہ کے قائد اعظم کے سامنے بیٹھا ہوں اور مجھے ان کے سوال کا جواب کسی نہ کسی انداز میں دینا ہے میں ابھی

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کن الفاظ اور کس پیرایہ میں جواب دُوں کہ انہوں نے میری مشکل خُود ہی حل کر دی۔ اور سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت کو میری طرف اُٹھا کر اپنے سوال کا خُود ہی جواب دیدیا یہ کیا تم بھیڑوں کا گلّہ ہو جو میں ایک گلّہ کا دوسرے گلّہ سے تبادلہ کروں یہ بتانا تمہارا کام ہے کہ اس قسم کے تبادلے کے حق میں ہو یا نہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجبور نہیں کر سکتی جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ میں تمہیں مجبور تو کیا دوستانہ ترغیب دینے کے لئے بھی تیار نہیں۔ یہ سو فیصدی تمہارے فیصلے پر منحصر ہے۔" پھر ذرا سے توقف کے بعد فرمایا۔" میں جانتا ہوں کہ میرے سوال کا جواب تم اپنی حکومت سے مشورے کے بغیر نہیں دے سکتے اور نہ دینا چاہیئے۔ یہ بات اپنی حکومت کو بتاتے ہوئے میرا ردِ عمل بھی اُس پر واضح کر دینا۔" اس گفتگو سے مجھے وقتی طور پر ذرا پریشانی تو ہوئی۔ مگر اُس کے ساتھ یک گونہ اطمینان بھی ہوا۔ پریشانی اس لئے کہ مسلمانوں میں چند ایسے لوگ بھی ہیں جو ہماری آزادی کا سودا کرنے یا کرانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں اور اطمینان اس لئے کہ مسلمانوں کا یہ عظیم لیڈر جذبات اور احساسات رکھنے والے انسانوں کی اس قسم کی سودا بازی کا روادار نہیں۔ جس طرح اس نے بھارت کے مسلمانوں کے لئے خود ارادیت کا حق منوا کر ایک آزاد اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اُسی اصول پسندی کی بنا پر وہ گوشت پوست اور خون سے بنے ہوئے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کا گلّہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے قائد اعظم کی گفتگو کا خلاصہ اُسی دن حیدر آباد بھیج دیا۔ وہاں سے اس کا جواب سوائے خاموشی کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

بھارتی "بڑے لوگوں" کی سودا بازی

وسط جون میں ہمیں ایک قابل اعتماد بھارتی ذریعہ سے یہ پیشکش وصول ہوئی۔ کہ بھارتی حکومت کے ایک سربرآوردہ رُکن نے ایک مناسب معاوضے پر حیدر آباد کے مسئلے

کو کھٹائی میں ڈالنے کے لئے آمادگی ـ ـ ـ کا اظہار کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ اُن بزرگوار کو ہمارے موقف سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر جس خطرناک اقدام کے لئے اُن کی حکومت پر تول رہی تھی اُس پر عارضی طور پر ایک محدود مدّت کے لئے "بریک" لگانے کے لئے وہ آمادہ تھا اس پیش کش میں جو بظاہر بڑے معتبر ذریعے سے ہم تک پہنچی تھی کتنی صداقت تھی۔ ہندو ذہنیت کو جانتے ہوئے اس بارے میں کچھ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا یہ عین ممکن ہے کہ پیام پہنچانے والے بزرگ خود اپنا اُتو سیدھا کرنا چاہتے ہوں مگر جیسے دوسرے معاملات میں ہم نے داؤ لگائے ہوئے تھے۔ قوم کے اس نازک وقت میں مرتا کیا نہ کرتا کے اصول پر اسکو بھی آزمایا جا سکتا تھا اس سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی سی مہلت مل سکتی تھی۔ اس "کار خیر" کے لئے پچاس لاکھ کی "حقیر" رقم تھی۔ اس پیش کش کے بارے میں فیصلہ کرنے میں تاخیر ہو گئی اس طرح ایک ہفتہ کی مقررہ مدت گذر گئی اور معاملہ ختم ہو گیا۔

حیدر آباد سے بھیجے ہوئے سٹاف کی حرکتیں

مجھے کئی دنوں سے خبر مل رہی تھی کہ صدر اعظم کے مقرر کردہ سپیشل سٹاف میں سے ایک دو اشخاص ہوٹل میں بیٹھ کر کھُلم کھُلا غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں اور انہیں اس بات کا مطلق احساس نہیں ہے کہ وہ ایک اہم خُفیہ مشن پر ہیں جس کا اہم تقاضا راز داری اور احتیاط ہے۔ میں نے اُنہیں بلا کر سرزنش کی اور واضح کر دیا۔ کہ اگر انہوں نے آئندہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی تو انہیں فی الفور واپس کر دیا جائیگا اُن کی اس حرکت کی کسی طرح صدر اعظم کو بھی حیدر آباد میں اطلاع پہنچ گئی۔ انہوں نے بھی اُنہیں تنبیہ کرنے کا حکم دیا۔ مشکل یہ تھی کہ جن لوگوں کا اس انتہائی نازک اور حساس مشن کے لئے انتخاب ہُوا تھا ان میں کچھ تو نوعمر اور ناتجربہ کار تھے دوسرے غیر ذمہ دار قسم کے لوگ تھے جنہیں باتیں بنانا خوب آتا تھا اور یہی صفت شاید اُن کے انتخاب کی محرک تھی۔ اِن میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو سنجیدگی اور لگن سے وطن کے لئے اپنا فرض انجام دے جنہیں اپنے مشن کی اہمیت کا بھی اندازہ نہیں تھا جہاں احساس ذمہ داری کا فقدان ہو وہاں اُن سے کیا توقع کی جا سکتی تھی چنانچہ انہیں سے ایک شخص نے جو فوجی سامان کے ضمن میں حیدر آباد سے میری

مدد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ پھر وہی حرکت کی دوبارہ تنبیہ کی۔ مگر شراب کے رسیا اپنی زبان پر کب تک قابو رکھ سکتے ہیں جو یہ شخص اس کا اہل ہوتا میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرنے پایا تھا۔ کہ حکومت پاکستان نے مجھے اُس کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کی طرف توجہ دلائی۔ اس پر میں نے اُسے ایک کام کے بہانے سے خصوصی پرواز سے حیدرآباد بھیج دیا اور صدر اعظم سے گذارش کی کہ میں اُسے دوبارہ اس کام پر لینے کے لئے تیار نہیں اس طرح اُس ذات شریف سے میں نے اپنا پیچھا چھڑایا۔

قائد اعظم سے دستِ تعاون کی درخواست

گذشتہ ملاقات کے بعد خود اپنی درخواست پر قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ حیدرآبادی عوام اور خواص کے اعتماد نفس اور خوداعتمادی کے بارے میں انہیں ذرا تشویش تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حکومت ہر ممکنہ طریقے سے اُسے مضبوط بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُنکی حکومت کے تعاون سے خوراک اور دوائیوں کی قلت کچھ کم ہو گئی ہے۔ اور دفاعی وسائل بھی کسی حد تک مستحکم ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن میں بہتری کی ابھی کافی گنجائش ہے۔ گفتگو کے اس رُخ نے مجھے یہ عرض کرنے کا موقعہ دیا کہ اگر روزمرہ کی زندگی کی اشیاء کی فراہمی اور تیز ہو جائے تو ہمارے موقف میں استقامت اور عوام کی خوداعتمادی کو تقویت پہنچے گی۔ میری یہ بات سُن کر انہوں نے سوال کیا۔ "کیا لیاقت تعاون نہیں کر رہے ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ میری گزارش کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خان ہر ممکنہ مدد کر رہے ہیں؟" ..... اُن کی ہمدردی اور تعاون ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ لیکن قائد اعظم کی طرف سے ایک کلمۂ خیر ہمارے لئے موجب برکت ہوگا۔ اور بہت سے کام از خود مکمل ہو جائیں گے۔ میرے لئے یہ باعث اطمینان تھا کہ انہوں نے نوابزادہ سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا وعدہ فرما لیا۔ چنانچہ اگلے ہی دن لیاقت علیخان نے مجھے طلب کیا اور بہت سے معاملات کو جو مختلف وزارتوں میں اٹکے ہوئے تھے سلجھا دیا۔

٭

نامناسب رعائتیں

وزیر خارجہ کی طرف سے مجھے ہدایت ملی۔ کہ لندن میں ایجنٹ جنرل کے سیکریٹری اقبال چند کی اہلیہ اور اُنکی بہن مسز والٹر ہاکنگ کی معیت میں لندن سے حیدرآباد جا رہی ہیں۔ میں اُنکے لئے پاکستانی پاسپورٹوں کا انتظام کروں۔ اس قسم کے کاموں میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے اور بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ میرے مشن کی اہمیت کے پیش نظر ہر لمحہ قیمتی ہے اور تضیع وقت کا متحمل نہیں ہو سکتا غیر ملکی غیر مسلموں کے لئے پاکستان پاسپورٹ کا حصول یُوں بھی آسان نہیں ہے اس میں بہت سے پیچیدہ سوالات اور جرح کا جواب دینا پڑتا ہے۔ مزید بر ان مُلک کے نازک صورت حال کے پیش نظر ہر کس و ناکس کو جن کے سیاسی خیالات۔ رجحانات اور وفاداریوں کے متعلق سو فیصدی یقین نہ ہو۔ خصوصی مراعات نہیں ملنی چاہئیں۔

شر انگیزیاں

شر انگیز عناصر ہمارے مفاد کے خلاف افواہیں پھیلاتے رہتے تھے۔ جنکا بظاہر مقصد ہماری صفوں میں پست ہمتی اور بددلی پھیلانا ہے چنانچہ کسی نے صدر اعظم کو یہ خبر پہنچا دی۔ کہ مجھے ضروری اشیاء کی فراہمی میں دقت ہو رہی ہے۔ جسکی وجہ سے انکی ترسیل میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ غیر متعلق ذرائع سے پہنچنے والی خبروں پر حکومت کو کان نہیں دھرنے چاہیئے۔ ترسیل میں تاخیر اشیاء کی فراہمی میں دقت کی وجہ سے نہیں بلکہ رسل و رسائل کے ذرائع میں رکاوٹوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس طرح ..... انہیں کسی نے یہ افواہ بھی پہنچا دی ہے کہ میرے سٹاف کے ذریعہ راز افشا ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی انہیں دو تین بار یقین دلایا ہے۔ کہ راز کے سب کام میں اپنے بیٹے اور بڑی لڑکی کے تعاون اور مدد سے خود کرتا ہوں اس لئے کسی راز کے افشا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انہیں دراصل دہلی اور لندن کے بارے میں کوئی مؤثر قدم اُٹھانا چاہیئے جہاں ہندو سیکریٹریوں کے ذریعے سب باتیں باہر پہنچ جاتی ہیں۔ خطوط کے جواب میں تاخیر کے بارے میں بھی بار بار پوچھا جاتا ہے۔ میں صدر اعظم کے استفسارات کا جواب اُسی دن یا زیادہ سے زیادہ اگلے دن ضرور دے دیتا ہوں اس لئے یہاں کوئی تاخیر نہیں ہوتی۔ یہ علیحدہ ممکن

کہ بھیجے ہوئے جوابات بیچ میں سے غائب کر دئیے جاتے ہوں۔ یا اُن کی نقول حاصل کرنے کے لئے اُنکی خدمتیں تاخیر سے پیش کئے جاتے ہوں اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے۔ کہ ڈاک کی وصولی کے انتظامات کی کڑی جانچ پڑتال کی جائے۔

دستاویز ابیض کی اجرائی

مجھے یہ ہدایت ملی تھی کہ سیاسی مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں اپنا قرطاس ابیض ذرائع ابلاغ کو جاری کر دوں۔ اسبارے میں زین یار جنگ کی طرف سے اطلاع کا انتظار کر وں جن کے پاس اس دستاویز کے نسخے بھیجدئے گئے ہیں۔ اخبارات میں مذاکرات کے انقطاع کی خبریں برابر آرہی ہیں اور اُس کی تصدیق دونوں حکومتوں نے بھی کر دی ہے۔ مگر زین یار جنگ نے مجھے کوئی اطلاع نہیں دی۔ اور نہ ہی دستاویز کے نسخے بھیجے۔ تشہیر کا عام اُصول یہ ہے کہ اپنی بات کہنے میں پہل کی جائے۔ بعد میں دوسرے کی بات کی تردید کرنے یا وضاحتیں جاری کرنے سے کام نہیں بنتا۔ اس لئے دہلی سے اطلاع نہ آنے سے مجھے بہت تشویش تھی۔ زین یار جنگ سے براہ راست معلوم کرنے کے لئے میں نے اپنے ایک افسر کو دہلی بھیجا۔ وہ وہاں سے ..... بہت افسردہ ہو کر واپس آیا۔ اُس کا بیان تھا کہ زین یار جنگ نے اُس کے استفسار پر چھوٹتے ہی کہا وہ کون کہتا ہے کہ مذاکرات ختم ہو گئے ہیں۔" اس جواب کے بعد میں اُن سے دستاویز کی تشہیر کے ضمن میں کسی تعاون کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا۔ کہ محترمی سفیر صاحب اور حکومت کی سوچ و فکر میں ہم آہنگی نہیں اور وہ اپنی پالیسی چلانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے لئے یہ بات حیران کُن تھی۔ کہ حکومت کے ...... واضح اعلان اور ہدایت کے باوجود وہ اپنی من مانی کرنے پر تل جائینگے۔ خدا خدا کر کے چند روز کے بعد دستاویز کے نسخے دہلی سے میرے پاس پہنچ گئے۔ عام افواہ تھی کہ بھارت کی اپنی دستاویز عنقریب متوقع ہے۔ اس لئے ہماری دستاویز کی... فوری اجرائی ایک اہم ضرورت ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی ذمہ داری پر ۱۰ جولائی کو ایک مختصر نوٹس پر ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں کراچی پریس کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ بھارتی

پریس کے نمائندے موقعہ کا فائدہ اُٹھا کر غیر متعلق سوالات کریں گے۔ اس لئے میں نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا کہ اس کانفرنس کا مقصد دستاویز کی تقسیم اور اشاعت ہے۔ اگر اُس ضمن میں کسی نقطہ کی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں غیر متعلق سوالات کا میں جواب نہیں دُوں گا۔ دستاویز کے ساتھ میں نے اُس کی تلخیص بھی شرکا میں تقسیم کر دی جس میں رائے شماری کی پیشکش کا جلی حروف میں ذکر تھا۔ باہر کے ممالک کے صحافیوں کے لئے یہ بالکل ایک نئی خبر تھی اس سے اکثر چند سوالات جو ہندو مسلم آبادی کے تناسب کی روشنی میں حیدر آباد کے سیاسی موقف کے بارے میں الجھن کا باعث ہو سکتے تھے وہ غیر اہم ہو کر رہ گئے یہ پریس کانفرنس بہت کامیاب تھی اور بھارتی صحافیوں نے غیر متعلق سوال کر کے اُسے ناکام بنانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اُس میں انہیں بُری طرح شکست ہوئی ایک سوال کا جواب میرے لئے ذرا دشواری کا باعث تھا وہ یہ کہ دستاویز حیدر آباد یا دہلی میں کیوں جاری نہیں کی گئی۔ حیدر آباد و مختلف قسم کی موانعات اور رکاوٹوں کی وجہ سے مؤثر تشہیر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ میں اُن سے کیسے کہتا کہ دہلی میں ہمارا نمائندہ دستاویز کی اجرائی ہی کے خلاف ہے وہاں تشہیر کیسے ہوتی۔ ہماری دستاویز کی اجرائی بالکل بر وقت تھی۔ کیونکہ بھارت کی مجوزہ دستاویز میں رائے شماری کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ ہماری دستاویز کی اشاعت کے بعد اُسے دوبارہ ترتیب دینا پڑا اور اس کی اجرائی میں کئی ہفتوں کی تاخیر ہو گئی۔

حیدر آباد کی ناکہ بندی

بھارت کی طرف سے رسل و رسائل کے سب ذرائع پر پابندی بڑھتی جارہی تھی، ڈاک، ٹیلیفون، تار، ریل ہوائی جہاز ہر چیز کی ناکہ بندی تھی۔ ایسی صورت میں سوائے میرے خصوصی ذرائع کے اپنی حکومت سے رابطہ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے چند خطوط زین یار جنگ کے واسطے سے دہلی کے راستے سے بھیجے تھے۔ وہیں رکے پڑے رہے لامحالہ مجھے اپنے ایک افسر کے ذریعہ اُنہیں واپس منگوالینا پڑا دکن ایرویز کا ایک جہاز دہلی میں روک لیا گیا۔ زین یار جنگ کے ذریعہ اسے واگذار کرانے کی کئی بار کوشش کی گئی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ صدر اعظم کا خیال ہے کہ اگر حالات زیادہ خراب ہو جائیں اور زین یار جنگ کی اپنی پوزیشن بھی مخدوش ہو جائے تو وہ برطانوی ہائی کمشنر سے درخواست کریں کہ وہ

حیدرآباد کے مفاد کی ذمہ داری سنبھالیں۔ یہ محض خوش فہمی تھی کیونکہ برطانوی حکومت شروع ہی سے بھارت کی ہمنوا ہے۔ مجھے خود ذاتی طور پر کراچی میں اُنکے رویہ کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اگر اُن کا رویہ ٹھیک ہوتا تو یہ صورت حال ہی پیدا نہ ہوتی برطانیہ نے کس مرحلے پر ہماری مدد کی ہے جو اب کریگا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ سارا ہنگامہ ہی این ہمہ آوردہ تُست ہے۔ بہر حال میں نے اُنکی اس خواہش سے زین یار جنگ کو مطلع کر دیا ہے۔

قائدِ اعظم کے لئے ایک اہم پیغام

صدرِ اعظم کا ایک بہت ہی اہم پیغام جو ناگہانی صورت میں طریق کار کے بارے میں تھا لے کر میں قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر وہ زبانی پیغام سے مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا کہ جو بھی تجویز ہو وہ تحریری شکل میں آنی چاہیئے۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ تحریر مجھے مل گئی اور میں اُسے لیکر اُنکی خدمت میں زیارت میں حاضر ہوا۔ ہوائی جہاز ذرا لیٹ ہو گیا جس کی وجہ سے میں وقت مقررہ کے دو گھنٹے بعد پہنچا یہ ان کی فرض شناسی کا واضح ثبوت تھا کہ وہ اپنے آرام کے وقت ڈاکٹر کی واضح ہدایت کے خلاف میرے منتظر تھے۔ تحریر پڑھ کر انہوں نے اُس کے متن کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ صرف اتنا دریافت کیا کہ جن ذرائع سے وہ مجھ تک پہنچی ہے وہ کہاں تک قابلِ اعتماد ہیں۔ میرے اثبات میں جواب دینے پر انہوں نے فرمایا "دنیا میں کونسا ایسا کوڈ ہے جسکا راز افشا نہیں ہو سکتا۔ مناسب ہوتا اگر یہ تحریر کسی معتبر آدمی کے ذریعہ دستی بھیجی جاتی" پھر انہوں نے دو سطری جواب لکھوایا جس کا متن یہ تھا: "تم نے جو حکمت عملی اور طریق کار اختیار کیا ہے وہ ہی ایک باعزت راستہ ہے مستقل مزاجی اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ میری ہر ممکنہ حمایت تمہارے ساتھ ہوگی"۔

ناکہ بندی سے پیدا ہونے والی مشکلات

ناکہ بندی سے اب تک اشیائے ضروری کی فراہمی میں دشواریاں پیدا ہو رہی تھیں اور ہماری معاشی زندگی بُری طرح متاثر ہو رہی تھی اب جبکہ سیاسی مذاکرات کا دور ختم ہو گیا تھا ہماری خصوصی پروازوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی

تمام مواصلاتی ذرائع پر بندش کی وجہ سے ہم اُن کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اسلئے اُن کی تعداد میں اضافہ اور باقاعدگی وقت کی اہم ضرورت تھی دُوسرے ممالک کے سربراہان مملکت کے نام خطوط۔ اقوام متحدہ میں ہمارے مقدمے سے متعلق کاغذات کی ترسیل اور وفد کے ارکان کی آمد و رفت کا وہ واحد ذریعہ تھے۔ مگر دشواری یہ تھی کہ اُس تنظیم کا کرتا دھرتا ہماری ضروریات کو بھانپ کر فائدہ اُٹھانے کے لئے اور زیادہ اکڑ دکھاتا تھا مجھے اپنی زندگی میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے مگر ایسا شخص میں نے نہیں دیکھا تھا جو ہر وقت اپنے مفاد کی خاطر تمام اخلاقی اقدار سے کمال شانِ بے نیازی سے جب چاہے اپنے آپکو آزاد کرے۔ اُسکے ہر لمحہ بدلتے ہوئے مُوڈ کے پیش نظر کسی حتمی منصوبہ پر عمل کرانے کے لیے اُس سے بات منوانا انتہائی دُشوار تھا۔ اسلئے بہت سوچ کر میں نے اُسے وقتی طور پر موقعہ پر سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ دو تین نشستوں میں میں نے اُسی کا حربہ استعمال کرتے ہوئے اُسے ہوائی جہاز کے سپیئر پارٹس خریدنے کا لالچ دیا۔ جسے اُس نے کچھ لیس و پیش کے بعد مان لیا اور وہ لندن روانہ ہو گیا۔ اُسکے جانے کے بعد ساری تنظیم کا پورا چارج میں نے سنبھال لیا۔ اُسکے ساتھی پہلے ہی روپے پیسے کے معاملہ میں اُس سے نالاں تھے میں نے اُنہیں بھی کچھ لالچ دیا اور اُنہیں قابو میں کر لیا۔ اسطرح پروازیں حسبِ منشا آنے جانے لگیں۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ اس شخص کو جانتے بوجھتے ہوئے ایک مرحلے پر مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ اشیائے ضروری کی خرید و فروخت کے کام میں اُسے شریک کروں۔ میں نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور واضح کر دیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو سارا منصوبہ غارت ہو جائے گا۔ جس کے لئے میں ذمہ دار نہ ہوں گا علاوہ ازیں اُسے اپنے معاملات میں مواصلاتی نظام سے آگے بڑھ کر مزید ملوث کرنا میزبان حکومت کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ تب کہیں جا کر یہ تجویز جو مجھے یقین ہے۔ کہ اُسکے دوستوں کی شہ پر زیرِ غور آئی تھی خود بخود ختم ہو گئی۔

ونسٹن چرچل کے نام نظام کا خط

دار العلوم میں چرچل کی ایک تقریر کو پڑھ کر نظام نے اُنہیں ایک خط لکھا جسے کراچی سے لندن پہنچانا میری ذمہ داری تھی۔ بنظرِ احتیاط میں نے اُسے

تار سے بھیجنے کی بجائے ایک خاص آدمی کے ذریعہ لندن بھیجا وہاں ہمارے ایجنٹ جنرل میر نواز جنگ نے خود اُسے پیش کیا خط کا متن یہ تھا" دارالعوام میں آپکی تقریر میں مملکت حیدرآباد، میری ذات اور میری رعایا سے جس قلبی لگاؤ کا اظہار کیا گیا ہے اور انصاف اور سچائی کے حق میں جو باطل شکن آواز اُٹھائی ہے اُسکے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ کے اس جرأت مندانہ اقدام سے میں بہت پُر اُمید ہو گیا ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ آپ جیسے انصاف پسند اور مخلص دوستوں کے تعاون اور اخلاقی مدد سے اُن کڑی آزمائشوں میں سے جن سے کہ ہم دوچار ہیں کامیابی سے گذر سکیں گے۔ چرچل کا جواب اختصار کا شاہکار تھا انہوں نے صرف اتنا کہا کہ وہ اُنکے پیام کیلئے بیحد ممنون ہیں۔

برطانیہ کے دوسرے اکابر کے نام نظام کے خطوط

۴ر جولائی اور پھر ۱۹ر جولائی ۴۸ء کو نظام نے شاہ برطانیہ اور وزیراعظم کو حیدرآباد کے مسئلے کے بارے میں خطوط لکھے جو حسب معمول لیرے ذریعے سے کراچی سے بھیجے گئے۔ آخرالذکر خط میں نظام نے بہت جذباتی انداز میں برطانیہ سے اپنی دوستی اور تعاون کے معاہدات کا ذکر کیا اور اپنے خاندان کی دیرینہ دوستی کا واسطہ دے کر حیدرآباد کے نازک حالات میں تعاون اور حمایت کی درخواست کی۔ میرے ذریعہ سے تو اُس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ مگر لائق علی کی کتاب سے اشارہ ملتا ہے کہ گورنر جنرل راج گوپال چاری نے شاہ برطانیہ کا نظام کے نام خط اپنے نوٹ کے ساتھ[1] بھیجا تھا۔ اُسمیں کیا لکھا تھا اس کا پتہ نہیں چلا یوں بھی ایک دستوری حکمران اپنی گورنمنٹ کے منشا اور مرضی کے بغیر کیا کہہ سکتا تھا۔ البتہ ایٹلی نے اپنے خط مورخہ ۲۷ر جولائی میں کہا کہ چونکہ بھارت اور حیدرآباد کے مابین سیاسی مذاکرات سے انکا کوئی تعلق نہیں ہے اسلئے وہ کسی قسم کی مداخلت کے موقف میں نہیں ہیں پھر مظلوم کو ظالم سے تعاون کرنے کی ضرورت پر ایک لمبا لیکچر دیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سمجھوتے کی مسترد شدہ شرائط انکی رائے میں ایک معقول معاہدے کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اس حتمی رائے کے

[1] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۵۳ Tragedy of Hyderabad

بعد اُن سے مزید کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

مرزا اسمٰعیل

دہلی میں ہماری دستاویزات کی اجرائی سے گریز کا راز بالآخر فاش ہو گیا۔ مرزا اسمٰعیل جن کا حیدرآباد کی صدارت عظمےٰ پر تقرر قائداعظم کی شدید ناراضگی کا باعث بن گیا تھا پھر میدان میں آ گئے اور دخل در معقولات پر تُل گئے وہ کئی دن سے دہلی میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے زین یار جنگ کو اپنا پیامبر بنا کر نظام کے پاس بھیجتے رہے۔ بھارتی گورنر جنرل کی ایک دو بار میزبانی سے بھی نوازے گئے۔ بھارتی پریس نے اُن کی در پردہ کارروائیوں کو خوب اُچھالا۔ چنانچہ یہ خبر گشت کرنے لگی کہ اُن کی خفیہ سیاسی سرگرمیاں نظام کی شہپر ہیں جس کی وجہ سے لائق علی وزارت مستعفٰی ہونے پر مجبور ہو گئی۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ مرزا اسمٰعیل نے ۱۷ر جون ۱۹۴۸ء کو ایک مفاہمتی مسودہ قبول کرنے پر زور دیا جسمیں بھارتی فوج کے ایک دستے کی ریاست میں تعیناتی شامل تھی۔ مگر وہ کوشش ناکام ہو گئی۔ وزارت کی تبدیلیوں کا منبع بھی یہی خفیہ سرگرمیاں تھیں۔ اس صورتحال سے جس میں اُنکے ایجنٹ جنرل نے بھی اُنکے خلاف ایک غیر متعلق شخصیت سے ساز باز کر رکھی تھی لائق علی نے بیزار ہو کر استعفےٰ دیدیا۔ نظام نے انہیں اسپر ذرا سی جھاڑ[1] پلائی اور اُس موقعہ پر مرزا اسمٰعیل کے چند خطوط بھی اُنہیں دکھائے۔ مرزا کی خواہش یہ تھی کہ لائق علی دہلی جائیں اور اُن کے ساتھ بھارتی حکومت سے بات چیت میں شریک ہوں لائق علی کے استعفےٰ نے[2] صورت حال بدل دی اور مرزا اسمٰعیل کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اس واقعہ کے بعد اسمیں قطعاً کوئی شبہ نہیں رہا۔ کہ دہلی میں ہماری دستاویزات کی عدم اجرائی اور مذاکرات کی غلط کاری کی تلخ حقیقت کو چھپانے اور اپنی خفیہ سرگرمیوں کے لئے مہلت مہیا کرنا تھا یہ ایک المیہ ہے جو مسلمانوں کی تاریخ کے اس مرحلہ پر سنگدلانہ مذاق کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا نمائندہ اپنی حکومت کے واضح احکامات کے خلاف ایک غیر متعلق اور جانبدار شخصیت کے اشاروں پر کسی کارروائی کرنے سے گریز کرتا رہا بعد میں آنیوالے واقعات سے اس شبہ کی تصدیق ہو گئی کیونکہ تھوڑے ہی دنوں میں زین یار جنگ کو اپنے منصب سے سبکدوش کر دیا گیا۔

[1] لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد ۲۵۱ [2] لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۴۹
[3] Tragedy of Hyderabad ۲۸۵

اقوام متحدہ میں مقدمے کی پیروی کیلئے وفد کی تشکیل

سیاسی مذاکرات کے انقطاع کے بعد اقوام متحدہ میں مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب ہمارے وفد کی تشکیل کا مرحلہ درپیش تھا۔ سر والٹر مانکٹن بار بار مشورہ دے چکے تھے کہ وفد کے ارکان کا بڑی سوجھ سمجھ کے ساتھ انتخاب کیا جائے۔ ارکان وفد اور اُس کے سٹاف میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی قابلیت اور صلاحیت مسلمہ ہو اور جو اقوام متحدہ کے چارٹر اور اُس عالمی ادارے کے طریق کار سے پورے طور پر واقف ہوں تاکہ وہ صحیح طریقہ سے وفد کی رہنمائی کر سکیں۔ خواجہ سرور حسن سیکرٹری انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرس کراچی میری نظر میں اس کام کے لیے بہت موزوں تھے۔ خواجہ صاحب کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور بیرسٹرایٹ لا رتھے اور کراچی کے بین الاقوامی ادارے کے سیکرٹری ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی مسائل اور اقوام متحدہ کے منشور سے پوری طرح واقف تھے۔ پھر اُنکا بچپن اور جوانی حیدرآباد میں گذری تھی اس لئے اُنہیں مملکت حیدرآباد سے جذباتی لگاؤ بھی تھا۔ چنانچہ میں نے صدرِ اعظم کو اُنکے تقرر بحیثیت مشیر تجویز کیا۔ جسے صدر اعظم نے بہت پسند کیا اور تقرر کی منظوری فوری طور پر آ گئی۔ مگر اس انتخاب کو ظہیر احمد سکریٹری وزارت خارجہ اور نامزد سیکرٹری جنرل حیدرآبادی وفد نے کسی وجہ سے ناپسند کیا اور لندن کے ایجنٹ جنرل میر نواز جنگ کے ذریعہ مجھے پیغام بھجوایا کہ سرور حسن کو فی الوقت نہ بھجوایا جائے۔ ایک ایسی تجویز جسکی صدر اعظم نے منظوری دیدی تھی اُسے ایک ماتحت افسر التوا کے چکر میں کیسے ڈال سکتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر اُس التوا کی منطق کیا تھی۔ مقدمے کے کاغذات تیار ہو رہے تھے اُس مرحلے پر اگر مشیروں کی صلاحیتوں سے استفادہ نہ کیا گیا تو پھر کب کیا جائے گا۔ سرور حسن لندن کے لئے روانہ ہو چکے تھے اسلئے وفد کی تشکیل میں روڑا اٹکانے والی سازش ناکام ہو گئی لندن میں بیٹھ کر وفد کے کرتا دھرتا اپنی مرضی اور پسند کے مطابق مشیر مقرر کرنا چاہتے تھے اس ساری کارروائی کے پس پشت کیا عوامل تھے وہ بعد میں آنے والے واقعات سے واضح ہو گئے۔ سرور حسن جب بالآخر واپس آئے تو اُنہوں نے بتایا کہ ساری کارروائی راز میں ہوتی تھی اور اُنہیں کسی مرحلے

پر بھی کھلے دل سے اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ لائق علی کی خواہش تھی کہ سرور حسن کے ساتھ چودھری ظفر اللہ خان کے بھائی چودھری اسد اللہ خان بیرسٹرایٹ لا کو بھی وفد کے مشیروں میں شریک کیا جائے چنانچہ اُن کو اس مشن پر جانے کے لئے آمادہ کیا گیا۔ وفد کے سربراہ اور اراکین کے بارے میں ابھی کوئی تصفیہ نہیں ہوا۔ میں بار بار یاددہانی کرتا تھا۔ کہ وفد کی تشکیل جلد از جلد ہو جائے تاکہ مقدمے کے پیش کرنے .... تاخیر نہ ہو۔ مگر حیدرآباد سے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ لندن میں مشیر حضرات تو موجود تھے مگر سربراہ اور ارکان کی عدم موجودگی میں مقدمے کی تیاری میں بڑی دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ اس غیر یقینی صورت حال سے متعلقہ لوگوں کے اعصاب بھی متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ ظہیر احمد نامزد سیکرٹری جنرل حیدرآبادی وفد یہ سمجھ بیٹھے کہ میں تساہل سے کام لے رہا ہوں انہوں نے تلخی اور طنز سے بھرپور تار بھیجے مجھے افسوس سے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں نے تنگ آ کر اُسی زبان میں جواب دیا۔ اگر یہ بدحواسی نہیں تھی تو پھر کیا تھا کہ وفد کی تشکیل نہیں ہو پاتی۔ اُس کا کوئی پروگرام نہیں بنتا۔ بار بار پوچھنے پر جواب نہیں ملتا تو مجھے اس صورت حال کے لئے کس طرح ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ایسی بے یقینی کی حالت میں اگر متعلقہ لوگوں میں بدحواسی طاری ہو جائے اور بجائے اس کے کہ اصل کام کی طرف توجہ دیں۔ ایک دوسرے پر لعن طعن شروع کر دیں تو کیا تعجب ہے۔

ایک سنگین لغزش

اس ہیجانی دور میں میرے لئے سب سے زیادہ پریشان کن میری ایک ذاتی لغزش تھی جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک میرے ضمیر پر ایک بوجھ رہا۔ اگست کے وسط میں مجھے ہدایت ملی کہ میں کسی طرح کچھ ٹینک شکن حاصل کرنے کی کوشش کروں ابتک جو سامان جا رہا تھا وہ زیادہ تر چھوٹی نوعیت کا تھا۔ میں خود حیران تھا کیونکہ اس دور کی جنگوں میں چھوٹے اسلحہ کی افادیت محدود ہوتی ہے۔ بہرحال اب فوری طور پر ٹینک شکن کا مطالبہ تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا۔ کہ اگر اس بارے میں وزیر اعظم سے رجوع کیا گیا تو ٹکا سا

جواب مل جائے گا۔ کیونکہ دو تین بار میرے مطالبات پر گفتگو کرتے ہوئے پاکستان کی نوزائیدہ حکومت کے محدود وسائل کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔ لیکن جب دو تین بار تقاضہ ہوا تو مجھے مجبوراً اُن سے تعاون کی درخواست کرنی پڑی انہوں نے میری بات بڑے ٹھنڈے دل سے سنی اور فرمایا "مشتاق تمہیں یہاں آکر اب کئی مہینے ہوگئے ہیں صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ پھر بھی جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہاری فرمائش کو مسترد کرنا پڑے گا۔" انہوں نے یہ بات بڑے جذباتی انداز میں کہی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہیں ہماری ضرورت کا پورا احساس ہے مگر حالات سے مجبور ہیں میں بہت مایوس ہو کر لوٹا اور گھر پہنچتے ہی ایک اور تقاضے کو اپنا منتظر پایا۔ سہ پہر میں حسب معمول میں کرنل اسکندر مرزا سے ملنے گیا۔ اُنہوں نے خود ہی میری فرمائش اور نوابزادہ صاحب کے ردِ عمل کا ذکر کیا میں نے یہ سن کر کہا "تو کرنل صاحب آپ ہی کچھ کیجئے۔" انہوں نے جواب دیا "اس فرمائش کی پذیرائی یوں ہی مشکل ہے اور اب وزیراعظم کے انکار کے بعد تو "کچھ کرنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" یہیں میں لغزش کا مرتکب ہوگیا۔ میں نے بڑی چاپلوسی۔ خوشامد اور جذباتی انداز میں اپنی فرمائش کو دہرایا اور اُنکے اثر و رسوخ کا حوالہ دے کر اس معاملہ میں کسی نہ کسی طریقے سے کچھ کرنے کی التجا کی۔ مرزا صاحب ذرا موڈ میں تھے اور شاید میرے جذباتی انداز سے کچھ متاثر بھی ہوئے ہوں۔ بہر حال چند لمحات کے توقف کے بعد اُنہوں نے ٹیلیفون اُٹھایا اور احکامات جاری کر دیئے۔ اپنی درخواست کی اسطرح غیر متوقعہ طور پر پذیرائی ہوتے پر میں بجائے خوش ہونے کے پریشان ہوگیا کہ میں نے وزیراعظم کی مرضی کے خلاف اور منظوری کے بغیر اسکندر مرزا کے کمزوری کے لمحات میں اُن سے یہ کام کرالیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا چنانچہ راتوں رات مطلوبہ چیز حیدر آباد پہنچ گئی۔ اگلے دن سہ پہر میں وزیراعظم کے ہاں ایک استقبالیہ تھا۔ میں اپنی حرکت پر ندامت کے احساس کے ساتھ وزیراعظم سے منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔ انکو اس واقعہ کی اطلاع مل چکی تھی وہ میری تلاش میں تھے جب میں نظر نہیں آیا انہوں

نے نواب صدیق علی خان کی ڈیوٹی لگائی کہ مہمانوں کے جمگھٹے میں سے مجھے تلاش کریں۔ جب میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوا تو بجائے خفگی کے اظہار کے جسکا کہ میں بجا طور پر مستحق تھا، انہوں نے فرمایا "ایجنٹ جنرل صاحب۔ آپ کہاں چھپتے پھر رہے ہیں۔" پھر مجھے وہ ایکطرف لے گئے اور فرمایا "مشتاق و تم نے اسکندر مرزا سے اپنی بات منوالی۔ اُس کی تو خیر میں خبر لونگا مگر تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہارا طریق کار نامناسب تھا۔ تمہاری ضرورت کا مجھے بخوبی احساس ہے مگر اپنے مقصد کے حصول کے لئے یہ غلط طریق کار اختیار کرنا انتہائی نامناسب ہے" میں نے عرض کیا "میں اپنی حرکت پر نادم ہوں۔ اور مجھے شرمندگی کے ساتھ اعتراف ہے کہ میرا اقدام بالکل غلط تھا آپ جانتے ہیں کہ ضرورت مند اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر اندھا ہو جاتا ہے خاصکر جب یہ ضرورت وطن کی سالمیت اور تحفظ سے متعلق ہو۔ میرے اس غلط اقدام کا یہی ایک جواز تھا" میں نے بہت ادب سے معافی مانگی۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم شہید ملت لیاقت علی خان کا یہ اعلیٰ کردار۔ فراخدلی اور وسعت قلبی تھی کہ انہوں نے فرمایا "خیر جو ہوگیا سو ہوگیا مگر آئندہ ایسا نہ کرنا" اس طرح سستا چھوٹنے سے مجھے بڑا اطمینان ہوا اور ۲۴ گھنٹے سے جو میرے ذہن اور ضمیر پر بوجھ تھا وہ کم ہوگیا۔

لائق علی کا کراچی کا خطرناک سفر

حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے اقوام متحدہ کے لئے حیدر آبادی وفد کو بھارتی حکومت نے سفری سہولتیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سرحدوں پر فوجوں کا اجتماع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ حیدر آباد کو پاکستان کی طرف سے توقعات کا انتظار تھا میں نے متعدد بار پاکستان کے متوقعہ رویّہ کے بارے میں اپنے مراسلات میں تفصیل سے ذکر کر دیا تھا اور قائداعظم سے اپنی حالیہ اور آخری ملاقات میں اُن کا واضح جواب بھی پہنچا دیا تھا۔ مگر حیدر آباد میں برابر یہی خوش فہمی تھی کہ ناگہانی حالات میں پاکستان اپنے آپ کو اس قضیہ سے الگ نہیں رکھ سکے گا۔ صدر اعظم کی خواہش تھی کہ وہ قائداعظم کے بھیجے ہوئے جواب کے علی الرغم اپنے طور پر قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خان سے مل کر اس

بات کا پتہ لگائیں کہ وہ کہاں تک اُن سے عملی تعاون کر سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے ہماری ایک حکومتی پرواز سے آنے کا پروگرام بنایا کہ وہ صبح تڑکے کراچی پہنچیں اور ملک غلام محمد سے مل کر کوئٹہ جائیں اور اسی دن شام کو وہاں سے واپسی پر غلام محمد کی رہائش گاہ پر وزیراعظم لیاقت علی خان اور دوسرے وزرائے کرام سے تبادلہ خیال کریں اور اسی رات کو واپس حیدرآباد چلے جائیں۔ میں نے لائق علی کو مشورہ دیا کہ انکے مجوزہ سفر میں بیحد خطرہ ہے کیونکہ ایک تو ہماری پروازیں جن حالات میں وہ چل رہی ہیں از خود خطرناک ہیں پھر ایک ضدی اور لالچی قسم کے مہم جو کے جہاز میں سفر کرنا قرین مصلحت نہیں وہ شخص زیادہ قیمت وصول کر کے انہیں دشمن کے علاقے میں اتار سکتا ہے یا دوران سفر ناجائز دباؤ اور دھمکیوں سے اپنی مرضی منوا سکتا ہے۔ وہ کسی فرضی نام سے بھی نہیں آسکتے۔ کیونکہ جہازوں کا بیشتر عملہ انہیں پہچانتا ہے۔ اگر نہ بھی پہچانیں تو ہمارے مہم جو اور ہماری فوج کے انگریز افسروں میں جو غیر قانونی لاسلکی رابطہ قائم ہے اُس کے ذریعہ انکی شخصیت راز نہیں رہ سکتی۔ بہر حال لائق علی نے اپنے آنے پر[1] اصرار کیا اور ۲ ستمبر ۴۸ء کو کراچی پہنچے اور مقررہ پروگرام کے مطابق جس کی اطلاع میں نے حکومت پاکستان کو پہنچا دی تھی وہ کچھ کراچی میں رُکے اور پھر کوئٹہ گئے۔ قائداعظم کی صحت کی اس وقت جو حالت تھی اُس کے پیش نظر ڈاکٹروں نے انہیں ملنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ کوئٹہ سے بہت مایوس لوٹے۔ اگر انہیں قائداعظم سے گفتگو کرنی ہی تھی تو کاش وہ ذرا پہلے آجاتے۔ شام کو کھانے کے بعد غلام محمد کی رہائش پر وزیراعظم سے تبادلہ خیال ہوا اُس میں ملک غلام محمد کے علاوہ چودھری ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی صاحبان بھی موجود تھے۔ لائق علی نے جب پاکستان کی مدد اور عملی تعاون کی بات چھیڑی تو نوابزادہ صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا "میں نے وقتاً فوقتاً آپ کے ایجنٹ جنرل کو صورت حال بتا دی ہے۔ ہم ہر قسم کی مادی اور اخلاقی مدد دے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی بڑے اقدام کا فیصلہ قائداعظم ہی کر سکتے ہیں"۔ بڑی طویل

[1] لائق علی نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ اُن کے کراچی آنے پر مجھے اصرار تھا۔ یہ تاثر کسی غلط فہمی کی بنا پر ہے۔

گفتگو کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ ایک تفصیلی یادداشت قائداعظم کی خدمت میں پیش کی جائے جس وقت اُنکی طبیعت ذرا سنبھلے تو اُس پر اُن کے احکامات حاصل کئے جائیں اور اگر بدقسمتی سے قائداعظم کی طبیعت نہ سنبھلے تو وزیراعظم اپنے طور پر نہرو سے ذاتی اپیل کریں گے ۱½ بجے رات کو لائق علی واپس چلے گئے۔ صبح ۸ بجے اُن کی خیریت سے واپس پہنچنے کی اطلاع ملی تو تب جاکر مجھے ذہنی سکون نصیب ہوا۔

۱۰ ستمبر ۴۸ء ایک انتہائی مصروف اور پریشان کن دن

قائداعظم کی رحلت سے ایک دن پہلے یعنی ۱۰ ستمبر کو بڑی مصروفیت رہی۔ پہلی خبر بڑی پریشان کن تھی۔ یہ بتایا گیا بھارت نے ۱۱ ستمبر کو حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افواہ کی پیش نظر لائق علی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ بھارتی اکابر کے نام مجوزہ اپیل کے بارے میں کیا صورت ہے انہوں نے اُس کی فوری ضرورت پر زور دیا۔ کیونکہ اگر تاخیر ہوگئی تو یہ اپیل بے سود ہوگی۔ میں نے فوری طور پر وزیراعظم اور وزیر خارجہ سے رابطہ پیدا کیا اور لائق علی کا پیغام پہنچایا نوابزادہ لیاقت علی خاں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو ایک پیغام میں پُرامن سمجھوتہ کی ضرورت پر زور دیا جس کا جواب اگلے دن ٹال مٹول کی شکل میں وصول ہوا۔ ۱۰ ستمبر کو ہی نظام نے شاہ برطانیہ اور وزیراعظم اٹیلے کو پیغامات بھیجے۔ جسمیں بتایا گیا کہ باوجود انتہائی کوشش کے کوئی باوقار سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ بلکہ اب حالات نے اتنی نزاکت اختیار کر لی ہے۔ بھارت نے ایک گاؤں نانج اور ایک فوجی چھاؤنی پر حملہ کر دیا اور نہرو نے پارلیمنٹ میں سکندرآباد چھاؤنی پر قبضہ کرنے کی دھمکی دیدی ہے اگر اس دھمکی کو عملی جامہ پہنایا گیا تو اس کے نتائج انتہائی تباہ کن ہوں گے جن کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری برطانیہ پر ہوگی۔ اس تار کی ایک نقل حزب اختلاف کے قائد ونسٹن چرچل کو بھی بھیجی گئی۔ اٹیلے وزیراعظم برطانیہ نے نظام کو کیا جواب دیا۔ میرے پاس اُس کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ کیونکہ برطانوی اکابر کے نام پیغامات میرے توسط سے بھیجے جاتے تھے۔ مگر اُن کے جوابات براہ راست یا بھارتی گورنر جنرل کے ذریعہ بھیجے جاتے تھے۔

لیکن نظام کے جواب درجواب سے جو میرے توسط سے ۱۳ ستمبر ۴۸ء کو بھیجا گیا ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ کا وزیر اعظم اور حق و انصاف کی دعویدار لیبر پارٹی کا قائد یہ سمجھتا ہے کہ سب زیادتی ہماری طرف سے ہے اور بھارت کی سرحد کے اندر سب حملے بھی ہماری طرف سے ہوئے ہیں! کیا ستم ظریفی ہے کہ مظلوم کو ہی ظالم ٹھہرایا جائے اور کمزور ہی کو اپنی سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھایا جائے۔ نظام نے اپنے جواب میں بڑی دردمندی اور دلسوزی سے اٹیلے کی خدمت میں" پھر گذارش کی کہ وہ یک طرفہ بیانات پر کوئی رائے قائم نہ کریں اور یہ کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی رعایا اور وطن کے جائز تحفظ اور خود اختیاری کی حفاظت کے جذبہ کے تحت کر رہے ہیں اس سے پہلے نظام بھارت کے گورنر جنرل راجگوپالچاری سے اپیل کر چکے تھے کہ حیدرآباد کے نقطہ نظر کو نظر انداز نہ کیا جائے اور باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی جائے۔ [1] راجگوپالچاری نے اس اپیل پر غور کرنے کے بجائے پرانے مطالبات کو دھرایا اور مشورہ دیا۔ کہ وہ بھارتی حکومت کو حیدرآباد میں فوج متعین کرنے کی اجازت دیں اور دیگر مطالبات پر بھی غور کریں۔

وفد کا ہراول دستہ معین نواز جنگ کی سربراہی میں بالآخر پہنچ گیا۔ انکے ساتھ صرف شیام سندر ہے باقی اراکین کی آمد کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ معین نواز جنگ نے وزیر خارجہ اور سکریٹری وزارت خارجہ اکرام اللہ سے تبادلہ خیال کیا۔ معین نواز جنگ نے لائق علی کو میرے واسطے سے ایک پیغام بھجوایا ہے۔ جس میں اُن سے اپیل کی ہے کہ وہ ساری ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہ اٹھائیں اور ملک کی سالمیت کے تحفظ اور دفاعی انتظامات میں وہ دو وزراء کو اپنے اعتماد میں لے لیں۔ ان میں ایک فضل اللہ ہوں اور دوسرے اتحادی گروپ کے ایک وزیر یہ بات مجھے عجیب سی معلوم ہوئی۔ کیا ابتک وزراء کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا اور سارا نظم و نسق وہ تن تنہا چلا رہے تھے۔ عام حالات میں بھی کوئی وزیر اعظم سارے نظم و نسق کو نہیں چلا سکتا۔

---

[1] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۴۲ Tragedy of Hyderabad

ہنگامی حالات میں تو ایسی مرکزیت بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی پیغام میں انہوں نے صدر اعظم کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کو ایران اور افغانستان میں ہمارے مقدمے کی تشہیر کے لئے نامزد کر دیا جائے۔ حالات کے اس مرحلے پر اس تجویز کی افادیت فرامشتبہ تھی بہر حال میں نے اُن کا پیغام لائق علی کو پہنچا دیا ہے۔

پروازوں کے بارے میں ایک اور معاہدہ یوسف ہارون ہماری خصوصی پرواز سے حیدرآباد گئے تھے وہاں ان کا مزید پروازوں کے بارے میں ایک سودا ہو گیا۔ قلت وقت کی وجہ سے کوئی قانونی معاہدہ نہ ہو سکا مجھے پنسل سے لکھی ہوئی ایک یادداشت بھیجی گئی جس کے مطابق مجھے معاہدے کی تکمیل کرنا ہے اور اُسپر دستخط کرتے وقت ۱۵ لاکھ کی پہلی قسط انہیں ادا کرنا ہے DC ہ S کے اس انتظام کا مقصد ہماری موجودہ تنظیم کے انتظامات جو ناکافی ثابت ہو رہے ہیں تقویت پہنچانا ہے۔ اس معاہدے کی بعض شقیں بہت مبہم ہیں جن کی وضاحت حاصل کرنا ناممکن ہے اگر یہ لوگ ایسے وقت جب ہم موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہیں کچھ مدد دے سکیں تو شاید یہ خسارے کا سودا نہ ہوگا۔

حصہ سوم

پہلا باب

اقوام متحدہ میں حیدرآباد کا مقدمہ

وفد کی تشکیل اور اسکی آمد میں تاخیر | بھارت کی آئے دن کی دھمکیوں، معاہدہ انتظام جاریہ کی کھلم کھلا خلاف ورزیوں اور جارحانہ چھیڑ چھاڑ سے بیزار ہو کر حیدرآباد نے بالآخر اپنا مقدمہ اقوام متحدہ میں پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیکرٹری وزارت خارجہ ظہیر احمد اپنے مشیروں کے ساتھ مقدمے کی تیاری میں مصروف تھے ۲۱ اگست ۱۹۴۸ء کو اُسے باضابطہ طور پر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا گیا۔ اس فیصلے کی جب بھارتی حکومت کو اطلاع دی گئی تو اُس کا جواب یہ تھا کہ حیدرآباد کا قضیہ ایک گھریلو معاملہ ہے۔ حیدرآباد کو کسی بیرونی ادارے کے پاس رجوع کرنے کا حق ہے اور نہ کسی بیرونی ادارے کو اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ کرنے یا دخل دینے کا اختیار ہے۔ ماؤنٹ بیٹن لائق علی کو[1] پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اقوام متحدہ کے فورم میں حیدرآباد کو بھارت کے مقابلے میں کسی حمایت کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ اپنے جواب کے ساتھ بھارت نے فوجی حملے کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر آچکا ہے اس صورت حال کے پیش نظر ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حیدرآباد کا وفد موقعہ پر پہنچ کر مقدمہ کی تیاری میں رہبری کرتا سلامتی کونسل کے اراکین سے رابطہ پیدا کر کے انہیں اپنے موقف سے آگاہ کرتا اور عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی سعی کرتا۔ مگر ہوا یہ کہ وفد کی تشکیل میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی۔ وفد کی قیادت کے لئے کبھی کسی کا نام زیر غور آتا اور کبھی کسی کا۔ یہ اُسی قسم کی باہمی آویزش اور کھینچا تانی معلوم ہوتی تھی جو لائق علی وزارت کی تشکیل کے وقت پیش آئی تھی

---

[1] لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۱۹۷ Tragedy of Hyderabad

وفد کی روانگی دو تین بار آخری وقت پر ملتوی ہوئی۔ ایک دو بار تو اُس کے لیجانے کے لئے خصوصی پروازوں کا انتظام ہوا۔ مگر آخری وقت پر پروگرام کو منسوخ کرنا پڑا۔ اس غیر یقینی صورت حال اور پروگرام کی بار بار تبدیلی سے جہازوں کے لئے خدشہ پیدا ہو گیا۔ خدا خدا کر کے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو معین نواز جنگ کی قیادت میں یک رکنی وفد (شیام سُندر نمائندہ پست اقوام) کراچی پہنچا وفد کے دوسرے ارکان عبدالرحیم نمائندہ اتحاد المسلمین اور سری پت راؤ کے آنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ وہ بالآخر آ ہی نہ سکے۔ پانچویں رکن میر نواز جنگ[2] پہلے ہی سے لندن میں موجود تھے ۱۱ ستمبر ۴۸ء کو قائداعظم کا انتقال ہو گیا۔ اُنکی تدفین کے بعد قائد وفد اور شیام سندر کراچی سے روانہ ہوئے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ جس دن کونسل میں ہمارے مقدمے پر بحث کا آغاز ہوا۔ اُسی دن بدقسمت حیدرآباد نے ہتھیار ڈال دیئے یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب سیاسی مذاکرات قطعی طور پر جون میں ختم ہو گئے تھے تو پھر مقدمہ پیش کرنے میں تین ماہ اور کیسے اور کیوں لگ گئے وفد کی تشکیل اور پھر اُس کی روانگی میں کیوں اتنی دیر ہو گئی کہ اُس کے دو ارکان حیدرآباد ہی میں رہ گئے بھارت کی خواہش تھی کہ یہ مسئلہ اُسوقت تک زیر بحث نہ لایا جا سکے جب تک اُس کی مجوزہ کارروائی مکمل نہ ہو جائے۔ ہماری ناقابل فہم سست روی نے اُس کی اس چال کو آسان بنا دیا اور پھر بڑی طاقتوں کی سازشوں اور اس عالمی ادارے کے مجرمانہ تغافل سے وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔

سلامتی کونسل میں پہلا مرحلہ | ۲۱ اگست ۴۸ء کو مقدمہ پیش کر دیا گیا تھا اور تمام قانونی لوازمات کی بھی تکمیل ہو چکی تھی۔ وفد نے ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بھارتی وزیراعظم کے اس اعلان کے پیش نظر کہ حیدرآباد پر فوجی حملہ ہو گا۔ کونسل سے درخواست کی کہ اُس کے مقدمے کو فوری طور پر

---

[2] وفد کے ارکان کے جو نام جو میرے ریکارڈ میں درج ہیں اُن میں میر نواز جنگ کا نام شامل تھا۔ لائق علی نے اپنی کتاب ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۶ میں بھی یہی نام بتائے ہیں اس کے برخلاف لندن میں ایک حالیہ ملاقات میں میر نواز جنگ نے اپنی رکنیت کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا جس سے میں ایک شدید اُلجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

ایجنڈے پر لایا جائے۔ اگلے دن اُسے حملہ کی اطلاع دے دی گئی اور فوری کارروائی کے لئے درخواست کی گئی نیشلسٹ چین (چیانگ کائی شیک) کے نمائندے سیانگ نے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ۴ دن کے لئے اجلاس کے التوا کی تجویز پیش کی ارجنٹینا نے کسی قسم کے التوا کی سختی سے مخالفت کی۔ بالاخر یہ تجویز بھاری اکثریت سے مسترد ہوگئی اور حیدر آباد کا مقدمہ کونسل کے ایجنڈے پر لے لیا گیا۔ حیدر آباد کے نمائندے نے اُن جارحانہ اقدامات کا ذکر کیا جو اُس کے وطن کو بھارت سے الحاق پر مجبور کرنے کے لئے کئے جا رہے تھے اُس نے وائسرائے کے ۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء کے اُس بیان کا حوالہ دیا جو اُس نے ریاستوں کے نمائندوں کے اجلاس میں دیا تھا اور واضح طور پر کہا تھا کہ آزادیٔ ہند کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہندوستان کی سب ریاستیں اُن تمام قیوُد سے آزاد ہوں گی جو برطانوی دور میں اُن پر لاگو ہوتی تھیں اور انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی ہے اُس نے اُس پیشکش کو بھی دہرایا کہ دفاع۔ اُمورِ خارجہ اور مواصلات کی حد تک بھارت سے الحاق کا فیصلہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اقوام متحدہ کی نگرانی میں کرا لیا جائے۔ بھارتی نمائندے سر راما سوامی مدلیار نے کہا کہ حیدر آباد کو اقوام متحدہ جیسے بین الاقوامی ادارے میں یہ مسئلہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اُس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ۲۱ اگست ۱۹۴۸ء کو پیش کئے جانے والے مسئلے کا حیدر آباد پر فوجی حملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اُس کے خیال کے مطابق تصفیہ طلب معاملہ یہ ہے کہ ۲۱ اگست ۴۸ء کو جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو اُس وقت حیدر آباد کو اُسے پیش کرنے کا حق حاصل تھا یا نہیں۔ بھارتی

لہ لائق علی نے ٹریجیڈی آف حیدر آباد صفحہ ۲۴۴-۲۴۳ - راما سوامی مدلیار کی عام شہرت یہ تھی کہ اُس کا ذاتی رویہ حیدر آباد کے بارے میں ہمیشہ ہمدردانہ تھا اور ایک سے زائد مرتبہ لائق علی نے تجویز کی تھی کہ سر راما سوامی کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔ اُس کا ایک لڑکا جو مدراس کے ایک بڑے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ کھلم کھلا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلوں پر کڑی تنقید کیا کرتا تھا۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۸ء کو سر راما سوامی نے لائق علی کے پاس اپنا ایک نمائندہ شاہ برطانیہ کا نظام کے نام خط دے کر بھی بھیجا تھا جو گورنر جنرل راجگوپالاچاری کے واسطے سے آیا تھا۔ اس خط کا سر راما سوامی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر اس کارروائی سے یہ ظاہر تھا کہ اُسے حیدر آباد کے مسئلہ سے دلچسپی ہے۔ اب جب اُس کا تقرر حیدر آباد کے خلاف بھارتی نمائندے کی حیثیت سے ہوا تو سب کو بڑا تعجب ہوا اور سب خوش فہمی رفع ہو گئی

نمائندے کی تقریر کے بعد کونسل کے پریذیڈنٹ کے پوُچھنے کے باوجود کسی اور رکُن نے حصہ نہیں لیا اور نہ حیدر آباد نے بھارتی نمائندے کی تقریر کا جواب دیا۔ چنانچہ حیدر آباد کا مقدمہ ایجنڈے پر تو رہا۔ مگر ۲۰ ستمبر تک ملتوی ہوگیا۔ معین نواز جنگ نے اپنے ایک مضمون لہ میں بتایا ہے۔ کہ جنگ بندی پر غور کئے بغیر تنگیٔ وقت کی وجہ سے اجلاس ملتوی ہوگیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنگ بندی کی کوئی تحریک پیش کی گئی تھی؟ اقوام متحدہ کے ریکارڈ میں ایسی کسی تحریک کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سلامتی کونسل کے ارکان کو کاغذات کے مطالعے اور آپس میں صلاح مشورے کے لیے مزید وقت کی ضرورت تھی تو جارحانہ اقدام کو روکنے کیلئے جنگ بندی میں کیا رکاوٹ تھی۔

دوسرا مرحلہ اس اجلاس کے ملتوی ہونے کے بعد حیدر آباد کے وفد نے ۱۷ ستمبر کی صبح سے دوپہر تک کونسل کے ارکان سے فرداً فرداً رابطہ پیدا کیا اور اُن سے جنگ بندی کے حق میں رضامندی حاصل کی اور برطانوی نمائندے سر الیگزانڈر کیڈوگن نے۔ جو اُس وقت کونسل کے صدر تھے جنگ بندی کی تحریک خود پیش کرنے کا یقین دلایا اور اُس غرض سے ۱۷ ستمبر کی شام کو ہنگامی اجلاس بلانے کے لیے آمادگی کا اظہار کیا۔ لیکن اُسی دن حیدر آباد کا سقوط عمل میں آگیا اور صورت حال بدل گئی۔ ۲۰ ستمبر ۴۸ء کو اجلاس میں کونسل کے پریذیڈنٹ نے حیدر آباد کے سقوط کے بارے میں اخباری اطلاعات کا حوالہ دیتے ہوئے فریقین کے نمائندوں سے اصل صورت حال کی وضاحت کرنے کے لئے کہا۔ حیدر آباد کی طرف سے ظہیر احمد نے کہا کہ اُنہیں نظام کی طرف سے کوئی نئی ہدایات نہیں ملیں اور چونکہ نظام کی طرف سے حیدر آباد کے مقدمے کی پیروی نہ کرنے کی بظاہر خبر سے ایک اُلجھن پیدا ہوگئی ہے اس لئے شاید یہ مناسب ہوگا کہ چند روز کے لئے بحث کو ملتوی کر دیا جائے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب وفد کو کوئی نئی ہدایات نہیں ملی تھیں تو محض فریق مخالف کے ذرائع سے آنے والی افواہوں کی بنیاد پر بحث کو ملتوی کرا لینے کا کیا جواز تھا۔

لہ معین نواز جنگ مضمون حیدر آباد اور اقوام متحدہ شائع شدہ روزنامہ جسارت مورخہ ۱۱ دسمبر ۸۳ء

سر راماسوامی مدلیار نے حیدر آبادی وفد کے قائد کے نام نظام کا ایک تار پڑھ کر سنایا جو بھارت کے ایجنٹ جنرل متعینہ حیدر آباد کے واسطے سے وصول ہوا تھا جس میں حیدر آباد کا مقدمہ واپس لینے کی ہدایت تھی۔ بھارتی نمائندے نے زور دے کر کہا کہ یہ ہدایت نظام نے اپنی مرضی اور صوابدید سے دی ہے اور ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا اور نہ ہدایت دی جانے کے وقت حیدر آباد کی فوج حیدر آباد میں داخل ہوئی تھی۔ حیدر آباد کے وفد کے نام نظام کا تار بھارتی ایجنٹ جنرل کے توسط سے آئے اور اس کا متن کونسل میں بھارتی نمائندہ پڑھ کر سنائے یہ کیسی بوالعجبی ہے! امریکی نمائندے نے کہا کہ طاقت کے استعمال سے کوئی قانونی حق پیدا نہیں ہوتا۔ اور اُمید ظاہر کی۔ کہ فریقین کونسل کو حالات سے مطلع کرتے رہیں گے۔ بھارتی کمانڈر کے ایک پریس نوٹ کا حوالہ دیتے ہوئے اُس نے مزید کہا کہ حکومت امریکہ توقع کرتی ہے کہ حیدر آباد کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ بھارتی نمائندے نے کونسل کو یقین دلایا کہ حیدر آباد کے مسئلے کو گھریلو سمجھتے ہوئے وہ کونسل کو حالات سے آگاہ کرتے رہیں گے یہ وعدہ آخر وقت تک وعدہ ہی رہا۔ اور نہ ہی اس محترم عالمی ادارے نے اس پر اصرار کیا اس دن کی ساری بحث میں صرف آرجنٹینا نے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پیش کیا اور اس بات پر زور دیا۔ کہ بھارتی حکومت نے اپنی اس دلیل کا کہ حیدر آباد کو سلامتی کونسل سے رجوع کرنے کا حق نہیں ہے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا اگر اُسکے نمائندے کے مطابق نظام اور اُس کی رعایا حملہ آور فوج کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ تو وہ اس کو باور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کیونکہ جب ایک بھرا ہُوا پستول سینے پر اور فوجی جُوتا گردن پر ہو تو تعاون سے کیسے انکار ممکن ہے۔

تیسرا مرحلہ ۲۲ ستمبر ۴۸ء کو نظام نے سلامتی کونسل کے نام اپنے تار میں اطلاع دی کہ انہوں نے حیدر آباد کے دائر کئے مقدمے کو واپس لے لیا ہے۔ اسلئے اب حیدر آبادی وفد کو اس بارے میں مزید کارروائی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ۲۴ ستمبر کو معین نواز جنگ

نے سلامتی کونسل کو اطلاع دی کہ بھارتی نمائندے کے اس واضح بیان کے بعد کہ حیدر آباد میں جو کارروائی کی گئی ہے۔ اُس کا واحد مقصد امن وامان کی بحالی اور ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ حیدر آبادی عوام کی رائے معلوم کی جا سکے۔ بھارتی حکومت نے بڑے دُور رس انتظامی اقدامات کرنے شروع کر دیئے ہیں اور نظام کے تمام اختیارات کو سلب کر کے مارشل لا نافذ کر دیا ہے انہوں نے درخواست کی کہ ان حالات پر غور کرنے کے لئے کونسل کا فوری طور پر اجلاس بلایا جائے اور واقعات اور حالات پر کڑی نظر رکھنے کے لئے اقوام متحدہ کے مبصر مقرر کئے جائیں ۲۸ ستمبر کو کونسل میں حیدر آبادی وفد کے اسناد کے بارے میں بحث کا آغاز ہوا۔ کولمبیا کے نمائندے[1] کی یہ رائے تھی کہ کونسل کو فریقین کے نمائندگی کے اپنے پہلے فیصلہ کو نہیں بدلنا چاہتے اور اقوام متحدہ کو چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں کی زیادتی سے بچانے کی اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیئے شام کے نمائندے[2] کا خیال تھا کہ کونسل کو نظام کے تار کو اپنے کسی فیصلے کی بنیاد نہیں بنانا چاہیئے اور تجویز پیش کی کہ اصل حالات معلوم کرنے کے لئے کونسل کو اپنے کسی نمائندے کو بھیجنا چاہیئے۔ آرجنٹینا کے نمائندے ڈاکٹر آر[3] سے نے۔ کہا کہ بھارتی نمائندے نے جو واقعات پیش کئے ہیں وہ ایک طرح سے اقبال جرم ہے اور جہاں اقبال جرم ہو وہاں مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حیدر آباد میں امن وامان قائم کرنے کے دعوے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کونسل کو یاد دلایا کہ مسولینی نے اطالوی فوجوں کو ادیس ابابا کی طرف بھیجتے ہوئے بھی اس قسم کی باتیں کی تھیں کہ اطالوی حکومت کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں کے عوام کے سب مسائل بخیر و خوبی حل ہو جائیں گے۔ نیشنلسٹ چین کے نمائندے[4] نے کہا کہ نظام کے تار اور خط کے بعد حیدر آباد کے وفد کو

۱- سلامتی کونسل کے اجلاس کی روداد مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء
۲- " " " "
۳- " " " "
۴- سلامتی کونسل کے اجلاس کی روداد مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء

کارروائی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ پریذیڈنٹ نے بحث کے انداز کو دیکھ کر معین نواز جنگ کو بیان دینے کی اس شرط پر اجازت دی کہ وہ اسناد کے بارے میں وضاحت پر محدود ہونا چاہیئے۔ معین نواز جنگ نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ان کے بیان کو اس طرح محدود کر دینا ناانصافی ہے کیونکہ سب متعلقہ واقعات کو بیان کئے بغیر وضاحت ممکن نہیں۔ انہوں نے بڑے جرأت مندانہ انداز میں اعلان کیا کہ اس فیصلے پر اصرار کیا گیا تو وہ کوئی بیان نہیں دیں گے۔ اس پر پریذیڈنٹ نے وضاحتی بیان کی اس شرط پر اجازت دیدی کہ صرف واقعات بیان کئے جائیں۔ معین نواز جنگ نے اسناد کے بارے میں یہ دلیل پیش کی[1] کہ انہیں نظام نے ایسے وقت حیدرآباد کے مقدمے کی پیروی کے لیے مقرر کیا تھا جب وہ ایک بااقتدار اور بااختیار حکمران تھے اب جب کہ بھارت نے فوجی طاقت سے حیدرآباد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے اور وہاں نظام کے اختیارات کو سلب کر کے فوجی حکومت قائم کر دی ہے نظام کسی صورت میں آزاد نہیں سمجھے جا سکتے۔ اسلئے انکی طرف سے جو بھی تار یا تحریر وصول ہو وہ لازماً دباؤ کے تحت لکھی گئی ہوگی اور ان کی اپنی رائے اور مرضی کی ترجمانی نہیں کرتی اسلئے سلامتی کونسل کو انہیں کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ جہاں تک انکی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ اپنے وفد کے قائد کی حیثیت سے حیدرآباد کے مقدمے کی پیروی کا فرض انجام دیتے رہیں گے بھارتی نمائندے نے ایک بڑی ترش اور تلخ تقریر میں کونسل کو یہ باور کرانے کی بظاہر ناکام کوشش کی[2] گذشتہ دور میں نظام کو اپنے صوابدید سے کام کرنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ اپنے قول اور فعل میں آزاد نہیں تھے مگر اب وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں انکی اپنی آزادانہ رائے کا اظہار ہے۔ اُسنے اعتراف کیا کہ ریاست کے بعض عہدہ داروں کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معزول شدہ حکومت کی کارروائیوں میں بری طرح ملوث تھے۔ عوام کی

۱۔ سلامتی کونسل کے اجلاس کی روداد مورخہ ۲۸ ستمبر ۴۸ء

۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃

رائے معلوم کرنے کے بارے میں اُس نے کہا کہ بھارت نے اگست ۱۹۴۷ء میں اس کی پیشکش کی تھی مگر اُس وقت کی حکومت نے اُسے مسترد کر دیا تھا۔ دونوں فریقوں کے دلائل سننے کے بعد کسی فیصلے کے بغیر اجلاس ملتوی ہو گیا ۱۶ اکتوبر ۴۸ء کو بھارتی نمائندے نے کونسل کو اطلاع دی کہ چونکہ نظام نے حیدرآباد کے مقدمے کو واپس لے لیا ہے۔ مزید براں جب بھی کونسل میں اس مسئلہ پر بحث ہوتی ہے۔ بھارت پر بے بنیاد الزامات تراشے جاتے ہیں (یہ غالباً کولمبیا اور ارجنٹینا کے نمائندوں کے تبصروں کی طرف اشارہ تھا) اس لئے ان کے وفد کے قیام کا کوئی معقول جواز نہیں اور درخواست کی کہ کونسل اپنے ۱۶ ستمبر ۴۸ء کے حکم کو واپس لے لے۔

بحث میں حصّہ لینے کے لئے پاکستان کی درخواست

۱۷ اکتوبر کو وزیر خارجہ پاکستان نے سلامتی کونسل سے درخواست کی کہ حیدرآباد کے مسئلہ پر پاکستان کو بحث میں حصّہ لینے کی اجازت دی جائے۔ ۲۵ نومبر اور ۲ دسمبر کے اجلاس بھارتی وفد کی کونسل میں عدم موجودگی کے اثرات پر غور کرنے میں ختم ہو گئے۔ اس طرح بھارت نے اپنے وفد کو واپس بلا کر سلامتی کونسل سے عدم تعاون کیا۔ اور ایک مسئلہ جو سلامتی کونسل میں زیر غور تھا اُس پر بحث کو ملتوی کرا دیا۔ ۱۰ دسمبر کو بھارتی حکومت نے اقوام متحدہ کو اطلاع دی کہ چونکہ حیدرآباد میں حالات بالکل پُرامن ہیں اور حیدرآباد کا مقدمہ واپس لے لیا گیا ہے۔ اسلئے وہ اس مسئلہ پر بحث کے لئے اپنا کوئی نمائندہ مقرر نہیں کرے گی ۱۳ دسمبر کو اقوام متحدہ میں بھارتی نمائندے نے جواہر لعل نہرو کی ہدایت پر حیدرآباد کے بارے میں ایک یادداشت بھیجی جس میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہاں "سب اچھا ہے" اور کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس بات پر بھی خاص طور پر زور دیا گیا کہ بطور سربراہ ریاست نظام سے بڑے عزت و احترام کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ نمائندے صاحب نے نظام کے اختیارات کے سلب ہو جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور ابھی یہ موقعہ بھی نہیں آیا تھا کہ بھارت کے مرد آہن سردار پٹیل ایک سرکاری تقریب میں تپائی پر اپنی نیم برہنہ ٹانگوں کو اس طرح پھیلا کے بیٹھ گئے تھے کہ اُن کے گھٹنوں کا رخ

بیچارے معزول شدہ حکمران کی طرف تھا! وزیر خارجہ پاکستان نے ۱۰ ردسمبر کو جو درخواست کی تھی اُسپر سلامتی کونسل نے فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کو بحث میں حصّہ لینے کی اجازت دی جائے۔ پاکستان کی بار بار یاددہانیوں کے بعد ۱۹ رمئی ۱۹۴۹ء کو اجلاس بلایا گیا جسمیں بھارتی نمائندہ سے سر بینیگال راؤ نے اُن حالات کا ذکر کیا جس میں بقول اُن کے بھارتی حکومت کو اقدام کرنا پڑا۔ اُس نے کہا کہ یہ اقدام حیدرآباد کے عوام کے خلاف نہیں تھا بلکہ ایک ایسی پارٹی کے خلاف تھا جس نے اقتدار پر قبضہ کر رکھا تھا نمائندے نے یقین دلایا کہ اگر کونسل کو اگر کوئی مزید وضاحت کی ضرورت ہو۔ تو بھارتی حکومت اُسے مہیا کریگی لیکن اس مسئلہ کا بار بار زیر بحث آنا بھارت کے اندرونی معاملات میں انتشار کا موجب بنتا ہے اس کے جواب میں چودھری ظفراللہ خان وزیر خارجہ پاکستان نے ان سب دلائل کا منہ توڑ جواب دیا اور مسئلہ کے ہر پہلو پر بھرپور روشنی ڈالی۔ کونسل کے صدر نے مسئلہ کی مکمل تصویر پیش کرنے پر نمائندہ پاکستان کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے بعد یہ مسئلہ خاموشی کی بین الاقوامی سازش کا شکار ہوگیا۔

حیدرآباد کے مقدمے کی موجودہ پوزیشن حیدرآباد کے مقدمے کی موجودہ صُورت کیا ہے۔ اس بارے میں وقتاً فوقتاً قیاس آرائیاں ہوتی رہتی ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے جس کا وہ کھُلم کھُلا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں کہ ایجنٹ جنرل کے سفارتی عہدے سے میرا ہٹایا جانا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ پاکستان کی حد تک یہ مسئلہ ختم ہوچکا ہے۔ یہ مفروضہ اس لئے غلط ہے کہ نظام کے انتقال تک یعنی جنوری ۶۷ء تک پاکستان کی سفارتی فہرست میں میرا نام (مستقر سے غیر حاضر کے نوٹ کے تحت ہی سہی) برابر درج ہوتا رہا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے۔ (جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا) کہ میں بوجہ مجبوری کراچی سے لاہور چلا گیا تھا۔ بہرحال حیدرآباد کا مقدمہ ایک عالمی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ کسی ایک ملک کے ماننے یا نہ ماننے سے نفس مقدمہ پر اثر نہیں پڑتا۔ بعض لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اتنے عرصے تک یہ مسئلہ

کونسل کے ایجنڈے پر کیسے رہ سکتا ہے۔ ایسا سوچنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ کشمیر اور جوناگڑھ کے مقدمے حیدرآباد سے بھی زیادہ عمر رسیدہ ہیں حیدرآباد کے مقدمے کی موجودہ صُورتحال کے بارے میں میں نے اپنے طور پر کئی بار معلوم کرنے کی کوشش کی مگر شاید اسوجہ سے کہ اب میری اپنی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ ملک کے ایک ممتاز صحافی قطب الدین عزیز صاحب کے توسط سے[1] پتہ چلا ہے۔ کہ یہ مسئلہ ابھی ختم نہیں ہوا اور ابتک ایجنڈے پر ہے۔ یہ تو رہی اُس کی قانونی پوزیشن۔ لیکن میرے نزدیک ایک مقدمے کا ایجنڈا پر ہونا ہی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود اپنے مقدمے کو نہ بھول جائیں۔ اگر ہم اپنی آزادی کے دعوے میں مخلص ہیں تو ہماری طرف سے بھی کچھ عملی تگ ودو ہونی چاہیئے تاکہ دنیا کی نظر میں تو یہ مسئلہ زندہ رہے ہماری حب الوطنی اور خلوص کا امتحان مشکل حالات ہی میں ہوتا ہے۔ بقول شاعر

؎ یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

ہمارے مقدمے کا ایجنڈے پر ہونا اسوقت کارآمد ہوسکتا ہے جب ہماری آزادی جسکا ہم نے بہانگ دھل اعلان کیا تھا اور جس کا ذکر صدر اعظم نے اپنے آخری پیغام میں کیا تھا کی جدوجہد جاری رہے اگر یہ ختم ہوجائے تو مقدمے کا ایجنڈے پر ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ اسی سیاق وسباق میں یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ہمارا سکرٹری جنرل جس کی دستخط سے کونسل میں ہمارا مقدمہ پیش ہوا تھا وہ بغیر کسی وضاحت اور دُعا سلام کے اچانک رخصت ہوگیا اور فریق مخالف سے مل گیا۔ وفد کے ایک رکن کو اپنی رکنیت کے بارے ہی میں لاعلم ہیں۔ اسی ضمن میں وفد کے قائد کا ایک خط جو پیرس سے ۱۱ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھا گیا تھا۔ وہ حیدرآباد کے سقوط کے تین ماہ کے قلیل عرصے میں ہمارے اکابر کے سوچ[2] کے انداز کی ترجمانی کرتا ہے۔ میں اسپر تبصرہ نہیں کروں گا۔

---

[1] اقوام متحدہ کا مراسلہ بنام قطب الدین عزیز صاحب مورخہ ۲۰ ستمبر ۷۹ء ضمیمہ ۲۲ [2] ضمیمہ ۲۳

حصّہ سوم

دوسرا باب

حیدرآباد پر فوجی حملہ

اعصابی حملے مفاہمتی مذاکرات کے انقطاع کے بعد یہ صاف نظر آرہا تھا کہ جو چیز بھارت مذاکرات کی میز پر حاصل نہیں کرسکا۔ وہ فوجی کارروائی کرکے طاقت کے بل پر کریگا۔ اس اقدام سے پہلے اُس نے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے جو ایک کمزور ملک پر غاصبانہ قبضے سے پہلے بروئے کار لائے جاسکتے تھے۔ سب سے پہلے اُس نے معاہدہ انتظام جاریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ معاہدے کی کوئی شق ایسی نہیں تھی۔ جس کی کھلم کھلا خلاف ورزی نہ ہوئی ہو۔ سرحدوں پر فوجوں کا اجتماع کیا گیا تاکہ ملک میں ہراسانی پیدا کی جائے۔ باہر سے غنڈوں کو سرحدی علاقوں میں انتشار پھیلانے کیلئے بھیجا معاہدہ کےمطابق اسلحہ کی فراہمی سے گریز ہی نہیں بلکہ مکمل بندش کردی۔ نہرو اور پٹیل نے نظام کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں۔ سخت ترین معاشی ناکہ بندی کردی جسکی وجہ سے حمل ونقل کے لئے پٹرول اور تیل نایاب ہوگیا۔ پینے کے پانی کے لئے کلورین کی قلت کیوجہ سے شہروں میں ہیضہ پھُوٹ پڑا اور دواؤں کی درآمد میں رُکاوٹ کی وجہ سے علاج معالجہ دُشوار ہوگیا۔ زندگی کی روزمرہ کی بنیادی ضروریات پُوری نہ ہونے کی وجہ سے معاشی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی گئی اور خُفیہ طور سے کثیر تعداد میں ملک میں شرپسند بھیجے گئے تاکہ وہ اپنے ہتھکنڈوں سے دونوں فرقوں کی روایتی یکجہتی کو ختم کردیں اور تخریبی کارروائیوں سے نظم ونسق میں دُشواریاں پیدا کردیں۔

حملہ سے پہلے سرحدی چھیڑ چھاڑ : شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ فوجی اعتبار سے حیدرآباد

میں کتنی سکت ہے۔ فوجی دستوں نے سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ یوں تو ہر قسم کی کارروائیاں چھوٹے پیمانے پر کئی جگہ اور بار بار ہوئیں لیکن دو زبردست معرکے ایسے ہوئے جن سے حیدرآباد کو جو نقصان ہُوا سو ہُوا خود بھارت کو بھی غیر متوقع مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ایک واقعہ ضلع عثمان آباد میں نابخ کی کسٹم چوکی پر ہُوا۔ بھارتی مسلّح فوجی ایک کسٹم چیک پوسٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زبردستی گھس آئے اور لُوٹ مار شروع کردی۔ کسٹم انسپکٹر اور اُسکے ۲۲ آدمیوں کے دستے نے مزاحمت کی تو فائرنگ شروع کردی۔ کسٹم کے عملے کے چھ پٹھانوں اور ایک چوکیدار نے زبردست مقابلہ کیا اور ۳۳ بھارتی سپاہیوں کو ہلاک کردیا اور باقاعدہ مورچہ بندی سے کئی گھنٹوں تک ڈٹے رہے یہ مقابلہ اُس وقت تک جاری رہا جب بھارتی ہوائی جہازوں نے کسٹم چوکی پر بمباری کرکے مُزاحمت کرنے والے بہادر سپاہیوں میں سے ایک ایک کو شہید نہیں کردیا۔ دوسرا بڑا واقعہ بھارت میں گھرے ہوئے حیدرآبادی علاقوں میں آنے جانے میں رکاوٹ ڈالنے پر کوڈاڈ اور قاضی پور کے علاقوں میں خون خرابا ہوا۔ ان واقعات سے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ بڑا فوجی اقدام زیادہ دُور نہیں ہے۔

حملے میں غیر متوقع تاخیر کی وجہ وی۔پی مینن[1] نے بتایا ہے۔ کہ حیدرآباد میں امن عامہ کی صُورت حال سے بھارتی رائے عامہ بہت مضطرب تھی اور حیران تھی کہ کوئی سخت کارروائی کیوں نہیں کی جاتی۔ اُسکی نظر میں فوجی کارروائی کرنے میں تذبذب کی کئی وجوہات تھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کا خطرہ تھا۔ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں اس قضیہ میں پاکستان نہ کود پڑے۔ فوجی تیاری بھی ابھی مکمل نہیں تھی۔ میجر جنرل چودھری[2] فاتح حیدرآباد نے اپنی خفیہ ڈائری میں بتایا ہے کہ فروری ۴۸ء ہی میں بھارتی جنرل سٹاف کو حملے کا منصوبہ بنانے کی ہدایت کردی گئی تھی اور مارچ ۱۹۴۸ء میں تیار شدہ منصوبے کی منظوری دیدی گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مذاکرات کا سلسلہ نسبتاً اُمید افزا حالات میں آگے بڑھ رہا تھا۔

---

[1] وی۔پی۔مینن INTEGERATION OF INDIAN STATES [2] میجر جنرل چودھری۔ خفیہ ڈائری صفحہ ۲-۳ خفیہ ڈائری کا یہ پہلا پروف میرے پاس کیسے آگیا اسکی وضاحت دوسری جگہ کردی گئی ہے۔

سردوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

چودھری کی روایت کے مطابق وسط مارچ میں فرسٹ ڈویژن (بکتر بند ڈویژن) جسکے ذمہ یہ کارروائی کی جانے والی تھی کئی اعتبار سے اپنی تنظیم سے مطمئن نہیں تھی اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ فوجی گاڑیوں، نفری، مشینری اور ٹینکوں کی کمی تھی بکتر ڈویژن کے سگنلز کا شعبہ ابھی کشمیر سے واپس نہیں ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ تیاریاں مکمل ہونے میں کچھ وقت درکار تھا اسلئے حیدر آباد کو مذاکرات میں اُلجھائے رکھا گیا۔ اسی دوران جنرل چودھری اور بریگیڈیر وورما اس مہم کے لئے باقاعدہ نامزد کر دیئے گئے۔ جون ۱۹۴۸ء میں حملے کے ساتھ انتظامی معاملات کو سلجھانے کے لئے[1] سول ٹیم کا بھی انتخاب ہو گیا تھا اور منتخب عہدہ دار جنوبی کمان سے وابستہ کر دیئے گئے اور فوجی حملے کا نام "آپریشن پولو" بھی تجویز کر دیا گیا۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے اور کتنی پست ذہنیت تھی کہ حیدر آباد کے مقبول کھیل کا نام جسے انڈین آرمی کے افسر اچھے دنوں میں دوستانہ ماحول میں کھیلنے کے لیے مدعو کئے جاتے تھے ایک جارحانہ اقدام کے لیے اختیار کیا گیا۔ تذبذب کی ایک وجہ یہ خطرہ بھی تھا کہ حیدر آباد کی مبینہ ایئر فورس کہیں بھارت کے بڑے شہروں پر بمباری نہ کر دے۔ پھر کمانڈر العیدروس کی شخصیت تھی جسکے بارے میں ایک انگریز جنرل نے حیدر آباد کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ العیدروس کے ہاتھ میں غیر تربیت یافتہ دستے بھی فرنچ لیجن "بن سکتے ہیں یعنی وہ اپنے ملک کا دفاع اسطرح کر سکتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ سب باتیں آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھیں۔ حملے میں تاخیر کی اصل وجہ ایک منحنی نحیف و نزار شخصیت کی موجودگی تھی جس کے سینے میں قوم کا دل دھڑک رہا تھا۔ چنانچہ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھارت کے راستے سے یہ رکاوٹ دور ہو گئی جنرل چودھری نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ جب انہیں قائد اعظم کے انتقال کی خبر ملی تو ان کے افسروں اور جوانوں نے یہ سمجھا۔ کہ یہ سانحہ آنے والی مہم کے لئے ایک نیک[2] فال تھی۔ ادھر یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں ادھر ماؤنٹ بیٹن

[1] وی پی۔ مینن [2] جنرل چودھری ڈائری صفحہ ۲۹
The Integration of Indian States

نظام کو یقین دلا رہا تھا کہ نہرو اور اس کابینہ کے وزرا کسی قسم کا کوئی معاشی دباؤ نہیں ڈالیں
گے یہ ایک صریح غلط بیانی تھی۔ جب فوجی اقدام کا فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اگر معاشی دباؤ نہ بھی
ڈالا جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ فوجی تیاریوں کے سابقہ معاشی دباؤ کا پیچ بھی
برابر کسا جاتا رہا۔ نانیج اور کوداڈ کے واقعات کے بعد حیدر آباد نے اپنی فوج کو بنظر احتیاط
سرحد سے تین میل اندر بلا لیا تاکہ کسی اشتعال کی وجہ سے صورت حال خراب نہ ہو جائے

بھارتی فوج جو حیدر آباد پر حملے کے لئے متعین کی گئی

حیدر آباد پر حملے کے لیے جو فوجی نفری اور ساز و سامان نامزد کیا گیا اُس کی تفصیل جنرل چودھری کے بیان کے مطابق حسب ذیل[1] تھی۔

(۱) ایک بکتر بند برگیڈ جس میں پونا ہارس۔ تیسری کیولری اور ستر ویں ڈوگرا رجمنٹ کی
نویں بٹالین شامل تھی (۲) ساتویں انفنٹری برگیڈ جس میں تین انفانٹری بٹالین شامل تھیں
(۳) نویں انفنٹری برگیڈ جس میں تین انفنٹری بٹالین شامل تھیں (۴) مزید تین انفانٹری
بٹالین (۵) فیلڈ آرٹیلری کے تین رجمنٹ بشمول ایک اینٹی ٹینک رجمنٹ (۵) اٹھارویں
کیولری کا ایک ٹروپ (۷) ہیڈ کوارٹر بکتر بند ڈیویژن معہ ایک بکتر بند برگیڈ۔ اس کے علاوہ
فوج کی فیلڈ سروس کی نفری نامزد کی گئی تھی۔ تو یہ تھی وہ فوج جو ۷۰ اشرمن ٹینکوں اور
بھاری بھر کم جدید اسلحہ اور ہر قسم کی مشینری سے لیس ہو کر ایک کمزور ہمسائے پر "پولیس
ایکشن" کرنے چلی تھی۔ دنیا نے کبھی ایسی پولیس کارروائی بھی دیکھی ہے جو لاٹھیوں ڈنڈوں
اور آنسو گیس کے بجائے ٹینکوں اور دبابوں سے کی جائے! بھارت نے دنیا کو یہ عجوبہ
روزگار خونی تماشہ بھی دکھا دیا۔

حیدر آباد کی عسکری طاقت

حیدر آباد میں اسلحہ اور گولا بارود کی قلت کا کئی جگہ ذکر آ چکا ہے جس وقت بھارت حملے کے لئے پر تول رہا تھا تو بھارتی فوج

[1] جنرل چودھری ڈائری صفحہ ۱۰

کے اپنے اندازے کے مطابق حیدر آبادی فوج کی نفری حسب ذیل[1] تھی (۱) فوج باقاعدہ
۲۲ ہزار جو جدید اسلحہ سے لیس تھی اُس کے پاس ۸ ۲۵ پونڈز توپیں تھیں (۲) تین
بکتر بند رجمنٹیں[2] (۳) فوج بے قاعدہ ۱۰ ہزار جس میں صرف چوتھائی جدید اسلحہ سے لیس
تھی بقیہ کے پاس بھر مار بندوقیں تھیں (۴) مسلح عرب پائیگا ہوں اور جاگیرات کے سپاہی
(۵) پولیس اور کسٹم کے سپاہی ۱۰ ہزار (۶) رضا کار دو لاکھ جس میں صرف ۲ فیصدی جدید
اسلحہ سے لیس تھے۔ بقیہ کے پاس بھر مار بندوقیں۔ خنجر، تلواریں اور پرانی وضع کے دوسرے
ہتھیار تھے۔ فوج بے قاعدہ پائیگاہ اور جاگیرداروں کے غیر تربیت یافتہ سپاہی موجودہ
دور کی جنگ کے لئے قطعی طور پر بیکار تھے رضا کاروں کی صحیح تعداد کے بارے میں
قیاس ہی کیا جا سکتا ہے اگر اس بارے میں بھارتی فوج کا اندازہ صحیح بھی سمجھ لیا جائے۔
پھر بھی وہ غیر تربیت یافتہ تھے اور فوجی نظم و نسق جس کی جنگ لڑنے میں اشد ضرورت ہوتی ہے
وہ اُس سے بے بہرہ تھی اسلئے لامحالہ ۲۲ ہزار فوج باقاعدہ ہی بھارت کی جنگی مشین سے
برسر پیکار ہونے کے لئے موجود تھی اُس کے پاس ٹینک تھے نہ ہوائی جہاز۔ نہ توپ خانہ
اینٹی ٹینک اور اینٹی ایر کرافٹ اسلحہ سے بھی محروم تھی۔ باہر سے آئے ہوئے غنڈوں
کی سرکوبی کے علاوہ یہ ۲۲ ہزار فوج کمیونسٹ تحریک جو اُس وقت بڑے زوروں پر
تھی کی روک تھام کے لئے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر ایک وسیع علاقے
میں پھیلی ہوئی تھی۔ نفری کی کمی اور ناکافی ذرائع مواصلات اُس کی کارکردگی کو بری
طرح متاثر کر رہے تھے۔ کرنل عشاق[3] احمد نے جو اضلاع عادل آباد۔ کریم نگر ورنگل
اور نلگنڈہ کے بعض علاقوں کے انچارج تھے ان دشواریوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا
ہے وہ کہتے ہیں کہ اُنکے پاس لاسلکی سیٹ بہت کم تھے جس کی وجہ سے بٹالین ہیڈ کوارٹر

[1] جنرل چودھری ڈائری صفحہ ۱۴
[2] میر لائق علی ٹریجیڈی آف حیدر آباد وہ یہ کہتے ہیں کہ صرف ۱ بٹالین سے بھی کم ایسی فوج تھی جسے جدید طرز کی جنگ میں ملک کے دفاع کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو۔
[3] یاداشت کرنل عشاق احمد جو حیدر آباد فوج کے ایک تجربہ کار سینئر افسر تھے۔

کا کمیتی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر رکھنا بیحد دشوار تھا۔ اُس کے علاوہ ٹرانسپورٹ اور پٹرول کی کمی نے فوج کے حمل و نقل میں سنگین دشواریاں پیدا کردی تھیں کمیونسٹ تحریک سے نبٹنے کے لئے دیہاتیوں کے تعاون کی ضرورت تھی لیکن رضاکاروں نے بے قابو ہوکر ایسا اُدھم مچا رکھا تھا کہ آبادی کے جس طبقہ سے یعنی پست اقوام سے فوج کو جو تعاون مل سکتا تھا وہ بھی مخالف ہوگیا تھا۔ میدان جنگ میں حیدر آباد کی کارکردگی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان دونوں پہلوؤں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

کمانڈر العیدروس حیدر آباد کو اپنے کمانڈر سید احمد العیدروس پر بڑا ناز تھا۔ جب سے ایک انگریز جرنیل نے اُس کی تعریف کے پل باندھ دیئے تھے اُس کی قدر اور بڑھ گئی تھی اور اُس کی صلاحیتوں کا ہوّا آخر وقت تک قائم رہا۔ میں نے پاکستان میں اپنے عہدہ کا چارج لیتے ہی اپریل ۱۹۴۸ء میں صدر اعظم کو حکومت پاکستان کے ذمہ دار افراد کی اس رائے سے مطلع کر دیا تھا کہ العیدروس عسکری صلاحیت اور ملک سے وفاداری دونوں اعتبار سے اس منصب کے اہل نہیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھے بار بار اس بارے میں کہا۔ بالآخر ۷ مئی ۱۹۴۸ء کو میں نے دہلی جاکر بالمشافہ لائق علی سے اس کا ذکر کیا۔ مگر اس مشورے کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔ اور حیدر آبادی قوم آخر وقت تک العیدروس کی مبینہ عظمت اور عسکری صلاحیت کے گُن گاتی رہی۔ فوج کی نفری کا ناکافی ہونا۔ اسلحہ اور گولہ بارود کی کمی۔ ٹینکوں اور دیابون کا نہ ہونا اور فوجی افسروں میں جدید جنگ لڑنے کی تربیت اور تجربہ کا فقدان یہ سب آنکھوں کے سامنے تھا مگر کمانڈر العیدروس نظام اور صدر اعظم کو بار بار یقین دلا رہا تھا کہ وہ بھارتی یلغار کو تین ماہ تک روک سکتا ہے۔ انہی یقین دہانیوں کی بنا پر لائق علی کا اپنا اندازہ یہ تھا کہ اگر بھارتی فوج کو ۳ - ۴ ہفتے روک لیا گیا تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ بالآخر جولائی ۱۹۴۸ء کے آخری

[۵] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۳۷ Tragedy of Hyderabad

ہفتے میں العیدروس کی صلاحیتوں کے بارے میں تصویر کا دُوسرا رُخ نظر آیا۔ نظام سے لے کر صدر اعظم تک مایوسی اور افسُردگی کی فضا چھاگئی اور بدحواسی کے عالم میں مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ میں پاکستانی فوج کے کسی برگیڈیر کو اس ذمّہ داری کو سنبھالنے کے لئے آمادہ کروں! یہ بالکل ایک سعی لاحاصل تھی ایسے مرحلے پر جب دشمن سر پر کھڑا ہو۔ یہ کیسے ممکن تھا اور ایسا جری مرد کہاں سے مل جاتا جو اس نازک مرحلہ پر کانٹوں کا تاج پہننے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ لیکن خالصتاً حب الوطنی کے جذبے کے تحت چند حیدر آبادی نوجوانوں نے جو اُس وقت افواج پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اپنی نجی حیثیت میں رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں احسان فراموشی ہوگی اگر اُن کے اِس جذبہ کا اعتراف نہ کیا جائے جو انتہائی خدشہ مول لیکر وطن کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان نوجوانوں میں سب سے نمایاں افسر الملک کے خاندان کے ایک نوجوان سکندر علی بیگ تھے ان محبّ الوطن پاکستانی / حیدر آبادی نوجوانوں کے علاوہ حیدر آباد میں کوئی باہر کا فوجی موجود نہیں تھا۔ بھارتی ایجنٹ جنرل منشی کا[۱] یہ بیان کہ ۶ ستمبر ۴۸ء کو سڈنی کاٹن اور کراچی میں حیدر آباد کا ایجنٹ جنرل یعنی راقم الحروف پاکستانی فضائی افسروں کے ساتھ حیدر آباد میں موجود تھے قطعی غلط اور اُس کی ذہنی اختراع ہے موصوف نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ ہوائی جہازوں کے بغیر پاکستانی فضائی افسر وہاں کیا کر رہے تھے اور کراچی میں متعین ایجنٹ جنرل اس نازک مرحلے پر وہاں کس مشن پر گیا ہوا تھا منشی کی معلومات کی صحت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُسے میرا نام بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھا۔ اُس کی ڈائری میں میرا نام "مشتاق علی" درج تھا۔

فوج میں کوئی دوسرا اسٹینز افسر نہیں تھا حیدر آباد کی فوج میں کوئی دوسرا اسٹیفر

[۱] کے۔ ایم منشی The end of an Era

نہ ہونے کی یہ وجہ تھی کہ العیدروس اپنی کمانڈری کے دوران بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے سینئر افسروں کو جو اُس کی جگہ لے سکتے تھے بدول کرتا رہا۔ تاکہ اپنے ناگزیر ہونے کا بھرم قائم رہے۔ العیدروس کو صرف نواب چھتاری نے پہچانا تھا اُس کی صلاحیتوں کے بارے میں وہ مطمئن[1] نہیں تھے انہوں نے اپنے پہلے دور ہی میں اُسے رُخصت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اُس وقت کے برطانوی ریذیڈنٹ نے حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کی یقین دہانیاں کرتے ہوئے العیدروس کی کھلم کھلا حمایت کی۔ اس طرح وہ افواج حیدرآباد پر مستقل طور پر مسلط ہو گئے اُس کے بعد کسی کو اُسکے خلاف کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ حملے کے وقت لائق علی نے العیدروس کی غیر سنجیدہ سوچ کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اُس کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپریل و مئی کے مہینوں میں اُس کے بارے میں حکومت کی جو رائے تھی اسمیں اچانک تبدیلی کیسے آگئی حملے کے وقت بھی کمانڈر کو اصرار تھا کہ وہ بھارتی فوج کو تین ماہ تک روک لے گا۔ اُسے اپنی اس اطلاع پر بھی یقین تھا کہ حملے کی تاریخ ۲۰ ستمبر مقرر ہوئی ہے یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ اُسی وقت اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ کمانڈر مُلک کے بعض حصّوں کی جغرافیائی خصوصیات سے ناواقف ہے۔ دفاعی انتظامات کے لئے کوئی واضح منصوبہ نہ تھا۔ فوجی راشن اور محاذ پر گولہ بارود اور اسلحہ پہنچانے کا سارا انتظام انتہائی ناقص تھا۔ حملے کے تیسرے دن بد انتظامی کا یہ عالم تھا کہ فوجیوں اور رضاکاروں کے لئے قریبی شہروں[2] سے کھانا پک کر آتا تھا دو ہی دنوں میں کمانڈر العیدروس اپنی خود اعتمادی کھو کر ایک ذہنی مریض بن گیا تھا۔ جب کمانڈر کی ذہنی کیفیت ایسی ہو تو اُس کے ماتحت افسروں سے خود اعتمادی۔ جرأت مندی اور سوجھ بوجھ کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ ہر طرف خوف و ہراس اور ایک سراسیمگی کا عالم تھا

---

[1] یادداشت۔ خان بہادر اشفاق احمد سابق چیف سیکرٹری

[2] لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۹۳ Tragedy of Hyderabad

چنانچہ گو مگو کی حالت میں سڈنی کاٹن کے ایک آدمی کو جسے افشائے راز کو روکنے کے لئے چند روز کے لئے حیدرآباد بھیجا گیا تھا۔ ایک بریگیڈیر نے گولی مار کر ہلاک کر دیا یہ حرکت قطعی بلا جواز اور محض خوف و ہراس کا نتیجہ تھی اس افسر کے خلاف بعد میں بھارتی حکومت نے مقدمہ چلایا اور اُسے سزا بھگتنی پڑی۔ فوج کی اعلیٰ انتظامیہ کی اس ذہنی کیفیت کو دیکھ کر لائق علی کو صدر اعظم کی ذمہ داریاں چھوڑ کر فوجی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھنا پڑا[1]۔ اُس وقت اُنہیں احساس ہوا۔ کہ بار بار جتلائے جانے کے باوجود انہوں نے العیدروس پر اعتماد کر کے کتنی سخت غلطی کی ہے چنانچہ وہ اعتراف کرتے ہیں۔

"There was no time to accuse anyone of the neglect and folly. The real folly that had been committed in placing undue faith in the capability of the Army Commander. There was no redress for it now".

[2] جو کچھ اسلحہ باہر سے بھیجا گیا تھا اس میں سے بیشتر اُس وقت تک کھولا بھی نہیں گیا تھا دوسرے اسلحہ کے علاوہ مجھے اینٹی ٹینک کے حصول میں بڑی دقت ہوئی تھی اور میں بجا طور پر سمجھتا تھا کہ جس چیز کے لئے ہاتھ جوڑنے تک کی نوبت آگئی تھی اس کا بروقت استعمال ہو گا مگر لائق علی کہتے[3] ہیں کہ حملے کے دنوں میں ان توپوں کو ملٹری ہیڈ کوارٹرس میں جوڑ کر مشرقی محاذ پر بھیجا گیا۔ آخری وقت تک اُسکو تیار کرنے کے کام کو ملتوی کرنے کے بارے میں آخر کیا کہا جائے؟ اس بات کو یقین کرنے کو دل نہیں مانتا اور اُسکی آخر تاویل بھی کیا کی جا سکتی ہے کہ حملے سے دو ہفتے قبل جنرل العیدروس نے ایک بھارتی بریگیڈیر کو GOOD WILL کے نام پر اپنے مورچوں کا معائنہ[4] کرایا تھا اور اُس زمانے میں بیگم العیدروس کو منشی کی سفارش پر حکومت بمبئی نے

Tragedy of Hyderabad

[1] لائق علی ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۷۶

[2] " ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۷۶

[3] " صفحہ ۲۸۸

[4] یادداشت، خان بہادر اشفاق احمد سابق چیف سیکرٹری

دی ۔ آئی ۔ پی ۔ میزبانی سے نوازا تھا حملے سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے جب حیدرآباد کے انگریز چیف آف سٹاف نے برطانوی ہائی کمشنر کی ہدایت پر استعفےٰ دیدیا تو جنرل العیدروس فنِ حرب کے اس انگریز ماہر کی رہبری سے بھی محروم ہوگیا اس طرح حملے کے وقت جدید اسلحہ سے محروم کمزور فوج جس کے پاس ٹینک تھے نہ ہوائی جہاز ۔ اینٹی ایئرکرافٹ اور نہ اینٹی ٹینک توپیں تھیں ایسے کمانڈر کے تحت جس کی عسکری صلاحیت ہی نہیں ملک سے وفاداری بھی مشکوک تھی ۔ بکتربند ڈویژنوں ۔ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے نبردآزما ہورہی تھی !!

بھرپور فوجی حملہ

آخر وہ وقت آگیا جسے اتحادالمسلمین والے ایک انہونی بات سمجھتے تھے اور جسے حکومت حیدرآباد بھارت کی اندرونی مشکلات اور کشمیر کے تنازعے کی وجہ سے باور کرنے کے لئے تیار نہ تھی ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائدِ اعظم اللہ کو پیارے ہوگئے اور بھارت کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے جس موقع کی تلاش تھی وہ اُسے مل گیا مسلمان قوم ابھی اس عظیم صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ۱۳ ستمبر کو صبح ۴½ بجے بھارت نے اچانک بیک وقت ۲۲ سمتوں سے حملہ کردیا ۔ اُن میں سب سے بڑا حملہ شولاپور کی طرف سے اور دوسرا بیزواڑہ کی طرف سے تھا ۔ اہلِ حیدرآباد کو سب سے پہلی مایوسی اُس وقت ہوئی ۔ جب نلدرگ کے مقام پر شولاپور کی حملہ آور فوج کو روکنے کے لئے جو ڈائنامائیٹ نصب کئے گئے تھے اُن سے کام نہیں لیا گیا یہاں جو توپیں نصب تھیں غالباً GOOD WILL پر آنے والے بریگیڈیئر نے اُن کے صحیح مقام کا تعین کرلیا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی حملے میں ازکاررفتہ ہوگئیں ، اگر نلدرگ کا یہ پُل اُڑا دیا جاتا تو بھارتی فوج کے لئے ایک بڑی رُکاوٹ ہوجاتی ۔ مگر ایسا نہیں ہوا ۔ تھوڑی سی نفری نے بے جگری سے مقابلہ کیا اُس کے بعد حملہ آور فوج کے لئے راستہ صاف تھا ۔ چاردن کی غداری کی یہ افسوسناک ابتدا تھی ۔ اسی غداری کا اعادہ دریائے وردھا کے پل پر ہوا ۔ جو نفری اُسکو اڑادینے کے لئے متعین ہوئی تھی اُس نے اپنا فرض انجام نہیں دیا ۔

اس طرح صوبہ متوسط کی جانب سے آنے والی حملہ آور فوج کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا ۔ کثیر تعداد میں رضاکار فوجی ہیڈکوارٹرس میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے گئے ۔ اُن کو ذمہ داری سونپنے کے لئے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا گیا اور جنکو چُنا گیا انہیں مناسب ہتھیار بروقت نہیں دیئے گئے ۔ بعض رضاکار دستوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ انہیں موقعہ پر ہی ہتھیار فراہم کئے جائیں گے ۔ رضاکار دستوں سے بھارتی فوج سے کئی جگہ جھڑپیں ہوئیں ، مگر اُن کے نیم تربیت یافتہ دستے جن کا فوجی ڈسپلن سے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا ، کیا کرسکتے تھے ۔ بعض جگہ انہوں نے فوجی نظم کی خلاف ورزی کی ۔ مثلاً کرنل شفاعت[1] کہتے ہیں کہ کھامیٹ فرنٹ پر ایک رضاکار بٹالین متعین کی گئی تھی ، مگر صبح سویرے اندھیرے میں اچانک موقع سے غائب ہوگئی لیکن کئی جگہ رضاکاروں نے جم کر مقابلہ کیا ۔ فوجی نقطہ نظر سے ایک جگہ سخت مزاحمت ہوئی ۔ تنگبھدرا پر ایک پٹھان کپتان پائندہ محمد خان تھوڑی سی نفری کے ساتھ میسور آرمی کے تین میکانکی یونٹوں سے بھڑ گیا اور اُس کی ایک بٹالین کا صفایا کرکے مدراس کے علاقے میں داخل ہوگیا اگر آخر کب تک ؟ اس معرکہ میں صادق علی انجینئر مارا گیا اور پٹھان کپتان گرفتار ہوگیا ۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہے کہ اگر صحیح قیادت ملتی اور غداری نہ ہوتی تو بھارتی فوج اتنی آسانی سے قابو نہ پالیتی ۔ خان بہادر اشفاق احمد[2] کہتے ہیں کہ اس بہادر پٹھان کپتان سے انکی کوئٹہ میں ملاقات ہوئی تھی وہ اب بھی اپنی بہادری اور جراُت کی نشانی کے طور پر ایک گولی اپنے پیٹ میں لئے پھرتا ہے ۔

جنگی خبریں

لڑائی کے دوران خبروں کی ترسیل کا انتظام اطمینان بخش نہیں تھا اُن سے کسی واضح صورت حال کا سُراغ نہیں ملتا تھا مثلاً رائچور اور جالنہ کے بارے میں چوبیس گھنٹوں میں مجھے دو تین متضاد خبریں ملیں ۔ جن کی وجہ سے مجھے حکومت پاکستان ، غیر ملکی سُفرا اور صحافیوں سے بہت شرمندگی اُٹھانی پڑی ایسا لگتا تھا کہ سازشی عناصر

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل شفاعت جو اُس وقت حیدرآباد فوج سے متعلق تھے ۔

[2] یادداشت خان بہادر شفاق احمد سابق چیف سیکرٹری

جنرل چوہدری کی ڈائری میں دی گئی چند تصاویر

غلط اور متضاد خبریں بھیج کر اُلجھنیں پیدا کرنا چاہتے ہیں ایک خبر کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ مسلسل پسپائی کو فتح کے رُوپ میں پیش کیا جاتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ساری خبروں کا ماخذ جنرل العیدروس ہی کو کیوں سمجھ لیا گیا تھا اس کے بارے میں ساری خوش فہمیاں ختم ہونے کے بعد ابلاغ کے روائتی ذرائع سے کیوں استفادہ نہیں کیا گیا۔ اصل حقائق اُس وقت ظاہر ہوئے۔ جب بھارتی فوج دارالخلافہ حیدرآباد سے ۲۰ میل دُور رہ گئی۔ خود فریبی کا یہ عالم تھا۔ کہ آخر وقت تک اتحادی وزراء آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر عوام کو جان بوجھ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے رہے۔ کہ پاکستان سے ہوائی مدد آرہی ہے حالانکہ کابینہ پر کئی بار واضح کر دیا گیا تھا کہ پاکستان اس موقف میں نہیں ہے کہ وہ کوئی اس قسم کی مدد کر سکے۔ خان بہادر اشفاق احمد کی روایت[1] ہے کہ مجلس وزراء میں وہ جنگ کی خبریں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک دن جب ایک رپورٹ میں دشمن کی ۱۸ ہزار جانوں کے تلف ہونے کی اطلاع دی گئی تھی تو انہوں نے ذرا تعجب کا اظہار کیا تو اُن کی اس رائے پر بعض وزراء معنی خیز انداز میں مسکرائے یعنی تم کیا جانو ہماری فوج کیا کچھ کر سکتی ہے۔

۱۵-۱۶۔ ستمبر ۱۹۴۸ء ورنگل۔ بیدر اور اورنگ آباد پر اندھا دھند بمباری ہوئی۔ شولاپور کی طرف سے بیدر اور ظہیر آباد ہاتھ سے نکل گئے۔ شمال میں اورنگ آباد پر بھنی، جالنہ اور ہنگولی پر دشمن کا قبضہ ہو گیا محاذ سے مسلسل پسپائی ہو رہی تھی جواز یہ بیان کیا جاتا تھا کہ محاذ کا دائرہ تنگ کیا جا رہا ہے تاکہ دفاعی وسائل کا ایک محدود محاذ پر زیادہ موثر استفادہ کیا جا سکے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ دائرہ تنگ ہوتے ہوتے غائب ہی ہو گیا۔ تیسرے دن حالات کافی مخدوش ہو چکے تھے لیکن کمانڈر کا اب بھی یہی کہنا تھا کہ مغربی محاذ پر وہ ایک ہفتہ

[1] یادداشت۔ خان بہادر اشفاق احمد سابق چیف سکرٹری۔

یا اُس سے زیادہ عرصہ کے لیے بھارتی فوج کو روک سکتا ہے۔ مشرقی محاذ پر اُس نے اس بنا پر بے بسی کا اظہار کیا کہ اُسکے پاس کافی نفری نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جب دو دنوں میں اُس کی نفری ایک محاذ پر اتنی کم ہوگئی۔ تو پھر وہ کس برتے پر تین ماہ تک غنیم کو روک لینے کا دعوے کر رہا تھا۔ ۱۵ ستمبر کو صدر اعظم نے نہرو سے اپیل کی کہ وہ ایک مناسب اور منصفانہ سمجھوتہ کرکے توقع کے مطابق اس اپیل کا کوئی جواب نہیں ملا۔ نہرو کو جواب دینے کی ضرورت بھی کیا تھی جب وہ جو کچھ چاہتا تھا بزورِ شمشیر حاصل کر رہا تھا۔ نظام نے حکومت پاکستان سے اپیل کی۔ کہ لیاقت علی خان نہرو پر کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے زور ڈالیں اُس کا جواب بالکل نہروآنہ انداز میں ملا یعنی وہ تو سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہے۔ حکومت حیدرآباد ہی کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ حملے کے دوران حکومت کی طرف سے جو مجھے ہدایات وصول ہو رہی تھیں اُن سے بدحواسی ظاہر ہوتی تھی۔ مثلاً بھارتی فوج کے حیدرآباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کسی قسم کی اسلحہ کی فراہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ میں کہیں سے اور کسی طرح بمباروں کے ایک دستے کا انتظام کروں۔ بعض ایسی ہدایات بھی وصول ہوتی تھیں۔ جن پر عمل کرنا یا کرانا میرے اختیار سے باہر تھا۔ مثلاً ایک ہدایت یہ تھی کہ لندن کے ایجنٹ جنرل کو یہ پیغام پہنچا دوں کہ اگر حیدرآباد مغلوب ہو گیا تو دو لاکھ پونڈ شاہزادی دُرِّ شہوار اور ۵۰ ہزار پونڈ شاہزادی نیلوفر کو منتقل کردیں۔ اور لندن میں حیدرآباد ہوس کا قبضہ شاہزادی درِّ شہوار کو دیدیں۔ یہ رقوم منتقل ہوئیں یا نہیں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مگر اغلب یہی ہے۔ کہ نہیں ہوئیں۔ لیکن حیدرآباد ہوس کا معاملہ معلق ہی رہا۔ سقوط حیدرآباد کے بعد اُسی عمارت کا قبضہ بھارتی حکومت نے شاہزادی درِّ شہوار کو دیدیا یعنی جو کام ہمیں کرنا چاہیے تھا انہیں بھی بھارتی حکومت سبقت لے گئی۔

۵۴ لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۲۷۶ Tragedy of Hyderabad

حصہ سوم

تیسرا باب

سقوط حیدر آباد

قائد اعظم کی رحلت ادھر بھارتی استبدادیت حیدر آباد پر قابو پاتی جا رہی تھی اُدھر اُمت مسلمہ کے باپ اور محسن کی شمع حیات ٹمٹما رہی تھی جو بالآخر ۱۱ ستمبر کو گل ہو گئی۔ قائد اعظم کی رحلت مسلمانوں کے لیے بحیثیت قوم ایک عظیم صدمہ تھا لیکن حیدر آبادی مسلمان جو اس وقت انتہائی نازک حالات سے دوچار تھے اس حادثہ جانکاہ سے بالکل یتیم اور بے سہارا ہو کر رہ گئے۔ مرض الموت میں بھی اُس کمزور اور نحیف انسان کا وہ رُعب اور دبدبہ تھا کہ حیدر آباد پر حملہ کی پوری تیاری کر لینے کے بعد ہی بھارت آخری قدم اُٹھاتے ہوئے ہچکچاتا تھا جونہی اُس کی آنکھ بند ہوئی۔ بھارت نے اس سوگوار قوم کی بدحواسی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حیدر آباد پر بھرپور حملہ کر دیا یعنی جس موقعہ کی بھارت کو تلاش تھی۔ قائد اعظم کی وفات نے اُسے مہیا کر دیا۔

پاکستان سے اپیل نظام کئی بار شاہ برطانیہ اور وزیر اعظم اٹیلے کو مداخلت کرنے کی اپیلیں کر چکے تھے۔ مگر یہ کوششیں بے سود ثابت ہوئی تھیں اُن سے مزید رجوع کرنا بظاہر ایک کوشش لاحاصل تھی مگر اتمام حجت کے لئے پھر ایک بار دردمندانہ اپیل کی۔ اُسی دن نظام نے نوابزادہ لیاقت علی خان کو حملہ کی اطلاع دیتے ہوئے امداد کی درخواست کی۔ حیدر آباد کے مسئلہ کے بارے میں قائد اعظم کی خدمت میں جو وقتاً فوقتاً میں گذارشات پیش کیا کرتا تھا اور اُن کا جو ردِ عمل ہوتا تھا وزارت خارجہ کو اس کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا۔ لیاقت علی خان

کے نام اپیل کے آنے پر قائد اعظم سے اپنی بات چیت سے متعلق مجھے ایک یادداشت تیار کرنے کے لئے کہا گیا جو میں نے اُسی دن پیش کر دی۔ حیدر آباد سے مجھے بار بار ہدایت ہوتی تھی کہ حکومت پاکستان کو بھارت کو الٹی میٹم دینے کے لئے آمادہ کروں۔ حکومت پاکستان کا کیا ردِ عمل ہو گا اس کا مجھے علم تھا مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ میں نے لیاقت علی خان سے التجا کی کہ حیدر آبادی مسلمانوں کی موت و حیات کے اُس نازک مرحلہ پر کوئی فوری مؤثر اقدام کریں۔ انہوں نے نہرو کو اس مسئلہ کو افہام و تفہیم سے طے کرنا کا مشورہ دیا۔ جسے اُس نے مسترد کر دیا۔

حیدر آباد پر حملے سے پاکستانی عوام کا ردِ عمل قوم کے باپ کی رحلت کے صدمہ سے پاکستانی قوم ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ حیدر آباد پر حملہ ہو گیا۔ اس پر عوام کا شدید ردِ عمل ہوا۔ حملے کے دن سے میری رہائش گاہ پر صبح و شام لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جن میں عوام اور صحافیوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے۔ جن کا سیاست میں بڑا مقام تھا۔ ان لوگوں نے اظہار ہمدردی کے ساتھ مجھے یہ بھی باور کرایا۔ کہ وہ وزیر اعظم سے مناسب اقدام کرنے کے لئے بات کریں گے۔ ان میں چودھری خلیق الزمان اور مولانا عبدالحامد بدایونی بہت پیش پیش تھے۔ حملے کے تیسرے دن نوابزادہ لیاقت علی خان کی رہائش گاہ پر بڑا زبردست مظاہرہ ہوا۔ بعض لوگوں نے نوابزادہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ سب ہنگامہ میری شہ پر ہوا ہے۔ مجھے جیسے ہی اس کی خبر ملی۔ میں نے اُنکی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی میری سرشت کے خلاف ہے۔ مظلوم حیدر آباد کے نمائندے کی حیثیت سے میں التجا تو کر سکتا ہوں لیکن میزبان حکومت کے خلاف اس قسم کے مظاہروں کو قطعی نامناسب سمجھتا ہوں۔ چودھری خلیق الزمان اور مولانا بدایونی نے بھی اس مظاہرے سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ یہ مظاہرہ کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ عین ممکن ہے۔ کہ عوام کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ مظاہرے کی شکل بن گئی۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ

مفاد پرست عناصر نے سیاسی رقابت کی بنا پر نوابزادہ کو اُلجھن میں ڈالنے کے لئے کیا ہو۔ یا دشمن کے اشارے پر حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے موقعہ سے فائدہ اُٹھانا چاہا ہو یہ تو ظاہر ہے کہ اُس وقت کے نازک حالات میں بدحواسی میں کوئی عملی اقدام پاکستان کے لئے خطرے کا موجب بن سکتا تھا۔

آخری لمحے جب بھارتی فوج حیدرآباد شہر کے نواح میں پہنچ گئی۔ تو تلخ حقیقتوں سے گریز کرنے والی مجلسِ وزراء میں سراسیمگی پھیل گئی۔ مگر اس حالت میں بھی اُس نے پاکستان سے ملنے والی امداد کا بھرم قائم رکھا۔ حملے سے دو تین روز قبل ایک وزیر اکرام اللہ بلا اطلاع "پاکستان کی رائے عامہ کو ہموار کرنے" کے بہانے سے ہماری ایک ہنگامی پرواز سے کراچی پہنچ گئے۔ وہ میرے ساتھ ایکبار وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر تو ضرور گئے مگر دوران گفتگو پورا وقت خاموش رہے۔ اور ایک لفظ نہیں بولے۔ اسکے بعد انہوں نے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے اس کی وضاحت وہی کر سکتے ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر لانا ضروری ہے کہ جہاں دوسرے وزراء سخت پریشانی کے عالم میں تھے لائق علی اور قاسم رضوی کو آخر وقت تک اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول رہا اور دونوں میں سے کسی نے بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کیا لائق علی کا بیان ہے کہ وزیر عبدالرحیم نے اُن سے درخواست کی تھی[1] کہ بھارتی حکومت کے انتقام سے بچانے کے لئے قاسم رضوی کو باہر کسی ملک میں بھجوا دیں۔ انہوں نے کوشش بھی کی۔ مگر اُس وقت یہ ممکن نہ تھا۔ حملے کی خبر ملتے ہی بھارت کے ایجنٹ جنرل منشی کو اُس کی رہائش گاہ سے ایک مہمان خانے میں منتقل کر دیا گیا جہاں اُسکے آرام کا پوری طرح سے خیال رکھا گیا اور ہر ممکنہ سہولت بہم پہنچائی گئی۔ دن میں ایک یا دو بار چیف سیکرٹری اُس سے ملنے جاتے رہے۔ ایک پابندی البتہ یہ تھی کہ صدر اعظم اور چیف سیکرٹری کی اجازت کے بغیر وہ کسی سے نہیں مل سکتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس پابندی کے باوجود وہ اس دوران

---

[1] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۳۰۲ Tragedy of Hyderabad

نظام سے مفاہمت کی باتیں کرتا رہا۔ یہ اسلئے ممکن ہوا۔ کہ وہ فوجی گارڈ کی تحویل میں تھا جو العیدروس کے زیر کنٹرول تھا۔

برطانوی ملازمین برطانوی قومیت کے بہت سے شہری حیدرآباد کی ملازمت میں تھے حالات میں جیسے جیسے ابتری پیدا ہوئی ان لوگوں نے کسی نہ کسی بہانے سے کھسکنا شروع کر دیا۔ اُن میں سے بعض مثلاً کرنل گراہم بڑی شان سے رخصت ہوئے۔ ایک طرف بھارت کا ایجنٹ جنرل منشی اُس کے لئے خاص مراعات کے حصول کی کوشش کر رہا تھا بھارتی نمائندے کو ہماری فوج کے چیف آف سٹاف میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے دوسری طرف مجھے دہلی سے زین یار جنگ کے تار آتے رہے کہ میں کرنل گراہم کو برطانیہ کے لئے دو ہوائی جہاز کے ٹکٹ فراہم کروں۔ مجھے حکومت نے اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیا تھا۔ اسلئے میں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ لیکن بعد میں حکومت کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ میں اُس کی روانگی کے لیے "خصوصی انتظامات" کروں۔ چونکہ ان انتظامات کی وضاحت نہیں ہوئی تھی اسلئے میں نے انتظار کیا کہ وہ آئے تو پتہ چلے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ آیا اور چلا گیا اور مجھ سے ملا تک نہیں میں حیران تھا کہ ایسے لوگوں پر حکومت اپنے وسائل اور ہمارا وقت کیوں ضائع کرواتی ہے۔ برطانوی ملازمین کا کہنا یہ تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کے خلاف لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جو دولت مشترکہ کا رکن تھا لیکن یہ دلیل اسلئے بودی تھی کہ اُن پر کچھ اخلاقی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی تھیں آخر انہوں نے نظام کا نمک کھایا تھا۔ مراعات حاصل کی تھیں احسانمندی اور شرافت کا تقاضا تھا کہ حیدرآباد کے آڑے وقت میں اسطرح دھوکا نہ دیں۔ اپنی مصروفیتوں کے درمیان جب مجھے ہدایت ملتی تھی کہ فلاں اور فلاں سفید فام بھگوڑے ملازم کے لئے خصوصی انتظام کروں۔ تو میں جھنجھلا اُٹھتا تھا۔ ان ملازمین میں ڈیسمنڈ شین کی واحد مثال ہے۔ جس نے برطانوی ہائی کمیشن کے سخت دباؤ کے باوجود حیدرآباد

چھوڑنے سے صاف انکار کردیا۔ جس کی وجہ سے اس بیچارے کو اپنی وفاداری کے صلہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

آخری ہچکی ۱۶-۱۷ ستمبر کی درمیانی رات کو العیدروس نے لائق علی پر واضح کردیا کہ وہ مزید جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے فوج اس کے کنٹرول میں تھی اور پولیس دین یار جنگ کے ایسی صورت میں نہ لائق علی کچھ کر سکتے تھے اور نہ قاسم رضوی چنانچہ وزارت کے لئے استعفٰے دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لائق علی نے بگڑتی ہوئی صورت حال پر نظام کی جھنجلاہٹ۔ بیزارگی اور عدم اعتماد کا ذکر کیا ہے[1] جس سے انہیں یہ تاثر ہوا۔ کہ نظام تمام معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ لائق علی نے اپنے ساتھی وزراء کو صورت حال سے آگاہ کیا جس پر متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ استعفٰے دے دینا چاہیئے۔ فضل نواز جنگ[2] نے البتہ کہا کہ اس بات کی ضمانت ملنی چاہیئے کہ اس اقدام کے بعد قتل عام نہیں ہوگا۔ یہ ضمانت بھلا کون دے سکتا تھا۔ وزارت کے استعفٰے کے بعد نظام نے لائق علی کو طلب کیا۔ تو انہوں نے دیکھا کہ العیدروس اور دین یار جنگ سے مشورے ہو رہے تھے منشی سے بھی رابطہ پیدا ہو چکا تھا منشی سے مفاہمت کی بڑی شرطیں یہ تھیں (الف) لائق علی وزارت کا مستعفی ہونا (ب) رضاکار تنظیم کی برخواستگی (پ) ذمہ دار حکومت کا قیام (ت) بلا رم ریذیڈنسی میں چند فوجی یونٹوں کی تعیناتی جیسا کہ انگریزوں کے زمانہ میں ہوتا آیا تھا (ٹ) شاہزادہ برار کی صدارت میں ایک عارضی حکومت کا قیام

۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کا دلخراش پیغام ۱۷ ستمبر کو علی الصبح اطلاع ملی۔ کہ لائق علی وزارت مستعفی ہوگئی ہے یہ بات یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میرا دل یہ پیسے مان لیتا

Tragedy of Hyderabad

[1] لائق علی۔ ٹریجیڈی آف حیدرآباد صفحہ ۳۰۱

[2] یادداشت خان بہادر اشفاق احمد سابق چیف سیکرٹری

کہ وطن عزیز کو بچانے کے لئے شب و روز جو کوششیں ہو رہی تھیں وہ اچانک ختم ہو جائیں گی اور جو خوشگوار خواب ہم دیکھتے چلے آرہے تھے وہ تلخ حقیقتوں میں تحلیل ہو جائینگے۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ صدر اعظم کے پیغام نے اس خبر کی توثیق کردی اسمیں یہ بتایا گیا کہ وزارت مستعفٰی ہوگئی ہے اور مجھے ہدایت کی گئی کہ فوری طور پر وہ تمام رقومات جو میری تحویل میں ہیں اپنے نام منتقل کرلوں۔ اُسکے بعد ۸½ بجے دوسرا پیغام وصول ہوا جسکو پڑھتے ہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اُسکا متن یہ تھا "فوجی طاقت کے مہیب مظاہرے اور مسلسل بمباری کی تاب نہ لاکر ہم بدرجہ مجبوری جنگ سے دست بردار ہوگئے ہیں اور نظام نے بھارتی گورنر جنرل کو اس کی اطلاع کردی ہے ہم نے یہ جنگ خلوص، ایمانداری اور مجاہدانہ عزم سے لڑی تھی مگر مشیت ایزدی کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔ وزارت نے استعفٰے دے دیا ہے شاید حکومت مرزا اسمٰعیل کو سونپ دی جائے میں محسوس کرتا ہوں کہ معین نواز جنگ اور تمہارے لئے حیدرآباد میں کوئی جگہ نہیں ہے مجھے نہیں معلوم کہ معین نواز جنگ ان حالات میں آزاد حیدرآباد کے مقدمہ کی اقوام متحدہ میں پیروی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ میرا کیا حشر ہوگا۔ مگر میں عمر بھر قید کے مقابلے میں سینے پر گولی کھانا زیادہ پسند کروں گا۔ میر نواز جنگ سے کہو کہ معین نواز جنگ کو ۵ ہزار پونڈ منتقل کردیں تمہاری تحویل میں جتنی رقم ہے اُسے اپنے نام منتقل کرلو۔ یہ رقم ہماری جدوجہد میں کام آئے گی۔ تم مایوس نہ ہونا۔ تم نے خلوص اور جانفشانی سے اپنے وطن کی خدمت کی ہے۔ اللہ تمہیں دوسری دنیا میں اس کی جزا دے گا۔ خفیہ کوڈ کا یہ آخری نسخہ ہے۔ باقی جلا دیئے گئے ہیں۔ یہ شاید میرا آخری پیغام ہو۔ اللہ حافظ" یوں تو ۱۳ ستمبر سے جو خبریں آرہی تھیں ان کے پیش نظر یہ صورت حال غیر متوقع نہیں تھی لیکن جب اس روح فرسا پیغام سے یہ خدشہ ایک المناک حقیقت بن کر سامنے آیا تو دل و دماغ کی جو کیفیت ہوتی اُس کا اظہار

زبان سے ہوسکتا تھا نہ قلم سے، میں ایک سناٹے میں آگیا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوگئی ہے تھوڑی دیر میں جب اپنے اعصابی نظام پر قابو پایا تو دل کا غبار اور سینہ کا دھواں بے اختیار آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔ اللہ جانتا ہے کہ اسوقت حیدرآباد میں اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں کی جو اس وقت وہاں میری رہائش گاہ پر تھے شدید خطرے سے دوچار تھے فکر تو تھی مگر جو چیز میرے لئے سوہان روح تھی وہ یہ تھی کہ ۱۷ ستمبر کی منحوس تاریخ کو دکن میں مسلمانوں کا ۸ سو سالہ اقتدار ملیامیٹ ہوگیا۔ اور ایک منفرد تہذیب و ثقافت کا چراغ گل ہوگیا۔

دوسرے پیغامات کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ایک دوسرا پیغام جس میں میری حقیر خدمات کا دوبارہ اعتراف کرتے ہوئے پھر ہدایت ہوئی۔ کہ حیدرآباد کے تمام وسائل اور رقومات کو اپنے نام منتقل کروں۔ تاکہ وہ جنگ آزادی کے لئے جو اس المیے کے بعد جاری رہنی چاہیئے بطور اسلحہ استعمال ہوسکیں۔ اس کے چند منٹ کے بعد ایک اور پیغام وصول ہوا "اگر معین نواز جنگ کی قیادت میں معین نواز جنگ اور تم متوازی حکومت قائم کرکے اپنا مقصد مد لڑسکتے تو اپنے صوابدید سے ایسا کرلو۔ اور آزادی کے پرچم کو بلند رکھو اور اس مقصد کے لیے جو رقوم تمہاری تحویل میں ہیں وہ اپنے نام منتقل کرلو"۔ اس پیغام کا آخری فقرہ یہ تھا "یہ میرا آخری پیغام ہے۔ میں سب کوڈ جلا رہا ہوں"۔ اسطرح یہ پیغام میرے لئے حکومت حیدرآباد کی آخری ہدایت تھی اُسکے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا۔

میری تحویل میں سرکاری رقومات مجھے یقین تھا۔ کہ بھارتی حکومت کو میری تحویل میں رقومات کی فکر ستانے لگے گی۔ اور وہ اسپر قبضہ میں کرنے کی تدبیریں کرنے لگے گی اسی لئے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہی میں نے دو کروڑ کی لگ بھگ رقم جو حیدرآباد سٹیٹ بنک کی کراچی شاخ میں جمع تھی نقدی کی شکل میں نکلوا کر چار لوہے کے بکسوں میں بھر کر اپنی رہائش گاہ پر لے آیا۔ اب سوال یہ تھا۔ کہ اس رقم کا کیا کروں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔ حکومت کی طرف سے بار بار مجھے ہدایت

ملی تھی کہ یہ رقم میں اپنے نام منتقل کروں میں نے اس ہدایت کے بارے میں بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اتنی بڑی سرکاری رقم میرے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع نہیں ہونی چاہیئے میرے ذہن میں اس فیصلہ کے حق میں چار وجوہات تھیں (الف) اتنی بڑی رقم میرے ذاتی حساب میں اگر جمع ہوئی تو بھارتی حکومت کو اُس کا پتہ چل جائے گا اور وہ اُسکے حصول کے لئے مطالبہ کرنا شروع کردے گی (ب) پاکستان میں آنے والا ہر حیدرآبادی اور ہر وہ شخص جو اقتدار سے متعلق رہا ہو۔ اسمیں سے اپنا حصہ طلب کریگا اور میری جان مصیبت میں پھنس جائے گی (پ) میں کتنا ہی ایمانداری اور دیانت سے اس امانت کی پاسداری کروں ہمارے ملک کی عام روایت کے مطابق مجھ پر بددیانتی کا الزام عائد کیا جائے گا۔ بہتان بازی شروع ہوجائے گی (ت) میری وفات کی صورت میں میرے ذاتی اکاؤنٹ میں اس رقم کا ہونا جو میری ملک نہیں ہے بہت پیچیدگی پیدا کردیگا۔ میں اپنے بھولے پن سے سمجھتا تھا۔ کہ اگر یہ رقم میری امانت کے طور پر حکومت پاکستان کی تحویل میں دے دی جائے اور اُسکا خرچ اور استعمال میری صوابدید سے ہو۔ تو اُسکی وہی نوعیت ہوگی جو میرے ذاتی اکاؤنٹ میں رکھنے سے ہوسکتی ہے۔ اس طرح میں اُن سب الجھنوں سے بچ جاؤں گا جن کا مجھے ذاتی اکاؤنٹ میں رکھنے سے سامنا کرنا پڑتا۔ اگر اسوقت مجھے یہ علم ہوتا۔ کہ نیک نیتی سے کیا ہوا یہ اقدام میرے لئے دردسر، پریشانی، رسوائی اور اپنوں کی شدید ناراضگی کا موجب بن جائے گا۔ تو شاید میں وہی کرتا۔ جس کی مجھے ہدایت ملی تھی۔

نوابزادہ لیاقت علی خان سے رجوع اگلے دن یعنی ۱۸ ستمبر کو میں لیاقت علی خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں انہیں اپنی حکومت کی طرف سے آتے ہوئے اہم پیغامات کی نقول بھیجتا رہتا تھا لائق علی کے آخری پیغامات کی وصولی کے بعد اُنسے میری ٹیلیفون پر بھی بات ہوچکی تھی جس میں انہوں نے مجھ سے اظہار ہمدردی کے ساتھ اپنے مکمل

تعاون کا بھی یقین دلایا تھا اسلئے روپیہ پیسہ کے معاملے میں میری حکومت کی ہدایات کا اُنہیں پوری طرح علم تھا۔ میں نے اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ اتنی کثیر رقم اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اسلئے میری درخواست ہے کہ یہ رقم میری امانت کے طور پر حکومت پاکستان اپنی تحویل میں لے لے اور اُسمیں سے جو بھی ادائیگیاں ہوں میری مرضی اور اختیار سے ہوں۔ نوابزادہ نے جواب دیا کہ حیدرآباد کے معاملے میں وہ پہلے سے ہی بہت ملوث ہیں۔ اُس وقت کے حالات میں اُسمیں مزید گنجائش نہیں۔ حکومت حیدرآباد کو مجھ پر کامل اعتماد ہے پھر میں کیوں اُن ہدایات پر عمل نہیں کرتا جو روپیہ پیسہ کے بارے میں مجھے دی گئی ہیں۔ میں نے بہت اصرار کیا مگر وہ راضی نہیں ہوئے بالآخر میں نے بہت ہی جذباتی انداز میں عرض کیا" نوابزادہ صاحب اگر بھارت کو مجھے یہ رقم دینی ہوتی تو میں اُسے بینک سے ہی کیوں نکلواتا۔ اپنے نام پر میں اتنی بڑی رقم رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ اُسے اپنی تحویل میں لینا نہیں چاہتے اب چوتھی صورت یہی رہ گئی ہے۔ کہ میں نوٹوں سے بھرے چار لوہے کے بکسوں کو کلفٹن میں لیجاکر سمندر میں پھینک دوں" میرے اِس ملتجیانہ اندازِ گفتگو سے متاثر ہوکر نوابزادہ صاحب نے میری طرف کن آنکھیوں سے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے" تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارا فیصلہ مناسب ہے" رقومات کو سرکاری تحویل میں منتقلی کی اجازت دے دی۔

پریشان کن صورت حال میں ابھی تک پورے طور پر سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ جس طرح حیدرآباد نے اچانک ہتھیار ڈال دیئے اور مؤثر مزاحمت سے گریز کیا اُس سے عوام میں اہل حیدرآباد کے خلاف بڑا سخت رَدِّعمل ہوا ہے عام تاثر یہ ہے کہ ہم نے قوم کے ساتھ غداری کی ہے۔ ہم بڑے بول بولتے رہے اور وقت پر کچھ نہیں کیا وزارت خارجہ کے حلقوں سے مجھے غیر رسمی طور پر یہ مشورہ دیا گیا کہ اس شدید عوامی رَدِّعمل کے پیشِ نظر میں کچھ عرصے تک گھر سے باہر نکلنے سے احتراز کروں۔ میں حیران تھا۔ کہ

قائداعظم کا کوئٹہ سے ورود جولائی ۱۹۴۸ء

یا اللہ یہ دو دنوں میں کیا ہوگیا۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ اسی شہر کراچی میں اللعظمت اللہ کے ترانے گائے جا رہے تھے اور حیدر آباد زندہ باد کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ اُسی شام کو کراچی کی انتظامیہ نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ شعبۂ تعلّقات عامہ سے متعلّق میرے ایک افسر نے نہرو کو مبارک کا تار بھیجنے کی کوشش کی تھی جسے انہوں نے روک لیا ہے اور سفارتی آداب کے تحت میری اجازت چاہتے تھے کہ اُس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ میں شرم سے گڑ گیا اور سوچنے لگا کہ ان حالات میں عوامی ردّ عمل بیجا نہیں ہے۔

دوسری املاک ۲ کروڑ کی نقدی کے علاوہ حیدر آباد کی دوسری املاک بھی تھیں۔ کراچی کی وکٹوریہ روڈ پر ایک عمارت تھی۔ باہر سے درآمد کیا ہوا کچھ سامان تھا جو کراچی کی بندرگاہ پر اور کچھ یورپ کی بندرگاہوں پر پڑا تھا اور کچھ بحری جہازوں سے مختلف مقامات سے آ رہا تھا مجھے ڈر تھا کہ حیدر آباد کے سقُوط کے بعد یہ سامان کہیں خُردبُرد نہ ہو جائے اس مال کا آرڈر میری تعیناتی سے بہت پہلے سے لندن ایجنسی یا ہمارے لئے خریداری کرنے والے ایجنٹوں کے واسطے سے دیا گیا تھا اُس کے کاغذات میرے پاس نہیں تھے اُس پر مجھے قانونی اختیار تو تھا مگر مجھے اُسکی تفصیلات معلوم نہیں تھیں اور وہ میرے قبضے میں تھا اور نہ اُسکے ذخیرہ کرنے اور دیکھ بھال کی سہولتیں مجھے حاصل تھیں اسلئے سقُوط سے چند روز پہلے ہی میں نے حکومت پاکستان کو ایک تجویز پیش کی۔ کہ حیدر آباد کا مملوکہ جو بھی سامان چاہے وہ جہازوں پر ہو۔ سفر میں ہو۔ یا کراچی اور غیر ممالک کی بندرگاہوں میں سٹور کیا گیا ہو حکومت پاکستان اُسے فی الفور اپنے قبضے میں لے لے اور اُس کی مالیت کا خود تعیّن کر کے پانچ برس میں اُس کی بالاقساط قیمت ادا کر دے۔ حکومت پاکستان نے یہ تجویز منظور کر لی۔

No.XV/43/DB/48. **Secret.**

Government of Pakistan

MINISTRY OF ECONOMIC AFFAIRS

Karachi, 9th September, 1948.

To

The Agent-General for Hyderabad in Pakistan,
Hyderabad House,
9, Clifton,
Karachi.

Sir,

With reference to your letter No.884/A, dated 8th September, 1948, addressed to the Hon'ble Minister for Economic Affairs, I am directed to inform you that Government of Pakistan is pleased to accept your offer to purchase consignments belonging to H.E.H. the Nizam's Govt which have already arrived in Karachi and those which are on the High-seas and may arrive at any time. This acceptance is on the condition that the prices of goods will be fixed after inspection by an officer of the Inspection staff of the Director-General of Supply and Development, and that the prices thus fixed will be paid within the next five years. The Director-General of Supply and Development has been instructed to take charge of these consignments.

I have, etc.,

K. Mushtaq Ilahi

(K.Mushtaq Ilahi).
Assistant Secy to the Government of Pakistan.

املاک کی منتقلی کے بارے میں حکومتی مراسلے کا عکس

میرا یہ خدشہ کہ | **حیدر آباد کی رقومات کے بارے میں بھارتی حکومت کی تلملاہٹ**

سقوط کے بعد ہی بھارتی حکومت کو میری تحویل میں رقومات کی فکر ستانے لگے گی۔
آخر صحیح نکلا۔ سب سے پہلے اُس نے میرے حسابات پر فوری طور پر تحدید عائد کردی
۲۱ ستمبر سے ملٹری گورنر کے احکامات مختلف عنوانات کے تحت یکے بعد دیگرے
میرے نام آنے لگے۔ سب سے پہلے یہ ہدایت ملی کہ تا حکم ثانی میں اپنی سرگرمیوں کو معطل
کردوں کیونکہ اُنکی رائے میں میں حیدر آباد کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ دوسرے حکم میں بنک
سے رقومات نکالنے پر مکمل بندش عائد کردی وہ شاید یہ سمجھتی تھی کہ میں تین چار دن
تک اِس حکم کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔ ۲۸ ستمبر کو حکم ملا۔
کہ میں اپنے حسابات لیکر فوری طور پر حیدر آباد پہنچوں اور متعلقہ امور کی جواب دہی
کروں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد ان سب احکامات کا میں نے اپنے ایک خط میں
جواب دیا۔ جس کا متن یہ تھا: "مجھے حیدر آباد کی قانونی حکومت نے اپنا نمائندہ
مقرر کر کے بھیجا تھا۔ میں نے اپنے مقدور تک خلوص اور ایمانداری سے اُس کے جاری کردہ
احکامات کے عین مطابق اپنے فرائض کو انجام دیا۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں کسی ایسی حکومت
کے احکام ماننے کا اپنے آپکو پابند نہیں سمجھتا۔ جو میری نظر میں غیر قانونی ہے اسلیئے میں
ملٹری گورنر کے احکامات کی تعمیل سے قاصر ہوں"۔ بتایا جاتا ہے کہ میرے اس خط کو پڑھ کر
جنرل چودھری بہت چراغ پا ہوا۔ اور خط کو اٹھا کر میرے بھائی جو اُس وقت حیدر آباد
کی ملازمت میں تھے کی طرف یہ کہہ کر پھینک دیا: "یہ تمہارے بھائی کی حرکت ہے"۔ اُسکے بعد اُس
نے کئی طریقوں سے مجھے مرعوب کرنے اور مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی پہلے چند ایسے حضرات
کو مجھے "سمجھانے" کے لئے بھیجا جن کا اُس کی نظر میں مجھ پر کچھ اثر ہو سکتا تھا۔ ایک افسر
میرے حسابات کی "تنقیح" کے لئے آیا میں نے اُنہیں کورا جواب دے کر لوٹا دیا۔ پھر یہ معلوم
کرنے کے بعد کہ میرے خاندان کو نظام اور خانوادۂ آصفیہ سے بہت لگاؤ اور وابستگی ہے

اُس کی آخری چال یہ تھی کہ نظام پر دباؤ ڈال کر میرے نام اپنی مرضی کے مطابق اُن کا ایک
حکم نامہ بھیجا۔ اُس حکم نامہ کا متن یہ تھا: "مشتاق احمد کراچی۔ تم کو حکم دیا جاتا ہے۔ کہ تم
فوراً حیدر آباد واپس آجاؤ کیونکہ تم حیدر آباد کے نمائندے نہیں ہو اور اپنی واپسی تک
پریس میں کسی قسم کا بیان نہ دو۔ آصف سابع"

بھارتی حکومت کے دباؤ کے تحت میرے نام نظام کا حکمنامہ

Hyderabad Deccan,
17th October 1948.

Mushtaq Ahmed, Karachi,

You are hereby ordered to return to Hyderabad immediately as you have no credentials making you a representative of the Hyderabad Government. Meanwhile pending your return you should not give any statement to the press.

لطف یہ ہے کہ اس خط کو میرے بھائی کی دستخط سے بھجوایا گیا مجھے معلوم تھا کہ آصف سابع
کے رُوپ میں جنرل چودھری بول رہا ہے کیونکہ اُسی نے سب سے پہلے مجھ سے کہا تھا
کہ میرا خریطہ واپس لے لیا گیا ہے اور میں حیدر آباد کی نمائندگی نہیں کرتا۔ پریس میں بیان
دینے کی ممانعت دراصل میرے اُس بیان پر ردّ عمل تھا جس میں میں نے غاصب حکومت
کے اختیارات کو چیلنج کیا تھا۔ میں دو تین روز تک سوچ بچار رہا کہ نظام کے اس مبیّنہ حکم نامے
کا جواب دُوں یا چُپ سادھ لُوں۔ بالآخر میں نے جواب دینا ہی مناسب سمجھا۔ اس جواب
کا متن یہ تھا۔

"سرکار کا حکم نامہ وصول ہوا۔ اس خانہ زاد موروثی کے لئے سرکار کے ہر حکم کی تعمیل باعث سعادت ہے۔ خانہ زاد نے کچھ بھی حقیر خدمت پاکستان میں انجام دی ہے۔ وہ خانزادہ آصفیہ اور مملکت حیدرآباد کے مفاد میں اور سرکار کے احکامات کے عین مطابق ہے۔ گمان غالب ہے۔ کہ اس حکم نامہ پر دستخط ہمایونی سرکار کے منشا اور مرضی کے خلاف ہے اسلیئے سرکار کو اپنی وفاداری اور جان نثاری کا یقین دلاتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جن حالات سے مملکت آصفیہ دوچار ہے۔ اس کے پیش نظر اور ملک کے مفاد کی خاطر خادم کو اس حکم نامے کی تعمیل سے معذور سمجھا جائے اور اس اقدام اور جسارت کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول نہ فرمایا جائے" یہ نہیں معلوم ہوسکا۔ کہ اس خط کو نظام تک پہنچنے دیا گیا یا نہیں۔ لیکن دو تین برس کے بعد ان خطوط سے جو نظام نے مجھے لکھے۔ یہ ترشح ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے میرے اس اقدام کو ناپسند نہیں فرمایا۔

حصہ سوم

چوتھا باب

طوفان کے بعد حیدرآباد میں

نظام کا نشری اعلان

لائق علی وزارت نے استعفےٰ کیا دیا۔ حیدرآباد کی دنیا ہی بدل گئی۔ مجارتی ریجمنٹ جنرل منشی سے مفاہمت کے بعد اپنی زندگی میں پہلی بار نظام حیدرآبادی نشرگاہ گئے اور ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اپنی زبان سے منشی کی فراہم کردہ تقریر پڑھی فرمایا "میری حکومت نے اپنا استعفےٰ پیش کردیا ہے اور مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں پوری سیاسی صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ میں نے اس کے جواب میں گورنر جنرل ہند کو مطلع کردیا ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ یہ صورت حال اس سے پہلے اختیار نہیں کی گئی اور اس نازک وقت میں میرے لئے کچھ کرنے کے لئے بہت تاخیر ہوگئی ہے۔ اس نازک موقع پر میرے لئے کچھ کرنا مشکل ہے"[1]

یہ اعلان مسلمانوں کی روایات۔ آرزوؤں اور تمناؤں کا قتل نامہ تھا اور ایک بھیانک اور سیاہ مستقبل کا پیامبر تھا۔ ۱۷-۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کی درمیانی شب سے دھڑکتے دل نم آلود آنکھیں اور جاگتی راتیں مسلمانوں کا مقدر بن چکی تھیں ترکی ٹوپی اور شیروانی ابتک حیدرآباد کے ہندو مسلمانوں کا قومی لباس تھا اب اسکا ہر پہننے والا گردن زدنی بن گیا۔ مسلمان کیلئے گھر سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینا تھا جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آتا تھا اس سے انتہائی سوقیانہ اور وحشیانہ برتاؤ ہوتا تھا اس کے برعکس ہندوؤں کے گھروں میں شادیانے بج رہے تھے۔ وہ بسوں اور لاریوں میں لد کر شہر کے کونے کونے میں گھوم رہے تھے اور

---

[1] ہوش یار جنگ۔ مشاہدات صفحہ ۳۱۹

فحش فقروں اور زہر سے بجھے ہوئے نعروں سے گھروں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کو اشتعال
دلا کر صدیوں کا بدلہ چکا رہے تھے۔

منشی کا سقوط

۱۸ ستمبر کو شاہزادہ برار نے جو عارضی حکومت کے سربراہ بنائے جانے
پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ صبح سویرے چیف سکریٹری کو طلب کیا۔ اور بڑے کرّوفر سے
یہ بتانے کی کوشش کی۔ کہ بحیثیت سربراہ حکومت اُنکا طریق کار کیا ہوگا۔ لیکن اُن کی
یہ خوشی بھی عارضی تھی کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر آگئی۔ کہ بھارتی حکومت نے منشی سے
کی گئی مفاہمت کو مسترد کردیا ہے اور پٹیل نے منشی کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے پر
سرزنش کی ہے۔ منشی کا اقدام اختیارات سے تجاوز تھا یا نہیں مگر بہرحال وہ بھارتی
حکومت کی طرف سے کیا گیا تھا اور ایمانداری اور شرافت کا تقاضا تھا کہ اُس کا احترام
کیا جائے لیکن اُسے یکسر مسترد کردیا گیا اسلئے اگر منشی کہتا ہے۔ کہ حیدرآباد کے سقوط کے
ساتھ اُس کا بھی سقوط ہوگیا تو کچھ غلط نہیں کہتا۔

سلامتی کونسل سے مقدمہ واپس لینے کی ان کہی کہانی

نظام نے چیف سیکرٹری
کو طلب کیا جس نے سب حالات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ اُس کی موجودگی ہی میں سلامتی
کونسل سے مقدمہ واپس لینے کا مطالبہ وصول ہوا۔ اسکے لئے جو مسودہ نظام کے مشورہ سے
چیف سیکرٹری نے بنایا اسمیں NOT TO PRESS THE CASE IN THE SECURITY COUNCIL
کے الفاظ تھے۔ منشی کو جب یہ مسوّدہ ملا۔ اُس نے ٹیلیفون سے کہا کہ یہ الفاظ بالکل
ناکافی ہیں۔ منشی کی بات مان کر نظام ایک بار رُسوا ہو چکے تھے مزید رُسوائی کے لیے تیار نہ
تھے منشی کو جواب دیا گیا۔ کہ اس مسوّدے میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اسپر منشی نے جو بھارتی
حکومت کی سرزنش سے پہلے ہی جھنجلا رہا تھا طیش میں آکر کہا کہ نظام جلد ہی اپنا فیصلہ
بدل لیں گے۔ ٹیلیفون سے اس گفتگو کے چند منٹ کے اندر ہی انڈین ایئر فورس کے ۵-۶
ہوائی جہاز شاہی محل کے عین اوپر نیچی پرواز کرنے لگے۔ یہ پرواز اتنی نیچی تھی کہ ایسا

معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ چھتوں کو چھو لیں گے۔ اس حرکت کا مقصد بظاہر دہشت پھیلانا
تھا جس میں اُسے کامیابی ہوئی۔ کیونکہ نظام کے اعصاب نے جواب دے دیا اور منشی
کی خواہش کے مطابق سلامتی کونسل سے مقدمہ واپس لینے کی ہدایت جاری[1] ہوگئی۔

جنرل چودھری کا وزارتی اجلاس

نظام کے نشری اعلان نے مسلمانوں کو مایوسی اور
پستی کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ العیدروس "فاتح جنرل" کے سامنے ہتھیار
ڈال کر لوٹا۔ تو قیامت کا سماں تھا اِدھر یہ صورت تھی اُدھر اعظم جاہ شاہزادہ برار تلخ
حقیقتوں سے کوسوں دُور اپنے عشرت کدے میں صدر اعظم بننے کا خواب دیکھ رہے
تھے اور چیف سیکرٹری پر بار بار زور دے رہے تھے کہ اُنکی "وزارت" کا اجلاس
بُلایا جائے۔ انہیں بڑی مشکل سے اس احمقانہ اقدام سے روکا گیا۔ فوجی گاڑیاں اور ٹینک
شہر میں داخل ہونا شروع ہوگئے اور فوجی ہیڈ کوارٹر کا محاصرہ کرلیا گیا جنرل چودھری
نے چیف سکریٹری کو طلب کیا۔ اور بلا کسی تمہید کے کہا کہ لائق علی وزارت کے اہم عہدہ دار
ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کی حراست میں سمجھیں۔ لیکن متبادل انتظام ہونے تک
وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ انہیں پولیس اور فوجی گارڈ کی نگرانی میں نقل و حرکت
کی اجازت[2] تھی مگر گھر جانے کی سختی سے ممانعت تھی۔ جنرل چودھری کے حکم سے اُن
حضرات کی طلبی ہوئی جن کے ناموں کا اعلان نظام نے منشی سے مفاہمت ہوجانے کے بعد
کیا تھا۔ اُن میں شاہزادہ برار کے علاوہ العیدروس۔ زین یار جنگ۔ ابوالحسن سید علی۔
راما چاری اور بنّا لال پِٹی کے نام شامل تھے یہ سب حضرات یہ اُمید لے کر آئے تھے کہ انہیں
پکّا وزیر بنا دیا جائے گا۔ ان کو خطاب کرنے کے لئے جنرل چودھری جس شان سے شاہ
منزل میں داخل ہوا۔ وہ کبھی برطانیہ کے وائسرائیوں کے دور میں دیکھی جاتی تھی۔ وہ
کیوں نہ شان سے آتا۔ آخر وہ صدیوں کی مفتوح قوم کا پہلا فتحمند جنرل تھا۔ شاہزادہ

[1] یادداشت۔ سابق چیف سیکرٹری خان بہادر اشفاق احمد
[2] " " " "

برار نے اپنی طرف سے بڑی بے تکلفی سے How are you General? I have seen you after a long time کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ موقع کی نزاکت کے پیش نظر یہ محض بچھوراپن تھا۔ چودھری خفیف سی مسکراہٹ سے منہ پھیر کر آگے بڑھ گیا۔ اپنے خطاب میں جنرل نے صاف الفاظ میں کہا کہ نظام کو وزارت کی تشکیل دینے کا کوئی حق تھا نہ اختیار اب اس نے ملٹری گورنر کی حیثیت سے تمام نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ لیکن تا حکم ثانی وہ لوگ بطور مشیر کام کرتے رہیں گے۔ لیکن انہیں کسی قسم کے اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ امن عامہ کو برقرار رکھنے کے لئے فیصلہ ہوا[1]۔ کہ وہ مقامی فوج اور پولیس کی ذمہ داری ہوگی

شہر میں امن وامان کا مسئلہ | اس فیصلہ کے مطابق مقامی پولیس اور فوج کے سربراہوں نے کچھ انتظامات کئے۔ مگر اُن کے نتائج اطمینان بخش نہیں تھے اُسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندو غنڈے بے قابو ہوگئے تھے انہوں نے دھڑلے سے کھلم کھلا لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مقامی عہدہ دار اس موقف میں نہیں تھے کہ وہ روک تھام کر سکیں اور شدید انہیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ طاقت استعمال کرنے سے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اسلئے بڑے نفسیاتی دباؤ میں ہونے کی وجہ سے مقامی پولیس کوئی موثر کارروائی نہ کر سکی اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک میٹنگ بلائی گئی جسمیں یہ فیصلہ ہوا۔ کہ چونکہ مقامی پولیس امن عامہ کی بحالی میں ناکام ہوگئی ہے۔ اسلئے بھارتی فوج اس ذمہ داری کو سنبھال لے گی۔ یہ بڑا ہی خطرناک فیصلہ تھا۔ مشیر حضرات میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ اس بارے میں زبان کھول سکیں۔ صرف چیف سیکرٹری نے عرض کیا[2] کہ اس صورت میں مسلمانوں کا آخری سہارا ختم ہوجائے گا۔ جنرل راجندرا سنگھ جی کے

[1] یادداشت۔ سابق چیف سکرٹری خان بہادر اشفاق احمد
[2]

استقبال کے بعد انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے ملک باغ علی کی فوجی کپتین کو فوج کی موجودگی میں لٹتے دیکھا ہے۔ اور ایسا کرنے والوں سے کوئی بازپرس نہیں کی گئی انہوں نے بڑے دردمندانہ انداز میں کہا کہ اگر جنرل کا یہ قطعی حکم ہے تو وہ درخواست کریں گے کہ انہیں اپنے عہدہ سے سبکدوش کرایا جائے۔ کیونکہ ان حالات میں وہ اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کر سکیں گے باقی لوگوں میں سے صرف جنرل العیدروس نے اس کی حمایت کی۔ جنرل چودھری نے چند لمحات کے توقف کے بعد اپنا پہلا فیصلہ بدل دیا اور مقامی فوج اور پولیس کے سربراہوں کو زیادہ مستعدی سے اپنے فرائض انجام دینے کی ہدایت کی۔ پنالال پٹی اور راماچاری نے فیصلے میں تبدیلی کو پسند نہیں کیا لیکن جنرل چودھری نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ وہ صرف مشیر ہیں اُنکے فیصلے پر بحث مباحثے کی گنجائش نہیں اس فیصلے سے حیدرآباد شہر قتل عام سے بچ گیا اور اضلاع میں اور شہر کے مضافات میں جو ظلم اور غنڈہ گردی ہوئی حیدرآباد شہر اس سے محفوظ رہا۔

بھارتی سول ٹیم کی آمد | جنرل چودھری کے حیدرآباد آنے کے سات دن کے اندر سردار پٹیل نے اپنی پسند کے مطابق پہلے سے منتخب شدہ افسروں کی ایک ٹیم کو انتظامیہ کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے بھیجا۔ باکھلے نے جو حکومت بمبئی میں ہوم سکریٹری رہ چکا تھا چیف سول اڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔ پردھان اُس کے نائب کی حیثیت سے اور پیرٹو انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر اور کرنل ڈوبالکر ناظم صحت بن کر آیا۔ اضلاع کی انتظامیہ میں فوج تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب سول عہدہ دار بھی جمع ہونے شروع ہوگئے۔ جسکی وجہ سے ایک عرصہ تک اضلاع میں انتظامی دو عملی رہی۔ ایک طرف بھارتی عہدہ دار تمام اختیارات سنبھالے ہوئے تھے دوسری طرف مقامی عہدہ دار ہر قسم کے اختیارات سے محروم بے بسی کی تصویر بنے ہوئے بھارتی عہدہ داروں کی خوشنودی حاصل

[1] میں نواز جنگ Heyderabad under Military rule صفحہ ۸۲

کرنے کے لئے بھاگتے پھرتے تھے۔ باکھلے نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی سب مقامی افسروں کو یقین دہانی کرائی کہ جو کچھ ہُوا ہے وہ اُنکی ذمہ داری نہیں تھی اسلئے وہ اطمینان سے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ ہر قوم میں چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے حلوے مانڈے اور عزیزوں کی اپنے مفاد کے لئے خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نہایت گھٹیا کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ باکھلے کی یقین دہانی کے بعد شکست خوردہ قوم کی ذہنی پستی بھی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ یعنی ہمارے ہی چند عہدہ داروں نے جن کا شمار لائق علی کے خاص الخاص مُشیروں میں ہوتا تھا اپنے ہی محسن کے خلاف چودھری اور باکھلے کے سامنے ہرزہ سرائیاں کیں۔ یہ اتنی پست حرکت تھی کہ جن صاحبان اقتدار سے اُنہیں اس طرح مفاد حاصل کرنے کی اُمید تھی اُن کی نظروں میں بھی وہ گر گئے۔ میں ان لوگوں کے ناموں کا انکشاف کرکے قوم کو اور زیادہ رسوا نہیں کرنا چاہتا۔

چیف سول ایڈمنسٹریٹر کی یقین دہانیوں کا عملی مظاہرہ جب اُس کے قدم جم گئے تو اپنی میٹھی باتوں اور یقین دہانیوں کے باوجود باکھلے نے اپنے ہاتھ دکھانے شروع کر دیئے سیواجی کی اولاد سے اسی مُنافقانہ مرہٹہ ذہنیت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اُس کی یقین دہانیوں کے بعد مقامی افسر اپنی حد تک مطمئن ہوگئے تھے جب اُنکی چھانٹی شروع ہوئی تو سب خوش فہمیاں رفع ہوگئیں۔ سقوط سے پہلے مسلمان ۹۰ فیصدی ملازمتوں پر فائز تھے وہ سیکڑوں کی تعداد میں رُخصت کر دیئے گئے اس چھانٹی میں مقامی ہندو بھی بُری طرح متاثر ہوئے کیونکہ زیادہ تر ملازمتیں باہر سے درآمد کئے جاتے ہندوؤں کے ہاتھ میں آگئیں۔ مسلمان عوام کو غیر مسلح کرنے کی مہم کا آغاز ہُوا۔ اور تین دن کی قلیل مدت میں ہر قسم کے ہتھیار علاوہ بندوقوں کے تلوار، چاقو، خنجر،

ا؎ معین نواز جنگ Heyderabad under Military rule صفحہ ۸۲

نیزے سب اکٹھے کر لئے گئے اور کسی چیز کی رسید نہیں دی گئی اسمیں سے بیشتر سامان بھارتی افسروں کے گھروں کی زینت بن گیا۔ خانہ تلاشیوں کے ساتھ نہتے مسلمانوں پر ہندو غنڈے ٹوٹ پڑے۔ گھر لوٹ لئے گئے۔ بلا لحاظ جنس و عمر مسلمان سیکڑوں کی تعداد میں قتل کر دیئے گئے۔ بے گناہ شہریوں کے قتل عام کی صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ بیدر سے حیدرآباد آنے والے شہریوں کا ایک قافلے میں میرے قابلِ احترام ہیڈماسٹر شیخ ابوالحسن بھی تھے اُن کا اتحادالمسلمین سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ کوئی سیاسی رُجحانات تھے ان سب کو ایک قطار میں کھڑے کر کے بغیر کسی پوچھ گچھ کے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا اسی طرح عزیز عباسی ناظم کروڑگیری کا لڑکا رشید عباس چند روز تو چھپتا پھرا جب بالآخر باہر آیا۔ تو غنڈوں نے پکڑ کر اس کی ہڈی بوٹی الگ کر دی اور اُس بیچارے نے سسک سسک کر جان دے دی۔ قتل عام کے اس دور میں ہر کنواں۔ ہر نہر۔ ہر کھائی اُن کی لاشوں سے پٹی پڑی تھی بے شمار جوان عورتیں مال غنیمت بن گئیں ظلم و ستم کا یہ بھیانک دور اس وقت رُکا۔ جب جنرل چودھری کو مجبُور ہو کر سخت احکامات جاری کرنے پڑے۔ ایک دو جگہ "فوجی پکٹ" قائم ہوئے ایک جگہ غنڈوں کو کوڑے بھی لگوائے گئے۔ سردار پٹیل نے اس اقدام کو پسند نہیں کیا۔ چودھری نے کہا کہ جب تک وہ ملٹری گورنر ہے وہ غنڈہ گردی نہیں ہونے دیگا۔ مگر حکومت کی اصل باگ ڈور تو پٹیل کے پٹھو باکھلے کے ہاتھ میں تھی وہ اپنی من مانی کرتا رہا۔

پاکستان میں وظیفہ یافتگان سے انتقام باکھلے نے اُن تمام وظیفہ خواروں کے وظیفوں کی ادائیگی روک دی جو پاکستان میں مقیم تھے اُن میں سر فہرست ملک غلام محمد کا نام تھا جو اُس وقت پاکستان میں وزیر خزانہ تھے پھر انجمن ترقی اُردو اور اُن تمام اسلامی اداروں کی جو حیدرآباد کی معارف پروری سے فیضیاب ہوتے آئے تھے امداد یک لخت

۲؎ یادداشت۔ سابق چیف سکریٹری خان بہادر اشفاق احمد

بند کردی سینئر افسروں کو بلا کسی جواز کے معطل کر دیا اور بعض کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ ہندو افسروں کے لئے جگہ خالی کرانے کے لئے ایسے افسروں کو جن کا ریکارڈ ہر لحاظ سے اچھا تھا معزول کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس شخص نے جو امن و امان کی بحالی اور نظم و نسق کو مبینہ انتشار سے بچانے آیا تھا اپنے اندھے تعصب کی پیاس بجھانے کے لیے نظم و نسق کا ستیاناس کر دیا اور مملکت آصفیہ میں جو صدیوں سے امن و آشتی کے لیے مشہور تھی تشدد - بربریت اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو گیا۔

جادو جو سر چڑھ کر بولے - حیدر آباد میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ دنیا کے سامنے تھا۔ حالات کو کب تک چھپایا جا سکتا تھا اپنے کارندوں کی کرتوتوں سے بیزار ہو کر پنڈت سندر لال کی سربراہی میں خوش سگالی کا ایک وفد حیدر آباد بھیجا گیا پنڈت سندر لعل نے جو کچھ دیکھا اور سنا اس سے اُن کی انسان دوستی کو دھچکا لگا۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے "طریقہ کار یہ تھا کہ ہندوانی فوج آگے بڑھتی تھی اُس کے پیچھے کانگریسی غنڈے ہر موضع پر حملہ کر دیتے۔ بالغوں کو پہلے قتل کیا جاتا۔ پھر عورتوں کی عصمت دری کی جاتی۔ اُس کے بعد نقدی - زیورات - فرنیچر - غلہ مویشی اور جائیداد کی عام غارت گری ہوتی ——— میں نے بے چھت مکان دیکھے۔ عورتیں دیکھیں جنہیں بیوہ بنا دیا گیا تھا۔ بچے دیکھے یتیم ہو گئے تھے۔ میں نے مواضعات کے کنوؤں کو عورتوں کی نعشوں سے بھرا ہوا دیکھا . . . میں نے ایک ایک موضع دیکھا لیکن تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ——— شام کے وقت میں نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے خدا سے پوچھا کہ کیا تم نے مجھے نعشوں کو شمار کرنے کے لئے بھیجا ہے۔[1] . . ." ایک کانگریسی لیڈر نرسنگ راؤ ایڈیٹر روزنامہ رعیت نے ایک بیان میں کہا "میرے ہندو بھائیوں نے پندرہ روز کے عرصے میں کئی گنا ایسے مظالم ڈھائے ہیں جن کے پندرہ مہینوں میں رضاکار مرتکب نہ ہو سکے . . . ہم بہت المناک

ا؎ معین نواز جنگ Hayderabad under Military rule
واجد رضوی - مجاہد اعظم صفحہ ۱۹۳

دورے گذرے ہیں - ہماری مسرتیں - بیواؤں، یتیموں اور کمزوروں کی آہ و بکا میں گم ہو گئی ہیں - میں نے اکثر مقامات ایسے دیکھے ہیں جہاں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی مسلمان نظر نہیں آتا - دیہاتوں میں تم مسلمانوں کو کھیتی باڑی سے محروم کرنا چاہتے ہو اور شہروں میں ملازمتوں سے - اگر ۲۵ لاکھ کی آبادی کو ذرائع معاش سے محروم کر دیا جائے تو اکثریت ایک رات بھی امن سے گذر سکتی ہے[1]؟ ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو کو پدمجا نائیڈو نے بیں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے بربریت اور دہشت گردی کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ درآمد کردہ سول عہدہ دار جو امن و امان کے بحالی کا دعویٰ کرتے ہوئے آئے تھے بمکمل طور پر فیل ہو گئے ہیں۔ بے شمار مسلمانوں کو فرقہ وارانہ تعصب کی بنا پر ملازمتوں سے ہٹا کر روزگار سے محروم کر دیا ہے اور بیواؤں کو عصمت فروشی اور بچوں کو گداگری پر مجبور کر دیا ہے[2] . . ." آنجہانی مسز سروجنی نائیڈو کے بڑے لڑکے ڈاکٹر جے سوریہ نائیڈو نے اپنے ایک بیان مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء میں کہا" ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک وفد نے تین دنوں میں ۳۶۰ میل کا سفر کی رپورٹ ہے کہ بجز موضع سائیکور ضلع نلگنڈہ میں کوئی مسلمان نظر نہیں آیا ہے[3]۔

وزراء اور قاسم رضوی کی گرفتاری حیدر آباد میں بھارتی افواج کے داخل ہوتے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی - لائق علی اور اُنکے وزراء حراست میں لے لئے گئے۔ وزراء کو کچھ عرصے کے بعد رہائی مل گئی - اُن میں سے اتحادی وزراء عبدالرحیم - عبدالرؤف اور یامین زبیری پاکستان آ گئے۔ اکرام اللہ سقوط سے چند روز پہلے ہی پاکستان کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے" پہنچ گئے تھے۔ اتحاد المسلمین کے بہت سے

ا؎ معین نواز جنگ Hayderabad under Military rule صفحہ ۱۰ واجد رضوی - مجاہد اعظم صفحہ ۱۹۳
۲؎ صفحہ ۱۰ // // ۱۹۵
۳؎ Hayderabad under Military rule صفحہ ۹ // // ۱۹۵

اکابر کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ قاسم رضوی کے خلاف بہت سے مقدمات دائر کئے گئے جسمیں سے بی بی نگر کے مقدمے میں انہیں سات سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ان سب کے مقدموں میں اُن کے قانونی دفاع کا مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا۔ کراچی سے مسٹر عبدالرحمٰن کی بھیجنے کی کوشش کی گئی۔ تو یہ اعتراض کیا گیا۔ کہ وہ پاکستانی ہیں اسلئے اس مقدمے میں وکالت نہیں کر سکتے۔ پھر مدراس کے ایک قانون دان ونکٹا چاری نے مقدمہ لینے کی حامی بھری۔ تو یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ اردو زبان سے ناواقف ہیں اسلئے وکالت نہیں کر سکتے۔ برطانیہ کے ایک مشہور قانون دان رابرٹس (کے۔ سی) جو نیورمبرگ کی عالمی عدالت میں برطانیہ کی طرف سے پیش ہوئے تھے کی خدمات حاصل کی گئیں انہیں بھی اُردو زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے اجازت نہیں ملی۔ یہ محض بہانہ سازی تھی کیونکہ جس عدالت میں یہ مقدمہ چلایا گیا تھا اُس کا جج بھی اُردو سے ناواقف تھا۔ پھر دنیا جانتی ہے کہ ماضی میں کہ حیدرآباد میں اُردو زبان میں کارروائی کرنیوالی عدالتوں میں قائداعظم۔ سر کرشنا چاری۔ سر تیج بہادر سپرو۔ اور مارٹن جیسے بین الاقوامی شہرت والے قانون دان پیش ہوتے رہے ہیں۔ بھارتی حکومت کی طرف سے اُردو زبان کے احترام کا یہ بھونڈا مظاہرہ بڑی ستم ظریفی تھی!!

فوجی حکومت کے دوسرے اقدامات | سب سے پہلے فوجی حکومت نے حیدرآبادی فوج کو ختم کر دیا۔ تمام سول ملازمتوں میں بشمول پولیس نفری کو اتنا کم کر دیا۔ کہ وہ نہ ہونے کے برابر تھی ایک اعلان کے ذریعہ بہت سے سابق عہدہ داروں اور دیگر افراد کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اُن کے بنیک کے حسابات کو منجمد کر دیا۔ ان گشتگان تازیں معین نواز بیگ اور اس حقیر کے نام بھی شامل تھے ایک ایسا قانون نافذ کیا گیا جس کی رُو سے ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں کے انتقال کی ساری کارروائیاں کالعدم قرار دی گئیں۔ فرضی الزامات کی زد میں آنے پر بہت سے مسلمان

بدرجہ مجبوری ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ اور انکی جائداد شرنارتھیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ بلا کسی روک ٹوک کے مسجدوں کی بےحرمتی کی گئی اور اُن میں بیشتر کو مندروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایسے وہ تمام قوانین منسوخ کر دیئے گئے۔ جن سے کسی رُخ سے بھی مسلم عبادتگاہوں کا تحفظ ہو سکتا تھا۔

حیدرآباد میں عربوں کی ایک کثیر تعداد کئی نسلوں سے آباد تھی اُن میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن کو عربی سے بھی واقفیت نہیں تھی ان سب کو سپیشل ٹرینوں میں بھر کر ملک بدر کر دیا۔ حیدرآباد کے آخری دور میں بھارت کے مختلف علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے چلے آئے تھے اُن سب کو ایک ایک کر کے رخصت کر دیا گیا آنے سے پہلے بھارت میں اپنی جائیداد اور مال متاع لُٹا آئے تھے اب واپس جا کر خدا معلوم اُن ستم رسیدہ مظلوم انسانیت کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

ایک قومی زبان کا احیا دورِ عثمانیہ کا درخشاں کارنامہ تھا بھارتی حکومت کو وطن پرستی اسی میں نظر آئی اور اس عظیم کارنامے کو ختم کر دیا جائے چنانچہ اُردو زبان بطور ذریعہ تعلیم کالعدم قرار دی گئی اور اُس کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی۔ یہ اُن سے کون پوچھتا۔ کہ اگر اردو مسلمانوں کی زبان ہے تو انگریزی آپکی مادری زبان کس رشتے سے ہو گئی۔ ہندی زبان پر جنتا یا متعصب کانگرسیوں کے اصرار نے مسلمانوں کے لئے ملازمت کے امکانات کو اور کم کر دیا۔

بھارتی حملے سے کچھ عرصہ پہلے رضاکار تنظیم فوج میں ضم کر دی گئی تھی۔ وہ فوجیوں کی طرح یونیفارم پہنتے تھے اور انہی کی طرح اسلحہ کا استعمال کرتے تھے باوجود اس کے اُن کو گرفتار کر کے اُن پر ایسے ناقابل برداشت مظالم کئے گئے جو شاید ہٹلر کے دور میں بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ بین الاقوامی ریڈکراس نے اس برتاؤ پر شدید احتجاج کیا جسے مسترد کر دیا گیا اور کسی قسم کی مدد دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔

نظام کی حیثیت | فوجی حملے اور حیدرآباد پر بھارتی قبضہ ہو جانے کے بعد نظام کی

اعلیٰحضرت میر برکت علی خان (مکرم جاہ) آصف جاہ ثامن کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد۔ اُن کے ساتھ میرا بیٹا محمود ہے

حیثیت یکسر بدل گئی۔ منشی سے کئے ہوئے معاہدے کے مسترد ہوتے ہی اُن کے سب شاہی اختیارات سلب کر لئے گئے اور جنرل چودھری نے حکمرانی سنبھال لی۔ اور سات پشتوں کا پُشتینی حکمران اقتدار سے محروم ہو کر کنگ کوٹھی میں ایک قیدی بن کر رہ گیا۔ اُنہیں کسی سے تنہا ملنے کی اجازت نہیں تھی اور اُنکے سب درباری موسمی پرندوں کی طرح ہوا کا رُخ دیکھ کر رفو چکر ہو گئے دوسرے لوگوں میں سے جنکے بارے میں جنرل چودھری کی حکومت کو ذرا بھی شبہ ہوتا تھا کہ اُنہیں نظام سے وابستگی ہے اُن پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ نہرو نے بظاہر اُن سے کوئی گستاخانہ رویہ اختیار نہیں کیا مگر گجرات سٹیٹ کے ایک نوا قند ایسے "مرد آہن" نے اُنہیں ہر طرح رسوا کرنے کی کوشش کی اُن کے سامنے تپائی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے کا ذکر آچکا ہے۔ یہ نئے حکمرانوں کے اخلاق عالیہ کا مظاہرہ تھا۔ جواہرات اور خزانے ریزرو بنک آف انڈیا میں منتقل کر دیئے گئے وجہ یہ بتائی گئی کہ کمیونسٹ تحریک اور اُس کی وجہ سے پھیلنے والی افراتفری کی وجہ سے وہ محفوظ نہیں ہیں انکم ٹیکس۔ دولت ٹیکس۔ سپر ٹیکس جنکا شاید نظام نے کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا۔ اُن پر لاگو کر دیئے گئے یہ اُن کی دُور اندیشی اور دانشمندی تھی کہ اس سیلاب بلا سے پہلے اُنہوں نے اپنے خانوادہ اور مسلمانوں کے لئے ٹرسٹ قائم کر دیئے تھے ورنہ ان ناگفتہ بہ حالات میں وہ بھی مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کی طرح کسمپرسی کی حالت میں پڑ جاتے کچھ عرصے کے بعد نظام کو راج پرمکھ بنا دیا گیا اور پھر وہ وہ بھی جاتا رہا۔ دولت اور اقتدار سے محروم ہو کر وہ مسلسل ۱۹ برس تک قفس میں بند ایک انتہائی رُسوائی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ میں اکثر سوچتا ہوں۔ کہ وہ کیسے دل و جگر کا انسان تھا کہ ان سب محرومیوں اور رسوائیوں کو اتنے برس تک کیسے برداشت کرتا رہا۔

نظام کا وارث نظام نے اپنے ولی عہد اعظم جاہ کو اُنکی نااہلی کی وجہ سے وراثت سے محروم کر دیا تھا اور اپنے پوتے مکرم جاہ کو اپنا وارث نامزد کر دیا تھا۔ اُن کی والدہ محترمہ

شاہزادی دُرِ شہوار جو سابق خلیفۃ المسلمین عبدالمجید کی صاحبزادی تھیں اپنے بیٹے کو باپ کی مخالفت کے باوجود اعلیٰ ترین درسگاہوں میں تعلیم دلوائی اور تربیت پر خاص نظر رکھی۔ شاہزادہ مکرم جاہ جو کیمبرج یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے نظام کے انتقال کے بعد ان کے وارث قرار پائے۔ اُن کی رسم جانشینی جس طرح سے منائی گئی وہ محض منہ چڑانے کی بات تھی اور ایک تماشہ تھا۔ اُس موقعہ کے ایک دعوت نامے کا عکس خود اپنی رسوائی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُنہیں ٹیکسوں کی بھرمار اور دیگر پابندیوں سے اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ حیدرآباد اب کبھی کبھار ہی آتے ہیں اور وہ بھی اپنے دادا کے بنائے ہوئے ٹرسٹوں کی نگرانی کے لیے وہ خود آسٹریلیا میں ایک فارم پر زراعت کرتے ہیں۔ ایک مختصر بادشاہت سے ٹریکٹر چلانے تک ایک طویل فاصلہ ہے جو حوادث زمانہ سے مجبور ہو کر انہوں نے بہت جلد طے کر لیا۔ اسے ہی انقلاب کہتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

اعلیٰحضرت نواب میر برکت علیخان بہادر مکرم جاہ نظام الملک آصفجاہ ثامن

کی

محفلِ رسمِ جانشینی میں

آپکی حضوری موجبِ خوشنودی حضرتِ اقدس و اعلیٰ ہوگی!

تاریخ	مقام	وقت
۲۵ - ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۶ھ	حویلی محل بیگم صاحبہ	دس ساعت صبح
م ۶ اپریل سنہ ۱۹۶۷ء	لباس :- دستار - اچکن	
بروز پنجشنبہ		نظرِ جواب
[illegible]		اے ڈی سی بحضور مبارک
		چومحلہ پیلس

نوٹ :- (۱) وقت سے ۱۵ منٹ قبل اپنی نشستوں پر رہیں
(۲) باب الداخلہ - صدر دروازہ خلوت مبارک

رسم جانشینی کا دعوت نامہ

خود فریبی کا ایک حسین مظاہرہ

حِصّہ سوم

پانچواں باب

طوفان کے بعد کراچی میں

سقوط حیدر آباد کے بعد میری سفارتی پوزیشن کا تعین

حیدر آباد پر قبضہ ہو جانے کے بعد جب میں نے حیدر آباد کے ملٹری گورنر کے احکامات کو ماننے سے انکار کر دیا تو اس بات کا اطمینان کرنا ضروری تھا۔ کہ حکومت پاکستان کے نزدیک میری پوزیشن کی نوعیت کیا ہے۔ عام طور پر یہ افواہ گرم تھی کہ بھارتی حکومت مجھے اپنی تحویل میں لینے کی کوششیں کرے گی۔ مگر حکومت پاکستان سے رجوع کرنے پر مجھے اطمینان دلایا گیا کہ وہ حیدر آباد پر بھارتی قبضے کو تسلیم نہیں کرتی اور جب تک حیدر آباد کا مقدمہ اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر ہے۔ میرا سفارتی رتبہ اور اُس سے متعلقہ مراعات علی حالہٖ قائم رہینگی میرے دل میں ایک خلش تھی کہ شاید بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں حکومت پاکستان اپنے رویّہ میں نظر ثانی کرے اور میں دشواریوں میں پھنس جاؤں۔ چنانچہ میں نے وزیر اعظم پاکستان سے اس بارے میں دوبارہ رجُوع کیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے غیر مبہم اور بڑے صاف الفاظ میں مجھے یقین دلایا کہ حیدر آباد کی حد تک کوئی بھی حکومت ہو اس پالیسی میں نظر ثانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس یقین دہانی کے بعد پاکستان ریلوے میں مجھے ملازمت کی ایک پیشکش کو وزیر اعظم نے خود واپس کرا دیا۔ اس کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا۔ کہ حکومت کی اس پالیسی کے تحت مجھ سے متعلقہ امُور کے بارے میں ایک لائحہ عمل طے کرایا جائے۔ تاکہ کسی قسم کا ابہام یا غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ میری درخواست پر

وزیراعظم نے ایک کمیٹی مقرر کر دی جو تمام حالات کا جائزہ لیکر کوئی لائحہ عمل تجویز کرے۔ اس کمیٹی نے جو چودہری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ۔ ملک غلام محمد وزیر مالیات۔ نواب معین نواز جنگ اور مجھ پر مشتمل تھی اپنے اجلاس مورخہ ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء نے اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل فیصلے کیے۔

(۱) ایجنٹ جنرل کی حیثیت برقرار رہے گی۔ اُسے اس بارے میں کسی قسم کی تشویش نہیں ہونی چاہیئے۔

(۲) حیدرآباد کی جو رقومات میں نے حکومت کی تحویل میں دے دی تھیں اُن کے بارے میں یہ طے ہوا کہ ایجنٹ جنرل اُسے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے اپنے صوابدید پر خرچ کرنے کا مجاز ہوگا اور چونکہ اس رقم سے متعلق قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ایجنٹ جنرل کی ہے۔ اسلئے اُسمیں سے ادائیگیاں اُس کے علم اور منظوری کے بغیر نہ ہو سکیں گی

(۳) ایجنٹ جنرل اور اُس کے سٹاف کے واجبات بھارتی حکومت نے منجمد کر دیئے ہیں اسلئے اُن کی ادائیگی کا حق امانت میں دی ہوئی رقم پر مقدم ہوگا۔ اس ضمن میں میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے غیر رسمی طور پر یہ بھی طے کرا لیا۔ کہ جتنی رقم بھی حیدرآباد ایجنسی کے اخراجات، حیدرآباد کے مقدمہ کی پیروی، قاسم رضوی اور وُزراء کے مقدمات اور دیگر متعلقہ اُمور کے لئے نکلوائی جائے اُسپر وزیر خزانہ کے توثیقی دستخط ثبت ہوں۔ بعد میں آنیوالے واقعات کے تلخ تجربہ نے مجھ پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنا میری سادہ لوحی تھی۔ یہ بتیا مجھ پر بعد میں پڑی اور جن دُشوار گذار حالات میں سے مجھے گذرنا پڑا۔ وہ اسی احتیاطی حماقت کا نتیجہ تھا۔

سقوط حیدرآباد کے بعد بھارتی ہائی کمیشن سے تعلقات

میرے تعلقات بھارتی ہائی کمشنر لائے سری پرکاش سے سقوطِ حیدرآباد تک کافی خوشگوار تھے اُس کے بعد بھی وہ مجھ سے اخلاق سے ملتے رہے۔ ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۸ء کے سانحہ کے بعد انہوں نے بڑے

دوستانہ انداز میں پیشکش کی کہ حیدرآباد واپس جانے کے لئے وہ ہر ممکنہ سہولت دینگے میں نے اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ میں حیدرآباد جا کر کیا کروں گا۔ اسپر جب انہوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ تو میں نے کہا "لائے صاحب۔ آپ جیسے عالم آدمی پر یہ بات واضح ہونی چاہیئے۔ کہ ہمارا مذہب۔ پہاڑوں دریاؤں اور عمارتوں سے محبت کرنا نہیں سکھاتا۔ حیدرآباد میرا محبوب وطن تھا۔ مگر جس چیز نے اُسے محبوب بنایا تھا۔ اب وہاں وہ باقی نہیں رہی۔ اسلئے اب مجھے اُس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے" اس کے بعد میرے اور اُن کے تعلقات میں ذہنی بُعد نظر آنے لگا۔ وہ تو خیر ایک علم دوست خاندان کے فرد تھے اور اپنی ذات سے بہت خلیق تھے ان کے جانشین سر سیتارام سے تو صاحب سلامت بھی نہ رہی۔

"فاتح قوم" کے نمائندے کا چھچھورا پن

اکتوبر ۴۸ء کے آخری ہفتے میں جب بھارتی حکومت کو یہ یقین ہو گیا کہ میرا رویہ نہیں بدلے گا اور میں اُنکے پے در پے آنیوالے احکامات کی تعمیل سے انکار کر دوں گا اور دباؤ اور دھونس کے لئے خصوصی پیامبروں کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ تو اُنکے رویّہ نے جارحانہ انداز اختیار کر لیا۔ چنانچہ ایک دن بھارتی ہائی کمیشن کا سکرٹری اپنے فوجی مشیر کے ساتھ جو کرنل کے یونیفارم میں تھا۔ میرے گھر پر آیا اور حیدرآباد کی فوجی حکومت کی طرف سے ایک خط مورخہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۸ء میرے حوالے کیا۔ اس خط میں یہ ہدایت تھی کہ میں اپنے قبضے میں حیدرآباد کی سب املاک اور کاغذات بھارتی ہائی کمیشن کے حوالے کر دوں۔ اس کے علاوہ اسمیں یہ نقطہ بھی اٹھایا گیا تھا کہ میرا تقرر صرف ۴ ماہ کے لئے ہُوا تھا۔ اور اس مدت میں کوئی توسیع نہیں ہوئی اس لئے میری کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے میں نے پوچھا کہ پھر وہ اب تک مجھے ایجنٹ جنرل کے لقب سے کیوں مخاطب کرتے رہے اگر بفرض محال میرے عہدے کی مدت جولائی میں ختم ہو گئی تھی تو میں نے لازماً کسی کو چارج دیا ہوگا۔ پھر آپ مجھ سے کیوں استفسار کرتے ہیں۔

اُس سے پوچھئے جس کو میں نے چارج دیا ہوگا۔ یہ کہہ کر میں نے وہ خط ایک طرف تپائی پر رکھ دیا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد سکریٹری نے پوچھا۔ کہ املاک کے حوالے کرنے کے بارے میں میرا کیا جواب ہے میں نے کہا ”کیا واقعی آپکو میرا جواب معلوم کرنے کی ضرورت ہے ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ میں ایجنٹ جنرل ہی نہیں ہوں۔ دوسری طرف سے آپ مجھ سے جواب مانگتے ہیں۔ بہرحال آپ یہی غنیمت سمجھئے کہ میں اپنے گھر پر آپسے اخلاق سے مل رہا ہوں۔ ورنہ جس طرح آپ ایک فوجی کرنل کو یونیفارم پہنا کر مجھے مرعوب کرنے کے لئے لائے ہیں یقیناً آپ سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوتا۔ کہ آپ اور آپکا فوجی ساتھی فی الفور میرے گھر سے نکل جائیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کہ آپ اس ملک میں اِس بھونڈے طریقے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کریں“۔ یہ دو ٹوک جواب سُنکر یہ دونوں ناخواندہ مہمان خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ میں نے اُن کے جاتے ہی وزارت خارجہ کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی اور درخواست کی۔ کہ میری سفارتی حیثیت کے پیشِ نظر میرے مناسب تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد رائے سری پرکاش نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ ”سُنا ہے آپ ناراض ہو گئے۔ میرے سٹاف نے تو صرف حکومت حیدرآباد کی مُرسلہ ہدایات آپکو پہنچائی تھیں“ میں نے جواب دیا ”رائے صاحب اگر وہ لوگ مہذب شریفانہ طریقے سے مجھے وہ مُراسلہ پہنچا دیتے تو میں سمجھتا کہ انہوں نے اسیطرح اپنا فرض انجام دیا ہے جس طرح میں دے رہا ہوں مگر جس طرح ایک فوجی یونیفارم کے ذریعہ مجھے ناجائز طور پر مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے مجھے تعجب ہے۔ کہ آپ جیسے عالم فاضل شخص نے ایسے بھونڈے طریق کار کی کیسے اجازت دیدی“ اسکا جواب وہ کیا دیتے۔

اس کے بعد بھارتی ہائی کمیشن نے حیدرآباد کی حکومت کا ایک مُراسلہ مجھ تک پہنچایا۔ جس میں ...... مجھے یہ نوید سنائی گئی تھی کہ حکم عدولی کی پاداش میں مجھے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۸ء سے حیدرآباد کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے!!

مزید ہتھکنڈے

اس کے بعد بھی بھارتی ہائی کمیشن اپنی چھچھوری حرکتوں سے باز نہیں آیا مجھے یقین ہے کہ انہی کے ایما سے ایک شخص فقیر کے بھیس میں میرے گھر میں گھس آیا۔ وہ یا تو کوئی ٹوہ لینے آیا تھا۔ یا اُس کی کوئی اور نیت تھی۔ اس واقعہ کے بعد حکومت پاکستان نے میرے گھر پر ایجنسی کے خرچ پر ایک پولیس گارڈ مقرر کر دیا اور ایک مسلح سب انسپکٹر پولیس ہر وقت میرے ساتھ رہنے لگا۔ یہ انتظام ۱۹۵۲ء تک قائم رہا۔ اسکے بعد بھارتی ہائی کمیشن سے میرا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ حیدرآباد کے سقوط کے فوراً بعد مجھے بھارتی ہائی کمیشن کی طرف سے اطلاع دی گئی تھی۔ کہ میں پاکستان میں حیدرآباد کی نمائندگی نہیں کرتا لیکن دلچسپ بات یہ تھی۔ کہ اُس کا دفتر مجھے دو تین برس تک ”ایجنٹ جنرل حیدرآباد“ کے لقب سے مخاطب کرتا رہا اور اپنے سفارتی مراسلات۔ کتابچے اور اعلامیے بھیجتا رہا۔ اور اگر میں ایک ضمناً اعلامیے کے بارے ایک سوال نہ کر بیٹھتا۔ تو شاید یہ سلسلہ جاری رہتا۔ میرے اس سوال نے ہلچل مچا دی اور مجھے ایک خصوصی مُراسلے میں اطلاع دی گئی۔ کہ وہ مجھے حیدرآباد کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا۔ اور ابتک یعنی ۲-۳ برس تک جو مُراسلات مجھے بھیجے گئے تھے وہ کالعدم سمجھے جائیں! میں نے طنز کرتے ہوئے جواب دیا کہ مجھے دو تین برس تک مسلسل ایجنٹ جنرل کے لقب سے مخاطب کرنے کے بعد یہ اعلان کہ میں حیدرآباد کی نمائندگی نہیں کرتا۔ بہت دلچسپ ہے۔ کیونکہ میرے پاس اُن کے دفتر کے اس شاہکار کا تحریری ثبوت موجود ہے باقی رہی یہ بات کہ باقاعدگی سے برسوں۔ بھیجنے والے مُراسلات کو میں کالعدم قرار دے دوں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔

حیدرآباد کے مہاجرین

سقوط حیدرآباد کے ساتھ حیدرآباد کے مہاجرین کی آمد شروع ہو گئی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے عہدہ داروں کا طبقہ ملازمتوں سے محروم ہو کر یا حالات کو ناسازگار پا کر چلا آیا۔ متوسط طبقہ جس کی گذران زراعت ٹھیکہ داری اور تجارت پر تھی وہ اپنے کاروبار کو اُجڑتا دیکھ کر مفلوک الحال بن کر آگیا۔ نیچے کا طبقہ اور

دیہاتوں میں رہنے والے قتل وغارت اور لوٹ مار کا شکار بن کر اور ہونے والے مظالم سے خوف زدہ ہو کر اپنی عزت وناموس کے تحفظ کی خاطر اپنے گھر بار کو اونے پونے بیچ کر چلے آئے۔ اِدھر مہاجرین کی یلغار تھی اور اُدھر وہ ناخوشگوار فضا تھی جو حیدرآباد کے المیے کے بعد بدقسمتی سے ملک میں حیدرآبادیوں کے خلاف قائم ہو گئی تھی۔ ان نامساعد حالات میں اُنکی آبادکاری کا مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ بن گیا تھا معاندانہ فضا کے علاوہ چند اور وُجوہات بھی تھیں جس کی وجہ سے یہ پیچیدگی بڑھ گئی۔ بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ قانون آبادکاری مہاجرین کا اطلاق حیدرآبادی مہاجرین پر نہیں ہوتا تھا۔ دلیل یہ تھی کہ چونکہ حیدرآبادی ایسے علاقے سے آئے تھے جس کا دعوٰے مکمّل سیاسی آزادی تھا۔ جسے حکومت پاکستان بھی تسلیم کرتی تھی اسلیئے وہ قانون آبادکاری کے تحت مہاجرین کی تعریف میں نہیں آتے یہ دلیل قانونی اعتبار سے کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو۔ مگر اس کے منفی نتائج سے حیدرآبادیوں کی مستقل آبادکاری پر بہت مضر اثرات پڑتے۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ جامعہ عثمانیہ کی اسناد کو حکومت پاکستان نے ابھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسلیئے ان اسناد کی بنا پر حصول ملازمت ممکن نہیں تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حیدرآبادی مہاجرین کی اکثریت نے اردو میں تعلیم پائی تھی جس کی مانگ اُس وقت (اور شاید اب بھی) پاکستان میں نہیں ہے چوتھی وجہ یہ تھی۔ کہ جس افراتفری میں مہاجرین اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے تھے ان کے پاس تاریخ پیدائش اور تعلیمی صداقت نامے نہیں تھے اور ملازمین کے پاس ملازمت کے کوائف نہیں تھے پانچویں وجہ یہ تھی کہ مہاجرین نے پاکستان پہنچتے ہی اپنی اپنی انجمنیں بنالیں اور بجائے اس کے کہ آبادکاری کے مسائل سے نمٹنے کے لئے حیدرآباد ایجنسی سے تعاون کرتے اُس کے خلاف معاندانہ پروپاگنڈا شروع کر دیا۔ میرے مشوروں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بتنگڑ بنا کر پھیلانے کو ہی حیدرآبادی بھائیوں کی خدمت سمجھا۔ اور بعض وقت مثلاً حیدرآباد کالونی کی زمین کے بارے میں حکومت پاکستان کو میری طرف سے دی ہوئی تفصیلوں

کا بھی پاس نہیں کیا۔ ان تنظیموں نے حیدرآباد ایجنسی کے مقابلے میں متوازی اداروں کی شکل دے دی۔ آبادکاری سے متعلق مختلف پہلوؤں پر قابو پانے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان کا مختصر ذکر آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

آبادکاری میں رکاوٹوں کو دُور کرنے کے اقدامات

سب سے پہلے حکومت سے درخواست کی گئی۔ کہ وہ حیدرآبادیوں کو قانون مہاجرین کے دائرہ سے خارج نہ کرے اُس زمانہ میں بھارتی حکومت کی طرف سے اعداد وشمار سے یہ تاثّر دیا جاتا تھا۔ کہ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائداد مسلمانوں کی املاک سے بہت زیادہ ہے میں نے گذارش کی۔ کہ جائداد کے گوشواروں میں اگر حیدرآبادی مسلمانوں کی جائدادوں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ تو ترازو کا پلڑا دوسری طرف جُھک جائے گا۔ ایک عرصہ تک اس نُقطہ نظر کو قبول نہیں کیا گیا مگر دو ڈھائی سال کے بعد مجھ سے حیدرآباد کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں کا مواد طلب کیا گیا اسے بہت احتیاط سے تیار کیا گیا۔ مگر پھر بھی وہ اعداد وشمار ایسے تھے۔ کہ بھارت کا مُنہ بند ہو گیا اس اقدام کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ حیدرآبادیوں کو مہاجر سمجھا جائے اور قانون کے تحت انہیں جائدادوں کی الاٹمنٹ میں حصہ ملے۔ اس طرح حیدرآبادی مہاجرین اس قانون کے دائرے میں آگئے اور انکی آبادکاری میں سب سے بڑی رُکاوٹ دُور ہو گئی حیدرآبادی کراچی شہر میں جہاں اُنکی اکثریت تھی آباد ہونا چاہتے تھے میری درخواست پر خواجہ شہاب الدین صاحب نے جو اُس وقت وزیر آبادکاری تھے ایک وسیع رقبہ اس مقصد کے لئے الاٹ کر دیا۔ جو اب حیدرآباد کالونی کے نام سے ایک عمدہ رہائشی کالونی بن گئی ہے۔

تعلیمی اسناد اور ملازمت کے کوائف کی عدم موجودگی بھی ایک اہم مسئلہ تھا کافی تگ ودو کے بعد حکومت پاکستان سے یہ طے کرالیا گیا کہ جس کسی حیدرآبادی کے پاس تعلیمی اسناد نہ ہوں۔ اُن کے بارے میں ایجنٹ جنرل اپنے طور پر تحقیقات کر کے اگر مطمئن ہو جائے تو وہ صداقت نامے جاری کر سکتا ہے جو حکومت پاکستان کے لئے قابل قبول ہوں گے۔

یہ ایک بہت بڑی سہولت تھی۔ جو مشرقی پنجاب اور دہلی کے مہاجرین کو بھی اس منظم طریقے سے میسر نہیں تھی۔

حیدرآبادی ایجنسی میں کوائف کی تصدیق کے لئے ایک خصوصی سیل قائم ہوا۔ جس نے بہت مفید کام کیا اور حکومت کی اس رعایت سے حیدرآبادی مہاجرین کو بہت مدد ملی۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان کے سرپرستوں کی شدید مخالفت کے باوجود جامعہ عثمانیہ کی اسناد بھی قبول کر لی گئیں۔ جس سے مہاجرین کو ملازمتوں کے حصول اور پبلک سروس کے امتحانات میں داخلہ کی سہولت مل گئی۔ اسی طرح پاکستانی عدالتوں میں حیدرآباد کے وکلاء کو پریکٹس کرنے کی اجازت مل گئی سول اور دفاعی محکموں کی ملازمت کے حصول میں ایک بڑی نفسیاتی رکاوٹ وہ غلط فہمی تھی جسکی وجہ سے حیدرآبادیوں کی وفاداری مشتبہ سمجھی جانے لگی تھی۔ میں نے نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب سے اس مسئلہ پر بالمشافہ تفصیلی گفتگو کی اور عرض کیا کہ ذرائع ابلاغ اور دوسرے حکومتی ذرائع سے اس غلط فہمی کو رفع کیا جانا چاہیئے جسکی وجہ سے ساری حیدرآبادی برادری کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگوں کے بارے میں شبہات ہیں تو بھی یہ کہاں لازم آتا ہے۔ کہ سب حیدرآبادی مہاجرین کو اس کی سزا دی جائے۔ انصاف کا تقاضا ہے۔ کہ حیدرآباد سے آنے والے درخواست گذاروں کے کوائف۔ ریکارڈ گذشتہ سرگرمیوں اور رجحانات کی مناسب جانچ پڑتال کی جائے اور اسی کے مطابق فیصلے کئے جائیں میری اس گذارش کو لیاقت علی خان نے بہت سکون اور توجہ سے سنا اور فیصلہ کیا۔ کہ ہمارے سب درخواست گذاروں کے کوائف کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جائے جسکا میں بھی ایک رکن ہوں۔ چنانچہ میرے دفتر میں ایک خصوصی تنظیم قائم کی گئی۔ جس کا کام یہ تھا۔ کہ وہ حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کے حالات سے واقف حضرات کا تعاون حاصل کیا جائے اور راویوں کے معتبر ہونے کا اطمینان کرنے کے بعد درخواست گذاروں کے کوائف تیار کئے جائیں۔ میرا زیادہ وقت اسی کام میں صرف

ہوتا تھا۔ مگر یہ بات قابل اطمینان تھی کہ اس تگ و دو کے بعد کمیٹی میں جو مواد پیش کیا جاتا تھا۔ الحمدللہ اسے من و عن قبول کر لیا جاتا تھا۔ اور کسی امیدوار کا صرف اس کا حیدرآبادی ہونا رکاوٹ نہیں بنتا تھا اس طریق کار سے ایک طرف جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں یا مفاد پسند عناصر نے پھیلائی ہوئی تھیں وہ خود بخود کم ہو گئیں۔ دوسری طرف اگر کسی درخواست گذار کو ملازمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا تو کم از کم مجھے ان کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان وجوہ کا علم ہو جاتا تھا جس کی بنا پر اسکی درخواست رد کر دی گئی تھی۔ یہ طریق کار اتنا مفید ثابت ہوا۔ کہ حکومت پاکستان نے اس کا دائرہ کار جنوبی ہندوستان سے آنے والے سب درخواست گذاروں پر لاگو کر دیا۔ میرے دفتر میں حیدرآبادی مہاجرین کی رجسٹریشن کا کام بھی باقاعدگی کے ساتھ جاری تھا۔ ان کے کوائف "انتظامی یا فنی تجربہ سے متعلق سارا مواد پوری چھان بین کے بعد مختلف محکموں اور وزارتوں کو بھیج دیا جاتا تھا۔ ریاست بہاولپور، قلات خیرپور میں اردو پڑھے لکھوں کے لئے ملازمت کے لئے کافی گنجائش تھی چنانچہ بہت سے لوگوں کو وہاں ملازمتیں مل گئیں اس کے علاوہ بہت سے مستحق طلباء کو وظائف یا اسکے داخلے کی فیسیں دی گئیں۔ ایجنسی کے محدود وسائل کے اندر بہت سے ضرورتمندوں کی بھی مدد کی گئی۔

اپنوں کی طرف سے معاندانہ رویہ حیدرآباد کے المیے کے بعد جو اسکے باسیوں کے خلاف جو فضا پیدا ہو گئی تھی اسکے پیش نظر اتنی اہم رعائتوں کو ایک کامیاب کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر مہاجرین کے بعض حلقوں میں انہیں ناکافی سمجھا گیا بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو۔ کہ اسے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ وہ اب بھی خوابوں کی دنیا میں بستے تھے اور اس تلخ حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ ملک جسکے باسی ہو کر وہ ایک خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کرتے تھے اب ختم ہو گیا ہے۔ انہیں اپنے لئے ایک نئی دنیا بنانا ہے اپنے مستقبل کو نئے حالات میں ڈھالنا اور سنوارنا ہے اب ہر چیز انکی مرضی کے

مطابق نہیں ہوسکتی اور انہیں حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہیں اپنے سفارت خانے کے اثر و رسوخ اور اختیارات کے بارے میں بھی خوش فہمیاں تھیں انہیں ایک بے ملک کے سفارت خانے کی مجبوریوں اور پابندیوں کا مطلق احساس نہ تھا اس مجبوری کی حالت میں وہ میزبان حکومت کے خوشدلانہ تعاون ہی سے کچھ کام کرسکتا تھا۔ اپنی مرضی ٹھونسنے کے موقف میں نہیں تھا۔ ان حالات میں جو کچھ بھی حاصل ہوسکا۔ بلاشبہ ایک کامیابی تھی۔ مگر ہمارے بھائی ان سے مطمئن نہیں تھے۔
حقیقت ناشناسی کے علاوہ ایک اور غلط فہمی انکے اس معاندانہ رویہ کی محرک ہوئی وہ سمجھتے تھے کہ حیدرآباد کا بہت سا سرمایہ میرے پاس ہے جس پر انکا بھی حق ہے لطف یہ تھا کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ وہ روپیہ حکومت پاکستان کی تحویل میں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ بار بار سوال کرتے تھے کہ کتنا روپیہ ہے اور اسے انکی تجویز کردہ سکیموں پر کیوں خرچ نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک انتہائی راز کا معاملہ تھا جس پر میں کھلم کھلا بحث کرنے سے احتراز کرتا تھا وہ اسے "ٹالنے" کا نام دیتے تھے چنانچہ روپیہ پیسے کے اس معاملہ کو وہ اخباروں میں لے آئے اور مجھے ایک منظم اخباری مہم کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض جرائد میں میرے خلاف سخت لہجے میں مضامین لکھے اور لکھوائے گئے۔ اس تشہیری طوفان بدتمیزی کے شاہکاروں کی ضخیم فائلیں میرے پاس اب بھی موجود ہیں انکی روح فرسا شاہ سرخیوں کو پڑھ کر اپنی "اوقات" کو سمجھنے کا مجھے موقعہ مل جاتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ کئی بار ٹیلیفون پر اور گمنام خطوط کے ذریعہ مجھے ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں اور گالیوں سے نوازا گیا۔ ۵۰ - ۱۹۴۹ء میں اس پروپگنڈے نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ حکومت نے نوٹس لیا اور مجھے کئی بار اپنی ناکردہ گناہ کردہ کوتاہیوں کی وضاحت کرنی پڑی۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ چاہے میں کتنا ہی برا آدمی ہوں۔ بیچارے حیدرآباد نے کیا قصور کیا ہے کہ میرے ذریعہ سے اسکی اس بری طرح رسوائی ہو رہی ہے۔ اصحاب مقصد نے مجھے صبر کی تلقین کی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس میں سب کچھ جاننے کے باوجود چند ایسے اصحاب بھی ملوث تھے جس نے مجھے بہتر رویہ کی توقع تھی جولائی اگست ۱۹۴۹ء میں یہ معاملہ غلام محمد صاحب کے نوٹس میں بھی آیا انہوں نے معین نواز جنگ سے اس بارے میں مشورہ بھی کیا مگر ان سب کوششوں کا نتیجہ صفر تھا اور معاندانہ فضا آخر وقت قائم رہی۔
بدرجہ مجبوری حیدرآباد ایجنسی کو چھوڑنے کے وقت مجھے اس فضا کی شدت کا اس وقت احساس ہوا۔ جب ایک ہم وطن بھائی نے جوش خطابت نے مجھے اس طعنہ کا مستحق قرار دیا۔" حیدرآبادی مہاجروں سے آپکی اسوقت دلچسپی ہوتی اگر آپ خود حیدرآبادی ہوتے" مفاد پرستی اگر اس حد تک بڑھ جائے تو پھر خلوص اور نیک نیتی کی کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہتی۔ ہم وطن بھائی کے اس طعنے کے پیچھے جو عصبیت کار فرما تھی وہ میرے لئے سوہان روح تھی یہ وہی فرزند زمین، والی غیر اسلامی عصبیت تھی جو بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنے وجود کا ثبوت دے رہی تھی۔

حیدرآباد کے ادیبوں اور اہل قلم کا تعاون | حیدرآباد سے ادیب شعرا ہر طبقہ کے اور اہل قلم کافی تعداد میں آچکے تھے ان سے پاکستان کے ادبی حلقے اور عوام واقف نہیں تھے اسکے لئے میں نے یہ پروگرام بنایا کہ وقتاً فوقتاً حیدرآباد ہوس میں سوشل اجتماع کئے جائیں جہاں ان کا باقاعدہ تعارف کرایا جائے اور انکی صلاحیتوں کو پاکستان میں اجاگر کیا جائے، ایک عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور سیاست والوں۔ صحافیوں اور ادیبوں میں ان کا موثر طریقہ سے تعارف ہوگیا ان لوگوں سے اکثر حضرات پاکستان کی ادبی ثقافتی دنیا میں، الحمدللہ سر فہرست ہیں۔

حیدرآباد کی ایجنسی کے بارے میں حیدرآباد مہاجرین کا عام رویہ | آباد کاری کے مسائل کے قطع نظر حیدرآبادی مہاجرین کے ایک بڑے طبقے کا رویہ حیدرآباد ایجنسی کے بارے میں مخالفانہ تھا۔ یہ بہت دل خراش داستان ہے۔ جسے بیان کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا چونکہ

میں نے حقائق کو بیان کرنے کے لئے قلم اُٹھایا ہے۔ مجھے مداہنت سے گریز کر کے تلخ حقائق کو بھی بیان کر دینا چاہیئے۔ عام طور پر یہ تاثر تھا جیسے بڑے بااثر طبقوں کا اور شاید بھارتی سفارتخانے کی شہ کا "اعزاز" بھی حاصل تھا کہ حیدرآباد تو ختم ہو گیا ہے۔ میں حیدرآباد ہوس میں بیٹھ کر اور پاکستان کی حکومت کی ہاں میں ہاں ملا کر "عیش" کیوں کر رہا ہوں۔ مستعفی وزارت کے ارکان صاحبان یہ جانتے ہوئے کہ استعفےٰ دینے کے بعد اُنکی کوئی قانونی حیثیت نہیں انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ وہ اب بھی مسند وزارت پر فائز ہیں۔ اور وہ احکامات دینے اور اپنی من مانی کرنے کے حقدار ہیں یا تو وہ میری سفارتی مجبوریوں سے واقف نہیں تھے یا اگر واقف تھے تو انہیں کوئی خاص پرواہ نہیں تھی کہ مجھ پر اُن کے غیر قانونی احکامات کی تعمیل کرنے میں کتنی اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے بیشتر عہدہ داروں نے خاص کر وہ لوگ جنکا حیدرآباد سول سروس سے تعلق رہا تھا پاکستان میں آکر مجھ سے کمال بے تعلقی کا اظہار کیا۔ بعض وقت تو اُن کے رویہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہیں حیدرآباد کی ایجنسی کے وجود کا بھی علم نہیں۔ اسلئے مجھ سے رابطہ پیدا کرنا دُشوار حالات میں ایک نازک مشن کی ذمہ داریاں اُٹھانے میں تعاون کرنا۔ مل بیٹھنا تو درکنار وہ میرے مشن کو جھٹلا دینے پر تلے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ انہیں یہ بات اکھرتی تھی کہ جس پوزیشن پر اُن کے بھائی بندوں میں کسی کو ہونا چاہیئے تھا اُن کے سنہری حلقے سے باہر مجھ سے حقیر آدمی کی وہاں کیسے رسائی ہو گئی۔ اگر اس کتاب کا حجم اسکی اجازت دیتا تو میں اپنے اس تاثر کی قلمی شہادتیں پیش کرتا۔ ایک بات تو دنیا جانتی تھی۔ کہ جب کبھی ان حضرات میں سے کسی کے کوائف ملازمت اور اسناد کی تصدیق حکومت کی طرف سے مجھ سے مانگی جاتی تھی تو اُنکی جھنجھلاہٹ صاف ظاہر ہو جاتی تھی۔ مہاجرین کے نچلے طبقے نے مجھ سے رابطہ رکھا۔ اُن کے خوشدلانہ تعاون اور اعتماد کے لئے میں اُن کا مشکور ہوں مجھے اسکا ثبوت اپنے سندھ، خیرپور، بلوچستان اور دوسرے علاقوں کا دورہ

کرنے پر ملا۔ جہاں انہوں نے اپنے چھوٹے ہوئے وطن کے وقار کو قائم رکھا اور اُس سے یک گونہ موانست کا اظہار کیا۔

غلط فہمیوں کا نقطہ عروج

یہ میری بدقسمتی تھی کہ اسطرح کی فضا میں حیدرآباد کے المیے کے بعد دو برس کی قلیل مدت میں ایک ناپسندیدہ اجنبی بن گیا۔ میرے گھر میں فیملی ماحول میں جو گفتگو ہوتی تھی وہ لفظ بہ لفظ حیدرآبادی حلقوں میں دہرائی جاتی تھی اور اُس کو توڑ مروڑ کر مخالفانہ ماحول کے لئے اسلحہ کا کام لیا جاتا تھا۔ غلط فہمیوں اور عناد کا یہ لاوا اُس وقت اچانک اُبل پڑا جب میں کراچی سے باہر گیا ہوا تھا میرے غیاب میں میری رہائش گاہ پر ایک مظاہرہ ہوا۔ جو شاید اُسی روایت کی تجدید تھی جس کے تحت ایک بار سر اکبر حیدری اور دو بار نواب چھتاری کی رہائش گاہوں پر مظاہرے ہوئے تھے وہ تو بڑے لوگ تھے اب مجھ جیسے حقیر کم مرتبہ کے آدمی کی باری تھی۔ موہٹا پیلس میں سیکرٹری وزارت خارجہ کے دفتر کی کھڑکی میرے مکان کی طرف کھلتی تھی انہوں نے اپنی آنکھ سے اس طوفان بدتمیزی کو دیکھا۔ اُنہیں کراچی سے میری عدم موجودگی کا علم تھا اور صورتحال معلوم کرنے کے بعد اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ اور مظاہرین کو تنبیہ کی کہ انہیں اپنے ایجنٹ جنرل سے جو بھی اختلاف ہوں۔ چونکہ حکومت اُسکے تحفظ کی ذمہ دار ہے اسلئے اس قسم کے مظاہروں کو برداشت نہیں کرے گی۔ میری کراچی واپسی پر انہوں نے مجھے ایک خفیہ رپورٹ دکھائی جسمیں اس مظاہرے کے منصوبے کی ساری تفاصیل درج تھیں اسی موقعہ پر میرے ایک مہمان بھی جو پانچ برس سے میرے ہاں مقیم تھے رخصت ہو گئے۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی مجھے اس بات کا رنج ہے۔ کہ ہموطن بھائیوں نے بجائے اس کے کہ اپنے ایجنٹ جنرل کے وقار کو اسطرح مجروح ہوتے دیکھ کر اظہار افسوس کرتے "مہمان" کا حیدرآباد ہوس سے رخصت ہونے پر ایک اور طوفان کھڑا کر دیا۔ جب حقیقت ناشناسی اس درجہ تک پہنچ جائے۔ تو اُسکا کوئی علاج نہیں۔ اس سارے پروپاگنڈے کے دور میں میر لائق علی جو حیدرآباد

کے سقوط تک میری تمام خدمات کے دل سے معترف تھے پاکستان میں آنے کے بعد مجھ سے نامعلوم وجوہ سے بری طرح کھنچ گئے جیساکہ میں اوپر بتا چکا ہوں یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں ایک ملاقات میں انہوں نے مجھ سے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ حکومت پاکستان سے میری پوزیشن کو چیلنج کرینگے (ضمیمہ) اب اسکے بعد کیا رہ جاتا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا۔ اب سفارت بس چند روز کی بات ہے۔

اس سارے واقعہ سے حیدرآبادیوں کی جو رسوائی ہوئی سو ہوئی۔ ایجنٹ جنرل کا وقار بڑی طرح مجروح ہوا۔ حکومت سمجھنے لگی کہ میں حیدرآبادیوں میں مقبول نہیں۔ میں شکایتاً نہیں بلکہ بھرے دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ حقیقت پسندی سے کام لیتے تو چاہے میں انکی نظروں میں کیسا ہی گیا گذرا تھا میرا سفارتی وقار انہی کے مفاد میں استعمال ہوسکتا تھا یہ تو میں جانتا تھا کہ ایک شکست خوردہ قوم میں ذہنی انتشار اور اخلاقی پستی کا پیدا ہونا قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔ مگر یہ بات کہ یہ پستی اس حد تک بھی جاسکتی ہے میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔ ان سب واقعات کا جائزہ لینے کے بعد میں شاید یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حیدرآبادی سفارت خانہ بند ہونے کے المیے میں میرے ہموطن بھائی بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ میں ابتک نہیں سمجھ سکا۔ کہ اسکے بند ہونے سے حیدرآباد کی آزادی کے موقف کی کیا خدمت ہوئی۔ حیدرآبادیوں کو من حیث الجماعت کیا فائدہ پہنچا اور حیدرآباد کے اللعظمت اللہ کے پرچم جو اس کی آزادی نشان تھا سرنگوں کرکے کیا حاصل ہوا۔ سفارت خانے کے بند ہونے کے حادثہ سے بعض مفاد پرست حضرات کی انا کی تسکین تو ضرور ہوئی ہوگی مگر حیدرآبادیوں کو بہت نقصان پہنچا۔ اس نقصان کا حال ان ہم وطن بھائیوں سے پوچھئے جو اس کے بعد اپنے کوائف اور اسناد کی تصدیق کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔

حصّہ سوم

چھٹا باب

طوفان کے بعد کراچی میں

(۲)

لائق علی کی کراچی میں اچانک آمد حیدرآباد پر بھارتی قبضے کے بعد لائق علی اور ان کے وزراء گرفتار کرلئے گئے۔ لائق علی اپنے ہی گھر میں نظر بند تھے جہاں پولیس کا کڑا پہرہ تھا۔ اس کڑی نگرانی میں وہ کس طرح اور کن حالات میں بھارتی پولیس کو دھتا بتاتے ہوئے کراچی پہنچ گئے۔ اس بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں اور ابتک ہوتی ہیں اور بہت سی روایتیں زبان زد عام ہیں مجھے اس بارے میں کوئی ذاتی علم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ انکے اسطرح آجانے سے چند روز پہلے غلام محمد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں عنقریب ایک اچھی خبر سنونگا جب میں نے کھوج لگانے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا، چند روز انتظار کرو۔ خود پتہ چل جائے گا۔" اگر اس "اچھی خبر" سے انکا مطلب لائق علی کی آمد تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں پہلے سے اسکا کیسے علم ہوا۔ کیا یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور کیا وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ اس منصوبے میں شریک تھے اور اگر تھے تو کسطرح اور اگر انہیں علم تھا تو ظاہر ہے کہ حکومت پاکستان بھی اس سے واقف تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسمیں ایسی کیا خاص بات تھی کہ مجھے اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ بھارت کے اخبار بلٹز[لہ] نے یہ خبر شائع کی تھی کہ فرار کا سارا منصوبہ ایک امریکن شہری کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا۔ عام طور پر یہ

لہ۔ بھارتی اخبار بلٹز اشاعت مورخہ ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء

مشہور ہے کہ یہ منصوبہ لائق علی کے ایک قریبی دوست نے بنایا تھا اور تمام انتظامات اُس نے کراچی اور حیدر آباد کے درمیان کئی بار سفر کر کے مکمّل کیا تھا اور ضروری دستاویزات حاصل کی تھیں ان سب مراحل کو طے کرنے میں پاکستان سے متعلق سرکاری ذرائع کے تعاون کی بھی ضرورت پڑی ہوگی۔ غلام محمد کو پیشگی علم ہونا ایک امریکن کا ذکر اور سرکاری ذرائع کا حصُول ان سب باتوں سے بہت سے قیاسات کئے جا سکتے ہیں۔ بیان یہ کیا جاتا ہے، کہ لائق علی ایک پردہ دار موٹر میں سوار ہو کر ایک غیر معروُف سٹیشن سے بمبئی کے لئے ٹرین میں سوار ہوئے اور پہلے سے کئے ہوئے انتظام کے تحت کراچی کے لئے روانہ ہو گئے ایک روایت یہ ہے کہ پرمٹ میں اُنکا نام احمد علی لکھا گیا تھا۔ دوسری روایت میں غلام احمد بتایا گیا ہے ایک اور روایت جو میری نظر میں ناقابل یقین ہے کہ وہ کراچی جانے سے پہلے نظام آباد اور بودھن (شکور نگر) بھی گئے تھے۔ ان سب روائتوں کا منبع حیدر آباد کی خفیہ پولیس کے سربراہ فضل رسول خان کو بتایا گیا ہے اس قسم کی اور اسی نوعیت کی لاتعداد روائیتوں کو پاکستان اور بھارت میں بڑی سنسنی خیز سرخیوں سے شائع کیا گیا۔ بہر حال وہ جیسے بھی آئے اُنکی آمد ہم سب لوگوں کے لیے جن کا تعلق حیدر آباد کی آزادی کے موقف سے تھا باعث مسرّت اور انبساط تھا اور یہ اُمید بندھتی تھی کہ غلط فہمیوں کی وجہ سے ہماری صفوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا ہے وہ قصہ ماضی بن جائے گا۔

میرے لیے ایک تکلیف دہ صوُرت حال ایک دن مجھے اچانک پتہ چلا کہ دو دن ہوئے لائق علی کراچی پہنچ چکے ہیں اور زیر تعمیر میٹروپول ہوٹل کے ایک کمرے میں مقیم ہیں۔ مجھے جہاں اس خبر سے خوشی ہوئی وہاں فطرتی طور پر اس بات کا رنج تھا کہ مجھ سے اتنی عیزیت کیوں برتی گئی اور سارا منصوبہ مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھا گیا۔ اُن کے کراچی پہنچنے کی اطلاع ملی تو دو دن کے بعد اور وہ بھی ایک غیر متعلق شخص کے واسطے سے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے اُنکی آمد کا معین نواز جنگ کو علم تھا۔ تقی الدین واقف تھے اور

اُن کے سب متعلقین اور احباب جانتے تھے نہیں معلوم تھا تو اس بندۂ ناچیز کو جو اُسوقت بھی پاکستان میں حیدر آباد کی نمائندگی کر رہا تھا اور جس سے وہ چھ سات مہینوں کے سفارتی دور میں انتہائی شفقت آمیز انداز میں مخاطب کر کے یگانگت کا اظہار کرتے رہے تھے اور پھر سقوُط حیدر آباد کے بعد بھی انہوں نے اسی شفقت آمیز انداز میں خطوُط لکھے۔ ۹--۱۰(ضمیمہ جات) ان خطوُط سے پتہ چلتا ہے کہ کراچی پہنچنے تک انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی میں بجا طور پر توقع کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے اُسی محبّت اور شفقت سے ملیں گے مگر میں نے اُنکے رویّہ میں سراسر اجنبیّت اور رکھائی کا رنگ دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان دو دنوں میں میرے خلاف اُنکے خوب کان بھرے گئے ہیں اور انہوں نے میری بات سُنے بغیر میرے خلاف یک طرفہ فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اُنکی کشیدگی کی اصل وجہ نہ اُس وقت میری سمجھ میں آئی اور نہ اب تک قابل فہم ہے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انہوں نے اپنے آخری پیغام میں میری ناچیز خدمات کا بڑی محبت اور خلوُص سے اعتراف کیا تھا اور کہا تھا کہ اُن خدمات کا صلہ مجھے دوسرے جہاں میں ملے گا[1]۔ اب یکایک یہ سب کیا ہو گیا کیا میرا یہی "جرُم" تھا کہ میں نے اپنی تحویل میں رقومات کو امانت کے طور پر حکومت پاکستان کے پاس رکھوا دیا تھا۔ میں نے خود تو کوئی خورد برد نہیں کیا تھا پھر یہ آزردگی بے سبب کیا معنی؟ اُس وقت کے حالات میں میرا اقدام یقیناً صحیح تھا۔ خود لائق علی نے جب ان رقومات کو بعد میں اپنے قبضے میں لے لیا تو انہیں بہتان طرازی اور دشنام کا نشانہ بننا پڑا۔ میں نے اگر بروقت اس بات کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا تو اُسے مستقل شدید ناراضگی کا تو باعث نہیں بننا چاہیئے تھا اب یہ اور بات ہے۔ کہ میزبان حکومت نے اس بارے میں اپنی یقین دہانیوں سے گریز کیا جسکی وجہ سے میری رسُوائی ہوئی اور وہ میرے لئے "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے" والی بات ہو گئی۔ بہر حال اُنکی آمد کے بعد "برادر عزیز" جس

[1] حصہ سوم۔ تیسرا باب

اعتماد کا مستحق تھا وہ اُسے انتہائی کوشش کے باوجود حاصل نہیں ہوا۔ میں نے کئی بار اُن سے اس بے رخی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تاکہ حکومت پاکستان کی تحویل میں روپیہ دینے کے علاوہ اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو تو میں تلافی کی کوشش کروں مگر کامیابی نہیں ہوئی بلکہ اس کوشش کے دوران انہوں نے مجھے غیر مبہم صاف الفاظ میں یہ دھمکی دی کہ وہ حکومت پاکستان سے میری پوزیشن کو چیلنج کریں گے[2]۔ میں یہ سن کر سکتے میں آگیا۔ اور بڑے افسوس کے ساتھ عرض کیا "آپ نے ہی مجھے ایجنٹ جنرل بناکر بھیجا تھا۔ میں نے خود اس عہدہ کے لئے درخواست نہیں کی تھی بلکہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے انکار کردیا تھا۔ پھر آپ کے اصرار پر قومی خدمت سمجھ کر اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔ آپ نے متعدد بار میری حقیر خدمات کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا، حتیٰ کہ اپنے آخری پیغام میں تحسین آمیز کلمات سے نوازا۔ اب اگر آپ اُس نئی بنائی عمارت کو ڈھا دینے چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس اقدام سے حیدرآباد کی آزادی کے موقف کو تقویت پہنچے گی اور حیدرآباد کے پرچم کا سرنگوں ہونا حیدرآبادیوں کے مفاد میں ہوگا تو آپکی مرضی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اپنے فرائض کو اپنی سمجھ کے مطابق انشاءاللہ اس وقت تک انجام دیتا رہونگا جب تک کہ میزبان حکومت اسکی اجازت دے" یہ سن کر وہ چپ ہوگئے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس گفتگو سے پہلے ایکبار وہ میرے ہاں کھانے پر آئے اُس کے بعد میرا اُن سے تعلق بالکل رسمی ہوکر رہ گیا۔ مجھے اس بات کا شدید قلق تھا کہ جب ہمیں اتحاد اور یکجہتی کی شدید ضرورت تھی ہماری صفوں میں انتشار ہوگیا۔ کون جانتا ہے۔ کہ ایک شکست خوردہ قوم کے فرزند اپنے اختلافات کو منظر عام پر لائیں اور اختلافات بھی ایسے جسے طرفین میں سے ایک کو اُسکی نوعیت کا بھی علم نہ ہو۔ مگر اسکو کیا کیجئے۔ کہ تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے ساتھیوں نے کبھی میرے نقطۂ نظر پر توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اور بلا وجہ مجھے مورد الزام ٹھہرایا مناسب ہے کہ اس موضوع پر زیادہ کچھ کہنے کے بجائے میں اُس خط وکتابت کو

[2] ۲ - ضمیمہ جات - ۱۰

شائع کردوں[1]۔ جو لائق علی اور میرے درمیان ہوئی اس گفتگو کے بعد جس میں میری پوزیشن کو چیلنج کرنے کی دھمکی دی گئی تھی مجھے یقین ہوگیا۔ کہ میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں جس وزیراعظم نے مجھے اس مشن پر بھیجا تھا وہ بلاوجہ مجھ سے بے رخی اختیار کررہا ہے۔ حیدرآبادی بھائی یوں ناراض ہیں اس کے بعد ایجنسی کیسے قائم رہ سکتی ہے اگر بالغرض قائم بھی رہی تو اس کا کیا اثر و رسوخ ہوسکتا ہے۔

ایک اجنبی کی آمد ایک دن میں نے ایک اڑتی ہوئی خبر سنی کہ حیدرآباد کا نائب صدر اعظم پنگل وینکٹ ریڈی چھپ چھپاکر پاکستان آگیا ہے اگرچہ کہ یہ شخص لائق علی وزارت میں اہم عہدہ پر فائز تھا اور انکا ہمنوا تھا مگر میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اُسے مسلمانوں سے اتنا لگاؤ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر مسلمانوں کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آجائیگا اسلئے میں نے اس خبر کو اہمیت نہیں دی۔ چند روز کے بعد وزارت خارجہ کی طرف سے اطلاع ملی کہ ایک شخص پنگل۔ ایس۔ ریڈی جو اپنے آپکو حیدرآباد کا باشندہ بتاتا ہے مشرقی پاکستان پہنچ چکا ہے اور کراچی آنے کا خواہشمند ہے اور مجھ سے پوچھا گیا کہ اُس کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ میں نے اس شخص کا کبھی نام نہیں سنا تھا اور وہ کیوں اور کن حالات میں پاکستان پہنچا ہے یہ بھی واضح نہیں تھا۔ اس وجہ سے میری نظر میں قرین مصلحت یہی تھا۔ کہ اُسے حیدرآباد ایجنسی کے صدر مقام سے دور ہی رکھا جائے لائق علی کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ مغربی پاکستان آجائے تو کوئی حرج نہیں اگر وہ اچھا آدمی ہے۔ تو اُسے بھارت کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے یہ محض خوش فہمی تھی کوئی ہندو اسطرح اپنے وطن کے خلاف کام نہیں کرے گا۔ بہرحال لائق علی کی رائے کے مطابق اُسے کراچی آنے کی اجازت مل گئی۔ چند روز کے بعد میں نے ایک دن اپنی خوابگاہ کی کھڑکی سے دیکھا کہ میری رہائش گاہ کے پھاٹک پر ایک شخص سفید کھدر کے کپڑوں میں ملبوس حیدرآبادی پرچم کو سلامی دے رہا ہے۔ اُسکے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا تو پتہ چلا کہ یہی پنگل۔ ایس ریڈی ہے اُس نے مجھے بتایا۔ کہ چونکہ

[1] ضمیمہ جات - ۱۰

حیدر آبادی اکابر جنگ آزادی میں ناکام ہو چکے ہیں اسلئے وہ بھارت کے خلاف آندھرا تحریک آزادی کی مہم کا آغاز کرنے والا ہے جس کا مقصد نظام کے اقتدار کی بحالی ہوگا۔ میں حیران تھا کہ ایک غیر معروف ہندو کو نظام اور مسلمانوں کے اقتدار میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور آندھرا کے کسانوں کی جمہوری ریاستوں کے اتحاد اور نظام کی حکومت میں کیا قدر مشترک ہو سکتی ہے۔ وہ بڑا باتونی تھا۔ اپنی طویل گفتگو میں اُس نے بتایا کہ فرانس اور پرتگال جیسے ممالک سے جن کے تعلقات اُس وقت بھارت سے ذرا کشیدہ تھے اُس کا قریبی تعلق ہے اور وہ ہر قسم کی مدد دینے کے لئے تیار ہیں یہ بیان میری خوش اعتقادی کا بڑا امتحان تھا بہرحال میں نے اُس کی باتیں توجہ سے سُنیں اور اُسکی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اُسکی گفتگو کا لبِ لباب میں نے اُسیدن وزارت خارجہ کو بھیجدیا۔

آندھرا حکومت کے قیام کا ڈھونگ اُس کے بعد بھی وہ کئی بار آیا اور خطوط بھی لکھتا رہا۔ ایک دن اُس نے مبینہ آندھرا حکومت کی طرف سے سر سیتارام ہائی کمشنر برائے بھارت کے نام ایک چھپا ہوا خط دکھایا جس پر اُس مبینہ حکومت کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اس کی دستخط تھی اُس خط میں یہ اعلان تھا کہ آندھرا حکومت ۲۵ اگست ۱۹۵۰ء کو قائم ہو چکی ہے اور وہ ۱۶ ستمبر ۱۹۵۰ء کی آدھی رات کو بھارت کے خلاف "پولیس ایکشن" کرے گی۔ میرے لیے یہ سب باتیں ایک دلچسپ تماشے سے زیادہ نہ تھیں۔ لیکن جب اُس نے کمال سنجیدگی سے آندھرا حکومت کی طرف سے مجھے پاکستان میں نمائندگی کی پیشکش کی۔ تو میں اپنی سنجیدگی کو قائم نہ رکھ سکا۔ میں نے جواب دیا "قطع نظر اس کے کہ آپ کے اعلانات اور دعوؤں میں کتنی حقیقت ہے یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں۔ کہ آپ کی یہ پیشکش مجھے اسلئے کی گئی ہے کہ میں اسوقت نظام کا نمائندہ ہوں۔ جب میں نظام کی نمائندگی کے عہدے سے سبکدوش ہو جاؤں گا تو آپ کو شاید میری ضرورت باقی نہ رہے۔ اسلئے آپ پہلے آندھرا حکومت کو قائم کیجئے۔ پاکستان سے اُسے تسلیم کرایئے۔ تو پھر میں آپ کی پیشکش پر غور کروں گا" میرے جواب پر اُس نے بہت مایوسی کا اظہار کیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہ اگر ہم میں صحیح

PROVISIONAL GOVERNMENT
OF
The Union of Peasant Republics of Hyderabad

Comprising

THE PEASANT REPUBLIC OF TELENGANA — THE PEASANT REPUBLIC OF ROYALASEEMA (CEDED DISTRICTS)
THE PEASANT REPUBLIC OF MARATHWADA — THE PEASANT REPUBLIC OF ANDHRADESA (NORTHERN CIRCARS)
THE PEASANT REPUBLIC OF KARNATAKA — THE PEASANT REPUBLIC OF BERAR

Ministry of Foreign Affairs
AZAD HYDERABAD
TELENGANA
[illegible] HYDERABAD TERRITORY

26th August 1950.

To
His Excellency Sir Sita Ram,
High Commissioner for Bharat in Pakistan,
Clifton,
Karachi.

Sir,

I have been asked by the Provisional Government of the Union of the Peasant Republics of Hyderabad comprising the unit Republics of Telengana, Marathwada, Karnataka, Royalaseema (ceded districts) and Andhra Desa (northern circars) which has been proclaimed on 25th August 1950 to notify the Government of Bharat through you that on the midnight of thirteenth of September 1950 the TELENGANA REPUBLIC will launch police action against your occupied forces, who apart from their illegal occupation have been committing attrocities on innocent peasants. I am giving you this formal notice according to the established principals of practice and in persuance of the policy laid by the "FATHER OF YOUR NATION" [illegible] GANDHI whose followers the leaders of your Government claim to be [illegible] not really follow.

I may in this connection draw the attention of your Government that they (your Government) have marched troops into Sovereign Hyderabad State, despite the fact that the Hyderabad dispute was pending before the U. N. O. on thirteenth September two years ago without any notice or formal declaration of war. Our main intention in launching police action is just to repel and drive the unlawful occupants of Hyderabad, and my Government has no designs of any aggression on Bharathi territory.

Though all is fair in love and war we would like to be as fair as possible and will adopt all reasonable methods which please note.

Yours truly.
For and on behalf of THE UNION OF PEASANTS REPUBLICS OF HYDERABAD.

(Pingal S. Reddy)
FOREIGN MINISTER.

پنگل ریڈی کی طرف سے آندھرا حکومت کے قیام کا اعلان

جذبۂ آزادی ہوتا تو ہم اقوام متحدہ میں وفد کو کسمپرسی کی حالت میں نہ چھوڑ دیتے اور اب جبکہ آزاد آندھرا حکومت قائم ہو رہی ہے اُس سے ہماری بے تعلقی ہمارے جذبۂ آزادی کو جھٹلاتی ہے۔" اس کے بعد اُس کا آنا جانا ذرا کم ہو گیا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار مجھے اپنی تحریک آزادی کے بارے میں ہلکارتا رہا۔ جب مجھے بدرجۂ مجبوری کراچی چھوڑنا پڑا۔ تو اُس نے ایک خط میں مجھے کافی جھاڑ پلائی اور کہا کہ اتنے برس حیدرآباد کا پرچم بلند رکھنے کے بعد اُسے اُتار دینا غداری کے مترادف ہے۔ اگر میرا فیصلہ حتمی ہے تو بہتر یہ ہے۔ کہ وہ پرچم میں اُس کے حوالے کر دوں!! کچھ عرصے کے بعد پاکستان کی خُفیہ پولیس نے مجھ سے اُس کی خط و کتابت کی فائل طلب کی۔ وہ کیا شخصیت تھی اُسے کس نے اور کس مقصد سے بھیجا گیا تھا۔ یہ واضح نہیں ہے۔ میری نظر میں یہ بھارتی سفارت خانے کی ایک چال تھی جو اُس کے ذریعہ ہمیں "ٹٹولنا" چاہتا تھا۔ اُسکو مغربی پاکستان آنے کی اجازت دینا ہی غلطی تھی بہرحال ۲۸ اگست ۱۹۵۰ء کو قائم ہونے والی حکومت کا ابھی تک سُراغ نہیں ملا۔

حیدرآباد ٹرسٹ کے قیام کی کہانی جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ حکومت پاکستان کی تحویل میں رکھائی جانے والی رقومات کے بارے میں یہ طے ہوا تھا کہ اسمیں سے جتنی بھی رقم خرچ ہو۔ وہ میرے صوابدید اور ذمّہ داری پر ہوگی۔ اور جب تک یہ رقم حکومت کے پاس ہے۔ وہ میری امانت سمجھی جائے گی۔ لائق علی کے آنے کے بعد ہی یہ اصرار کیا جانے لگا۔ کہ اُسے حکومت سے لیکر ایک ٹرسٹ قائم کیا جائے اور اُس کی آمدنی کو حیدرآبادیوں کی آبادکاری پر صرف کیا جائے۔ میرا نقطۂ نظر تھا۔ کہ جو رقم "جنگ آزادی کے لئے بطور اسلحہ" نامزد کر دی گئی تھی اُسے کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسطرح ہماری جدّوجہد کا اصل منصوبہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ پھر یہ روپیہ ایک انتہائی راز کا معاملہ ہے۔ اُس کی کھُلے بندوں تشہیر سیاسی اُلجھنوں کا موجب ہو گی۔ اسلیئے اُسے سرمایہ کاری میں لگانا مناسب نہیں کیونکہ اس طرح وہ راز جو انتہائی کاوش

سے قائم رکھا گیا تھا افشا ہو جائے گا۔ مزید براں یہ رقم اتنی وافر بھی نہیں جو حیدرآبادیوں کی آبادکاری کا پورا بوجھ برداشت کر سکے اگر آبادکاری کے لئے صنعتوں کا قیام ضروری ہے تو عام طریقے کے مطابق سرمایہ کاری کی جائے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا۔ کہ جو سرمایہ کاری صرف حیدرآبادیوں کے روپیہ سے کی جائے گی اُس کا فائدہ بھی لامحالہ حیدرآبادیوں تک محدود ہوگا جو میری نظر میں ایک غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا۔ پاکستان میں اگر بھی اگر حیدرآبادی اور غیر حیدرآبادی کی تفریق چاہے وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو۔ حیدرآبادیوں کے وسیع تر مفاد میں نہیں ہوگی حکومت نے میرے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کیا اور ایک موقعہ پر وزیر اعظم نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا۔ کہ امانت میں رکھائی ہوئی رقم سے کسی ٹرسٹ کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ٹرسٹ کے قیام کیلئے وزیر اعظم پر دباؤ ایک دن لیاقت علی خان نے مجھے اچانک طلب کیا اور کہا کہ اُن پر ٹرسٹ کے قیام کے لئے بہت دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اور بدرجۂ مجبوری انہوں نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے اور چونکہ وہ مجھے اس جھنجھٹ میں پھنسانا نہیں چاہتے اسلیئے ٹرسٹیوں میں مجھے شامل نہیں کیا گیا۔ میں نے اس فیصلہ پر شدید ردِّعمل کا اظہار کیا اور انہیں یاد دلایا کہ یہ رقم میں نے بڑی التجا کر کے حکومت کی تحویل میں رکھائی تھی اب یہ فیصلہ جسے وہ خود "جھنجھٹ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اُن تمام یقین دہانیوں اور وعدوں کے خلاف ہے جو حکومت نے رقم کو تحویل میں لیتے ہوئے مجھ سے کئے تھے میں نے اُن سے یہ پُوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ آخر وہ کونسا دباؤ تھا جس کا وہ بھارت کو مکّہ دکھانے والا جری مرد بھی تاب نہ لا سکا۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ٹرسٹ کی کاروائیوں سے مجھے بے تعلق کر کے رُسوائی سے بچا لیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ بڑی ناانصافی ہے کہ جس رقم کے لئے میں اخلاقی اور قانونی طور سے ذمّہ دار تھا اور جس کے لئے میں نے دو تین برس تک اپنوں اور غیروں کی دُشنام طرازی برداشت کی ہے۔ اُس سے

مجھے یوں قطعی طور پر بے تعلق کر دیا جائے۔ نوابزادہ نے میرا ذُو محمل اپنے روائتی انداز میں خاموشی سے سُنا۔ میری بات ختم ہوئی۔ تو فرمایا: "مشتاق۔ مجھے تم سے اتفاق ہے میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ مجبور ہو کر کیا ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ایسا انتظام کر دیا گیا ہے۔ کہ ایجنسی کے اخراجات کے لئے علیحدہ رقم محفوظ کر دی جائے تم اپنے فرائض کی انجام دہی میں ٹرسٹ کے رحم و کرم پر نہیں ہو گے"۔ چند دنوں کے بعد مجھے سرکاری طور پر اطلاع دی گئی۔ کہ ایک کروڑ ۳ لاکھ کی رقم سے ٹرسٹ کے قیام کی اجازت دے گئی ہے۔ یہ سب میری مرضی اور شدید احتجاج کے باوجود ہوا لیکن سکرٹری جنرل چودھری محمد علی اور سیکرٹری وزارت خارجہ اکرام اللہ کے واسطے سے مجھے یقین دلایا گیا کہ

(الف) حیدر آبادیوں کی آبادکاری سے متعلق تمام اخراجات کی بابجائی ٹرسٹ کی ذمہ داری ہوگی۔(ب) ۱۱ لاکھ کی رقم ایجنسی کے اخراجات اور ایجنٹ جنرل کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے محفوظ رہے گی۔(پ) اس اقدام سے ایجنٹ جنرل کی پوزیشن متأثر نہیں ہوگی اور حیدر آباد کے مسئلہ پر حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ابھی ان یقین دہانیوں کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ۶ لاکھ بارہ ہزار کی مزید رقم ایجنسی کے لئے محفوظ رقم میں سے ادا کر دی گئی۔ لُطف یہ ہے کہ اس رقم میں ۴ لاکھ ۲۲ ہزار کی رقم حیدر آبادی وظیفہ خواروں کی ادائیگیوں سے متعلق تھی۔ میں نے احتجاج کیا کہ جب یہ ایکبار طے ہو چکا ہے کہ آبادکاری پر ہونے والے اخراجات کی ادائیگی ٹرسٹ کی ذمہ داری ہے تو پھر اس ایجنسی کے خاص فنڈ میں اسکی ادائیگی کا کیا جواز ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف یہ کہا جا رہا کہ ایجنسی قائم رہے گی اور ٹرسٹ کے قیام سے اُسکی پوزیشن متاثر نہیں ہوگی دوسری طرف اُسے تمام مالی وسائل سے محروم کیا جا رہا ہے۔ میں نے بار بار یقین دہانیاں کرانے والے محترم بزرگوں سے پوچھا تو ہر طرف سے ایک پُراسرار خاموشی اختیار کی گئی اور یہ صُورتحال نومبر ۱۹۵۳ء تک برابر قائم رہی۔

سڈنی کاٹن پھر میرا دردِ سر بن گیا

حیدر آباد کے المیے کے بعد سڈنی کاٹن میرے لیے ایک بڑا دردِ سر بن گیا۔ اُس نے اپنے اصلی اور فرضی واجبات کے تقاضے شروع کر دیئے وہ ان میں سے اکثر مطالبات کے لئے صدر اعظم سے کئے ہوئے وعدوں کا حوالہ دیتا تھا جن کا مجھے کوئی علم نہیں تھا وہ صورت حال سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا علاوہ اُسکے رقمی مطالبات کے بہت سے ایسے مسائل تھے جن کا بظاہر اُس سے کئے ہوئے معاہدے سے کوئی تعلق نہیں تھا اُس نے کراچی میں کچھ جائداد خرید کر رکھی تھی اُس کی رقومات اور جائداد کی قیمت فروخت کی واپسی کا مسئلہ تھا۔ پھر اُس نے کچھ قالین اور اس قسم کی دوسری قیمتی چیزیں خرید کر رکھی تھیں۔ اُن کے برآمدی اجازت ناموں اور کسٹم کے قوانین پر عملدرآمد کا سوال تھا ان سب باتوں نے مجھے بہت پریشان کر رکھا تھا بالآخر میری درخواست پر سر عبدالرحمن کو ثالث مقرر کیا گیا تو کہیں جا کر اُس کی پیدا کی ہوئی اُلجھنوں سے نجات ملی۔ میرے رفیقان کار کو میری اُن دشواریوں کا علم تھا مگر اپنے کاموں میں اتنے مصروف تھے کہ انہوں نے اس معاملہ میں بھی میرا ہاتھ بٹانے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا اور مجھے تن تنہا اس مسئلہ سے نپٹنے کیلئے چھوڑ دیا۔

جنرل چودھری کی ڈائری

سقوطِ حیدر آباد کے تھوڑے عرصے کے بعد ہی میرے کان میں بھنک پڑ چکی تھی کہ "پولیس ایکشن" سے فوجی فتح حاصل کرنے والے میجر جنرل چودھری نے اپنی ایک ڈائری مرتب کی ہے جس میں حیدر آباد کے خلاف پُورے فوجی منصوبے کی تفصیل درج ہے جس سے اقوام متحدہ میں بھارتی نمائندے کے اس دعوے کی تردید ہوتی تھی کہ یہ اقدام صرف قیام امن و امان کے لئے کیا گیا ہے۔ اُسکے لئے کوئی خاص تیاری کی گئی تھی نہ اُس کی ضرورت سمجھی گئی تھی میں چاہتا تھا کہ بھارتی نمائندے کے اس دعوے کی انہی کے "فاتح جرنیل" کے بیان سے تردید کی جائے اور اس کوشش میں تھا کہ کس طرح اُس ڈائری کا متن حاصل کروں۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ مگر یہ جو کہا جاتا ہے کہ جذبہ صادق ہو تو اللہ راہ

PREFACE

THIS book has been written mainly to give all those members of 1 Armd Div and the formations and units under command, a composite story, purely from the Divisional point of view, as to the part they played in operation "POLO." A recapitulation of events from the very first stages of the planning, the subsequent stages of training and re-equipping, followed by the actual operations and a summary of lessons learnt, might be useful to refresh their memories of the stages that have to be gone through as well as be of help when further operations are planned. The slight discourse in the opening chapters on political and public reactions is necessary to show how such reactions affect the broader aspects of planning. The book is also designed to fulfil two other purposes. Firstly, to be a historical record for unit and formation libraries and secondly, to be a possible reference book when the whole history of the Indian Army after nationalisation is written.

In the last chapter certain lessons have been discussed. To those who feel that these are repetitions of well-known principles, it is interesting to note how these principles re-emphasised themselves in a wholly mobile operation. The object of including them has been to refresh the minds of those who knew them already and bring them to the notice of those who were unaware of them. No claim is made that these lessons are hard and fast rules which must be observed. They are however a sound basis on which planners and commanders can build.

Comparisons are odious and there can be no comparison between the operations in Jammu and Kashmir and the Police Action in Hyderabad. The former was a major war and one into which the Indian Army had gone at short notice. It was fought over difficult terrain, with long vulnerable lines of communication and against a stubborn and well-equipped opposition. The latter was a brief incident, satisfactorily planned and against forces, who after the third day, virtually collapsed. In fact the main thought of the executors of operation "POLO," was to get it over quickly so that at no time would their comrades in Kashmir have to look over their shoulders.

One more thought exists. This book is also intended as a thanksoffering to all ranks of 1 Armd Div and units and formations under command, for their spirit, loyalty, co-operation and behaviour, without which we would not have been so successful. At all stages they upheld the highest traditions of the Indian Army, which, of course, we all knew that they would do.

J. N. CHAUDHURI

Date *July, 1949.*

RESTRICTED

~~RESTD~~

For Private Circulation only.

1 ARMOURED DIVISION IN OPERATION "POLO"

BY

Major-General J. N. CHAUDHURI, OBE

جنرل چودھری کی ڈائری - آپریشن پولو

بھی سمجھا دیتا ہے اور اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ میرے ملنے والے ایک صاحب جن سے اُنکے ایک کام میں میں نے تھوڑا سا تعاون کیا تھا حیدرآباد جا رہے تھے۔ انہوں نے اظہار تشکر کے طور پر مجھ سے پُوچھا کہ کیا حیدرآباد میں وہ میرے لئے کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ کام تو ہے۔ مگر وہ اتنا دُشوار اور خطرناک ہے کہ میں انہیں خواہ مخواہ انہیں کسی مُشکل میں گرفتار نہیں کرانا چاہتا۔ اُنکے اصرار پر میں نے اُن سے درخواست کی۔ کہ اس ڈائری کے مخصوص حصّوں کے کسی ذریعہ سے نقول حاصل ہو سکیں تو یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہوگی۔ چند روز کے بعد جب یہ صاحب تشریف لائے تو اُس ڈائری کا اصل پرُوف جسکی تصیح جنرل چودھری نے اپنے قلم سے کی تھی میرے ہاتھ میں دے کر مجھے حیرت میں ڈال دیا متن کی نقل تو شہادت بلا ثبوت ہوتی۔ اب اصل پرُوف کو دیکھ کر کون انکار کر سکتا تھا۔ اس طرح بھارتی نمائندے کے دلائل اور بیانات کی ناقابلِ تردید شہادت میرے ہاتھ میں آگئی۔ اور اُس سے ہمیں اپنے موقف کی حمایت میں کافی مواد حاصل ہوگیا۔

سفارتی ہتھکنڈے

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ بھارتی ہائی کمیشن مجھے حیدرآباد کے سقوط کے دو تین برس تک ایجنٹ جنرل کے لقب سے مخاطب کر کے سفارتی کاغذات اور اعلامیے باقاعدگی کے ساتھ بھیجتا رہا۔ جب ایک اعلامیہ کے ضمن میں میں نے ایک سوال اُٹھایا۔ تو مجھے فہمائش کی گئی کہ میں اُس ساری پرانی کارروائی کو بھول جاؤں۔ اب میں اُس سفارت خانے کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ اُس کے بعد اُس نے مجھے ایک عرصہ تک نظر انداز کیا۔ ایک دن اچانک سفارت خانے کا ایک اتاچی رام رتن مہتا مجھ سے ملنے آیا۔ اور غیر معمُولی تپاک سے ملا۔ اور اپنائیت کے اظہار کے لئے میرے خاندان کے بزرگوں سے تقسیم سے پہلے مبینہ دوستانہ تعلقات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ میں اتنا بھولا تو نہیں تھا کہ اُس کی اچانک آمد کا اُن مبینہ تعلقات سے رشتہ ملا لیتا۔ وہ ایک سفارتی انداز تھا جس کا مقصد صرف کھوج لگانا ہو سکتا تھا۔ بہر حال وہ دو تین بار آیا۔

ایک مرتبہ اُس کی اہلیہ بھی ساتھ تھی بار بار کی اُس کی یہ کرم فرمائی میرے لئے ایک معقدہ بن گیا۔ پھر ایک دن اُس نے مجھے اور میری بیوی کو اپنی رہائش گاہ پر چائے کی دعوت دی۔ اُس کا قُبول کرنا یا نہ کرنا ذرا غور طلب سا تھا اسلیے اُسوقت میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنی مصرُوفیات کو دیکھ کر ٹیلیفون کروں گا۔ اُس وقت میں جس پوزیشن میں تھا اُس کے پیش نظر دعوت کو قبُول کرنے میں مجھے کئی خدشات نظر آئے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ حیدرآباد کے سقُوط کے تین برس بعد بھارتی ہائی کمیشن سے اس نوع کا خلا ملا نامناسب ہوتا میں خواہ مخواہ حکومت پاکستان اور عوام کی نظروں میں ایک مُشتبہ شخصیت بن جاتا۔ یوں بھی بھارتی سفارت خانے سے تعلقات اُستوار کرنا ایک بالکل بے مقصد بات تھی۔ پھر سب کو معلوم ہے سفارتی ہتھکنڈے کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہاں داخل ہونے کے بعد مجھے وہاں زبردستی روک لیا جاتا۔ یا دباؤ۔ دھونس اور تشدد سے مجھ سے کوئی ایسی بات کہلوالی جاتی جو ہمارے موقف آزادی کے خلاف ہوتی میں نے وزیر خارجہ اور سیکرٹری وزارت خارجہ سے اس بارے میں رجوع کیا اور سب پہلوؤں سے غور کرنے کے بعد یہ طے ہوا۔ کہ میں دعوت قبول کر لوں چنانچہ میں نے مہتا کو اپنی بیوی کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے خود آنے کی حامی بھر لی۔ جب میں حیدرآبادی پرچم والی کار میں وہاں پہنچا تو سفارت خانے کے عملے کیلئے ایک اچنبھا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس موقعہ پر کچھ اور مہمان بھی ہوں گے مگر وہاں صرف ایک شخص تھا۔ اور وہ تھا ٹائمز آف انڈیا کا نامہ نگار!! اب میں سمجھ گیا۔ کہ یہ ایک چال تھی مجھے اس طرح بلا کر مجھ سے کوئی ایسی بات سننا چاہتے تھے جو ہمارے مسلمہ موقف کے خلاف ہو۔ نامہ نگار کے ہاتھ میں کاپی دیکھ کر میں اور سنبھل گیا آدھ گھنٹہ کے قیام میں ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور اُسے کوئی ٹیڑھا سوال کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اس طرح جو چال مہتا کے دماغ میں تھی وہ ناکامیاب ہو گئی اُس کے بعد مجھے دعوت دینے یا میرے پاس آنے کا مہتاجی کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ چند برس کے بعد ہی بزرگ پاکستان سے بھی رُخصت کر دیئے گئے۔

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

اب میں بڑے دکھ سے ایک بات کا ذکر کرنے لگا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ حیدرآباد کے المیے سے وطن عزیز ہی ہاتھ سے نہیں گیا بلکہ وہاں کی روایتی شرافت اور وفاداری کا بھی جنازہ نکل گیا۔ جُوں جُوں ایجنسی کے خلاف مخالفانہ محاذ مضبوط ہوتا گیا میں یہ محسوس کرنے لگا۔ کہ میرے اپنے سٹاف کے بھی کچھ لوگ اس قسم میں ملوّث ہو رہے ہیں۔ عملے کے جن لوگوں نے میرا آخر وقت تک ساتھ دیا اُن کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا مگر دو تین ایسے لوگ تھے جو یہ سمجھ کر کہ گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیکر کیا لینا ہے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے مجھ سے دُور ہٹنے لگے اور مجھے اُنکا رویہ بہت مشتبہ نظر آنے لگا۔ میری ذاتی مصروفیتیں اور دفتر کی کارروائیاں یقیناً اُنہی کے ذریعہ مخالفانہ حلقوں میں پہنچ کر زیر بحث آنے لگیں۔ پہلے تو میں نے سوچا۔ کہ شکست خوردہ قوم میں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے بھی ہو وقت گذارا جائے۔ لیکن بعض افراد کی طرف سے بے رُخی۔ تغافل اور عدم تعاون روز بروز بڑھتا ہی رہا۔ ایک مرتبہ میرے سکرٹری نے ذرا گستاخانہ رویہ اختیار کیا تو میں نے سختی سے تنبیہ کی بجائے اسکے کہ وہ اپنی حرکت پر نادم ہو کر معذرت کرتا۔ اُس نے اور اکڑ فوں دکھائی جب میں نے انضباطی کارروائی کی تو وہ کھُل کر سامنے آ گیا اور صاف کہدیا۔ کہ چونکہ اُسکو مقرر کرنے والی حکومت کا وجود نہیں رہا۔ اسلئے میں اُس کے خلاف کارروائی کرنے کا مجاز نہیں یعنی میں صرف تنخواہ دینے کا مجاز ہوں تعمیل احکامات کا نہیں۔ ایسا رویہ وہ کسی بیرونی مدد کے بغیر اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ قریب ایک ماہ کے میرے دفتر سے بے تعلق رہنے کے بعد جب تنخواہ کا وقت آیا تو اُس نے معافی مانگ لی۔ اور میں نے اپنی حماقت سے اُسے پھر کام پر لے لیا اُسے دوبارہ کام پر لینا میری بڑی فاش غلطی تھی اُسکے بعد اُسکی سرگرمیوں اور نقل و حرکت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے خلاف تشہیری محاذ میں ملوّث ہے اُسی دوران غلام محمد نے ایجنسی بند کرنے کی دھمکی دی۔ یہ سنتے ہی اُس کے عدم تعاون کا رویہ کھُل کر سامنے آ گیا۔ تنگ آ کر میں نے وزارت خارجہ کو اطلاع دی۔ کہ میں نے اپنی سکرٹری کو سبکدوش کر دیا ہے اُس کے

بعد اُس کا ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس پر کیا کارروائی ہوئی میں نہیں جانتا۔ مگر یہی وہ بزرگ تھے جو بند کی جانے والی ایجنسی کے "انچارج ایجنٹ جنرل" بن کر براجمان ہو گئے۔ کئی برس تک اس پر فائز رہے۔ میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں۔ اُس نے مجھ سے عدم تعاون اور منافقانہ رویہ کی اس انعامی عہدہ کی شکل میں قیمت وصول کی۔ قارئین یقین نہیں کریں گے کہ ان بزرگوار اور عملے میں سے اُس کے دو تین ہم نواؤں کے واجبات بھی ادا ہو گئے۔ جبکہ ایجنٹ جنرل اور اُسکے وفادار ساتھی اپنے واجبات کی ادائگی کے لئے اب بھی انصاف کی دہائی دے رہے ہیں!!

قاسم رضوی کی آمد

لائق علی کے پاکستان آنے کے دو تین برس کے بعد قاسم رضوی بھی پاکستان پہنچ گئے۔ جس شہرت کے وہ حامل تھے اور جس جرأت رندانہ کا انہوں نے حیدرآباد میں مظاہرہ کیا تھا اور پھر اُس کی کڑی سزا بھگتی تھی ان سب باتوں کے پیش نظر عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ پاکستان میں ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے اور یہاں کی سیاست میں کوئی اعلیٰ مقام کر سکیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ حیدرآبادیوں کی اُس سیاست سے الگ رہے جو حقائق کو نظرانداز کر کے حیدرآباد کی آزادی کے موقف کو کمزور کرنے پر تُلی ہوئی تھی مگر پاکستان کی سیاست میں وہ اپنے رتبہ کے مطابق کوئی مقام حاصل نہ کر سکے اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کے ذہن پر اُن کا ماضی مسلّط تھا اور وہ یہ نہیں بھولے کہ وہ مجاہد اعظم کے رُوپ میں کبھی حیدرآباد میں سب کچھ تھے حقیقت شناسی کا تقاضا یہ تھا۔ کہ وہ ماضی کی شہرت اور اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنا مستقبل بناتے اور نئے سرے سے خدمت اور جذبے سے پاکستان کی خدمت کرتے پاکستان کے ان جیسے مخلص اور نڈر کارکن کی ضرورت تھی مگر اُن کے ماضی نے اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بالکل یہی صُورت میر لائق علی کی تھی وہ حیدرآباد کے سقوط کے بعد بھی اپنے آپ کو صدر اعظم سمجھتے رہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھی پاکستان میں آ کر سیاسی یا

صنعتی دنیا میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کیا اور حیدرآبادی مہاجرین کے مختلف گروہوں میں گھر کر محترم ہونے کے بجائے ایک متنازعہ شخصیت بن گئے۔ قاسم رضوی جب کراچی پہنچے تو میں لاہور جا چکا تھا۔ کراچی پہنچنے پر اُن کے ساتھیوں نے یقیناً حیدرآباد کے روپیہ کے بارے میں بتایا ہوگا چنانچہ انہوں نے مجھے ایک تار بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

Come soon I want you تار کے مضمون ہی سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتک حکم نامے جاری کرنا نہیں بھولے۔ وہاں مجھے یہ بھی تاثر ملا کہ وہ مجھے شاید نادانستہ طور پر حیدرآبادیوں کی مقامی سیاست میں اُلجھانا چاہتے ہیں میں نے جواب میں انہیں بتایا کہ میں نے حال ہی میں اپنے عہدہ کا چارج لیا ہے اسلئے اِس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اپنا کام چھوڑ کر آؤں۔ جب بھی موقع ملا۔ اُن سے ملاقات کے لئے کراچی آؤنگا انکا جواب ضمیمہ[21] پر ہے۔ اُن سے میرے حیدرآباد میں آنے سے دوستی اور بے تکلفی کے تعلقات تھے مگر اُس کے بعد یہ قدیم تعلقات رسمی نوعیت کے ہوگئے لاہور میں اُنکے دوران قیام اُن سے ملاقاتیں رہیں۔ مگر حیدرآباد کے بارے میں کبھی تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی۔

حصّہ سوم

ساتواں باب

حیدرآباد کے سفارت خانے کا عبرت ناک حشر

حیدرآباد ایجنسی سقوط کے بعد جس طرح اور جن افسوسناک حالات میں حیدرآباد کے سفارت خانے کا خاتمہ ہوا وہ میری نظر میں مملکت آصفیہ حیدرآباد کے سقوط کے بعد بلاشبہ دوسرا اسقوط تھا جو "پولیس ایکشن" سے نہیں بلکہ نفسیاتی دباؤ۔ ذہنی تشدد اور معاندانہ پروپیگنڈے کے ذریعہ عمل میں آیا۔ حیدرآباد میں ظلم اور دھاندلی سے ۷-۸ سو برس کا اقتدار ختم کردیا گیا۔ یہاں ایک اسلامی ملک میں مظلوم حیدرآباد کا پرچم جو اُسکی آزادی کا آخری نشان تھا بلاجواز سرنگوں کردیا گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ حیدرآباد کے سقوط کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے مجھے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ میرا سفارتی رتبہ اور حیثیت متاثر نہیں ہوں گے اور تمام سفارتی مراعات علیٰ حالہٖ برقرار رہیں گی۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کو اس یقین دہانی کا شدید احساس تھا اور حیدرآباد ایجنسی جس طرح مشکل حالات میں اپنے موقف کو نباہ رہی تھی اُس کی وہ دل سے قدر کرتے تھے چنانچہ ۱۰ دسمبر ۴۸ء کو ڈائرکٹر جنرل ریلوے نے مجھے ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی نوابزادہ صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں جب تک حکومت پاکستان میری سفارتی اسناد کو تسلیم کرتی ہے اپنی ذمہ داریوں سے میرے سبکدوش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسپر انہوں نے خود اس پیشکش کو واپس لینے کی ہدایت کردی۔ اُسکے بعد وہ میرا پہلے سے

بھی زیادہ خیال کرنے لگے چنانچہ اُنکی کسی تقریب میں اگر میں نظر نہیں آتا تھا تو میرے بارے میں خاص طور پر دریافت کرتے تھے اس کے برعکس ملک غلام محمد جن کا بطور وزیر رابطہ مجھ سے تعلق تھا کسی وجہ سے چاہتے تھے کہ میں ایجنسی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے وفاقی حکومت کی سیکرٹریٹ میں مجھے ایک عہدے کی پیشکش کرادی۔ جسے میں نے فوری طور پر خود مسترد کر دیا۔ اس پر انہوں نے بہت بُرا منایا۔ اُنکے رویّہ سے مجھے یہ واضح تاثر ہوا کہ سقوط حیدرآباد کے بعد پاکستان میں وہ میری سفارتی پوزیشن کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ حالانکہ اسی ایجنٹ جنرل کو وہ ایک مرحلے پر سفیر با اختیارات کامل بنانے کا مشورہ دیتے تھے۔ اُنکے اس رُجحان کی وجہ سے اُن کے قریبی حلقوں کے رویّہ میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگا۔

جہاں آج تک میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا وہاں بے رُخی برتی جانے لگی اور میں محسوس کرنے لگا کہ لیاقت علی خان کی شفقت اور وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان کی حمایت کے باوجود وقت گذرنے کے ساتھ میرے مشن میں دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ سرکاری تقاریب میں تو مجھے پروٹوکال کے مطابق مدعو کیا جاتا تھا حتیٰ کہ جواہر لعل نہرو کے پاکستان کے دورے کے موقع پر اُس کے اعزاز میں موہٹا پیلس میں جو تقریب منعقد ہوئی تھی اُسمیں مجھے بلایا گیا تھا یہ اور بات ہے کہ میں نے خود اسمیں شرکت سے گریز کیا اور اپنی رہائش گاہ پر جو موہٹا پیلس سے ملحق تھی حیدرآبادی پرچم لہرا کر قومی وقار اور اپنی انا کی تسکین کا بندوبست کر لیا!! جو مراعات مجھے شروع سے حاصل تھیں یا قاعدے کے مطابق مجھے ملنی چاہیئے تھیں اُن کے بارے میں سوال اُٹھائے جانے لگے اور جو غلط استدلال میری اسناد کی پیشکشی کے موقعہ پر بروئے کار لایا گیا تھا اور جسے میں بھول چکا تھا آہستہ آہستہ میری حاصل شدہ مراعات کو بھی متاثر کرنے لگا۔ مثال کے طور پر میری کار پر لگائی جانے والی پلیٹ کا معاملہ تھا یہ ایک معمولی سی بات تھی مگر چونکہ یہ سفارتی وقار کا مسئلہ تھا اسلئے میرے لئے بہت اہمیّت کا حامل تھا۔ میں نے شدید احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ جب تک میری سفارتی اسناد قابل قبول ہیں مجھے وہی مراعات ملنی چاہئیں جو ابتک مجھے حاصل تھیں جس میں موٹر

کی پلیٹ کا امتیازی نشان بھی شامل تھا۔ کئی بار یاددہانیوں کے بعد شاید میرے آنسو پونچھنے کے لئے یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ سوائے اس کے باقی سب مراعات علیٰ حالہٖ قائم رہیں گی۔

"سفیر بے ملک" مجھے یہ صاف نظر آرہا تھا کہ حیدرآباد کی سفارت اب آخری دموں پر ہے اور اُسے وقار اور خودداری کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا اس صورت حال کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایک ایسے ملک جس کا وجود ہی ختم کر دیا گیا ہو۔ اُس کے سفیر کا کیا مقام باقی رہ جاتا ہے۔ مجھ پر "سفیر بے ملک" کی پھبتیاں کسی جاتی تھیں جنہیں مجھے دکھ اور کرب کے ساتھ سہنا پڑتا تھا۔ بہر حال وہ ایک حقیقت تھی۔ پھر غلام محمد اور انکے حلقے کے لوگوں کا خاصکر وزارت مالیات کے افسروں کا کھلم کھلا معاندانہ اور ذلت آمیز رویّہ تھا۔ اُس پر مستزاد یہ کرنل اسکندر مرزا جن سے حیدرآباد کے المیے سے پہلے میرے بڑے دوستانہ مراسم تھے اور انہوں نے میرے کام میں توقع سے بڑھ کر میری مدد کی تھی لائق علی کے ڈیفنس ایڈوائزر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد حیدرآباد کا نام نہیں سننا چاہتے تھے جب کبھی میں اُنکے پاس جاتا تھا وہ جلی کٹی باتیں سُناتے تھے اور بڑے طنزیہ انداز میں کہتے تھے کہ اگر اُنہیں اصل حالات کا پہلے علم ہوتا تو وہ ہم سے کبھی تعاون نہ کرتے۔ اُنکی ناراضگی کی اصل وجہ کیا تھی وہ اُنہوں نے کبھی نہیں بتائی۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محکمہ دفاع کے مُشیر کا اُنکے حلقۂ اقتدار اور اختیار میں دخل اُنہیں سخت ناپسند تھا۔ تیسری وجہ ابنائے وطن کا میرے خلاف کھلا پروپگنڈہ اور آئے دن کے مظاہرے تھے۔ اگر میرے حیدرآبادی بھائی ذرا حقیقت پسندی سے کام لیتے اور مجھے اُنکی حمایت اور تعاون حاصل ہوتا تو مجھے اُن کڑی آزمائشوں میں سے نہ گذرنا پڑتا جو میرا مقدر بن گئی تھی۔ میر لائق علی جنہوں نے مجھے اس سفارتی عہدے پر بھیجا تھا وہ مجھ سے کہہ ہی چکے تھے کہ وہ میری پوزیشن کو حکومت پاکستان کے پاس چیلنج کریں گے۔ حیدرآباد ایجنسی کو میں نے اُنہی کی ہدایت پر بنایا اور سنوارا تھا اگر وہ لگائی بجھائی میں آکر اسی عمارت ہی کو

۱؎ نیم سرکاری وزارت خارجہ ۵۰-۴-۱۴ ۵۰،۳،۳۳P[II]-۱-۴

ڈھا دینا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا تھا۔ یہ سب عوامل ایسے تھے جو حیدر آباد ایجنسی کے خاتمہ کی نشاندہی کرتے تھے۔ ذرا تصوّر تو کیجئے ایک ایسے شخص کی کسمپرسی اور بے بسی کا جسکا وطن عزیز استبداد کی بھینٹ چڑھ گیا ہو اور اُس سے اُسکے تمام مادی اور جذباتی رشتے ٹوٹ چکے ہوں جس کے ہموطن اُس کے خلاف کاغذی محاذ آرائی اور مظاہروں پر تُلے ہوئے ہوں جس حکومت نے اُسے ایک نازک اور انتہائی کٹھن مشن پر بھیجا تھا اُس کے اکابر اُسکے رہے سہے وقار اور حیثیت کو چیلنج کر رہے ہوں میں سوچتا تھا کہ کیا وفاداری کا یہی صلہ ہے۔ میں نے آخر کیا جرم کیا ہے کیا حیدر آباد کے سرمایہ کا تحفظ جرم تھا۔ کیا حیدر آبادیوں کی آبادکاری جرم تھی۔ کیا اتنے برس تک حیدر آباد کی آزادی کے پرچم کو پاکستان کی فضاؤں میں بلند رکھنا جرم تھا۔ پھر میں اپنے آپ کو تسلی دیتا تھا کہ اگر میرا ضمیر مطمئن ہے تو پھر دنیا جو چاہے کہے ایسا برتاؤ تو دنیا کا عام قاعدہ ہے۔ اللہ تو سمیع و بصیر ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کی زندگی میں میری سفارت کی شکستہ گاڑی سسک سسک کر چلتی رہی۔ اُنکی شہادت کے بعد دنیا ہی بدل گئی۔ اُنکی زندگی میں بھی مخالف عناصر غلام محمد کی سرپرستی یا شہ پر ایسے اقدامات کر لیتے تھے جن کا نتیجہ بالآخر یہی ہونا تھا۔

اخراجات کی پابجائی میں دقّتیں ملک غلام محمد نے شروع ہی سے ایجنسی کے اخراجات کے لئے رقوم کے حصول میں دشواریاں پیدا کر دی تھیں طلب نامے پر اُنکی توثیقی دستخط (جو میری اپنی حماقت سے لازمہ قرار دی جا چکی تھی) حاصل کرنے میں بہت پاپڑ بیلنے پڑتے تھے جس کی وجہ سے ادائیگیوں میں تاخیر ہونے لگی۔ کچھ مدت کے بعد طلب ناموں پر اعتراضات کئے جانے لگے حالانکہ میری رکھائی ہوئی امانت میں رقم نکلوانے میں اعتراضات کی کیا گنجائش ہو سکتی تھی اور اعتراض کرنے والوں کو کس قانون یا ضابطہ اخلاق کے تحت اس کا حق پہنچتا تھا۔ مجھے کبھی زاہد حسین۔ کبھی عبدالقادر اور کبھی ممتاز حسن کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے تھے حتیٰ کہ ایک مرتبہ سٹیٹ بینک کے ایک افسر نے بھی مجھ سے کچھ ایسا افسرانہ رویہ

اختیار کیا کہ میں احتجاجاً رقم لئے ہوئے بغیر لوٹ آیا۔ حیدر آباد ٹرسٹ کے قیام کے بعد جو رقم خالصتاً ایجنسی کے اخراجات کے لئے محفوظ کی گئی تھی اُس میں سے بھی میرے علم اور مرضی کے بغیر ادائیگیاں ہونے لگیں۔ روپیہ نکلوانے میں رکاوٹوں کے ساتھ غلام محمد کا رویّہ دن بدن تکلیف دہ ہونے لگا۔ حیدر آباد کے المیے کے دن ہی سے میں نے اپنے مشاہرے اور دیگر اخراجات میں ایک تہائی کے قریب کمی کر دی تھی یہ سب جانتے ہوئے وہ بار بار اور کمی کرنے کی ہدائتیں جاری کرتے رہے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں حیدر آباد کا نمائندہ نہیں ہوں بلکہ وزارت مالیات کا ایک ماتحت افسر ہوں میں نے انہیں جواب دیا۔ کہ الحمدللہ مجھے اپنی ذمّہ داریوں کا احساس ہے۔ میری ایک ذمّہ داری یہ بھی ہے کہ میں ایجنسی کے وقار کو قائم رکھوں اُسکے لئے اُسے ایک مناسب معیار پر رکھنا ضروری ہے۔ صورت حال کو بھانپ کر میں نے اُن سے کہا کہ میں اپنے حسابات کی تنقیح راز میں کرانا چاہتا ہوں اور درخواست کی کہ وہ آڈیٹر جنرل سے کہدیں کہ وہ میرے گھر پر آ کر میرے حسابات کو دیکھ لیں شاید وہ اس کے لئے تیار بیٹھے تھے فوراً راضی ہو گئے۔ چنانچہ غلام عباس آڈیٹر جنرل نے میرے گھر پر حسابات کو دیکھا تنقیح کی رپورٹ کی ایک نقل غلام محمد صاحب کو بھی بھیجدی گئی۔ مگر اس کے باوجود میری مشکلات بڑھتی ہی گئیں۔

ملک صاحب کی ناراضگی گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے بعد غلام محمد کا رویّہ مجھ سے اور سخت ہو گیا۔ سربراہ مملکت کی حیثیت سے بظاہر میرے معاملات کا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے تھا مگر انہوں نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ ہی میں رکھا اور یقیناً اُن ہی کے ایما سے متعلقہ عہدہ داروں نے بھی اسی قسم کا برتاؤ مجھ سے روا رکھا۔ زاہد حسین کی گورنری کے زمانے میں جب کبھی میں رقم نکلوانے کے لئے سٹیٹ بنک جاتا تھا تو وہ حسابات کی پڑتال اور تنقیح کا مشورہ دیتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ میرے حسابات کا اُن سے کیا تعلق ہو سکتا تھا ایک دو بار میں نے اس مشورے کو برداشت کیا۔ تیسری بار جب حسابات کی تنقیح کے بعد مجھے ایک صداقتنامہ داخل کرنے کے لئے کہا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے کہا

"میں نے یہ روپیہ اپنی مرضی سے اپنی امانت کے طور پر آپکی حکومت کی تحویل میں دیا تھا اور آپکی حیثیت ایک امین اور بنیکر کی ہے۔ آپکی یہ بار بار کی ہدایات میری سمجھ سے بالاتر ہیں"۔ وہ یہ جواب سن کر خاموش ہوگئے مگر اُس دن کے بعد وہ مجھ سے بہت بے رُخی برتنے لگے۔ اور میرے لئے روپیہ کا نکلوانا اور زیادہ دُشوار ہوگیا۔ میں نے جب زاہد حسین کی اس ہدایت کا غلام محمد سے ذکر کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر میرا منہ بند کر دیا کہ "کیا تم مجھ سے ناصر حسین کی شکایت کرنے آئے ہو؟"

انہوں نے اس بات پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ زاھد حسین کا مجھ سے حسابات کا سرٹیفکیٹ مانگنے کا کس طرح حق بنتا ہے اور میرا وقار اور خودداری اس قسم کے برتاؤ کو کب تک برداشت کر سکتی ہے۔ غلام محمدؐ سے میرے والد کے بڑے قدیم مراسم تھے بلکہ اُنہی کی سفارش پر نظام نے انہیں وزارت مالیات کی ذمہ داری سونپی تھی اُنہیں جب غلام محمدؐ سے میرے کشیدہ تعلقات کا علم ہوا تو وہ فرمانے لگے کہ وہ اپنی بیماری کی حالت میں غلام محمدؐ کو صُورت حال سمجھا دیں گے میں نے عرض کیا کہ "یہ وہ غلام محمدؐ نہیں جو کبھی آپکے دوست اور احسانمند تھے اب وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہیں۔ آپ زحمت نہ فرمایئے بس میرے لئے دُعا کیجئے۔ کہ میں ایمانداری اور خُودداری کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہوں۔" انہوں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں نے تمہاری بات سن لی ہے۔ تم اپنے موقف پر قائم رہو۔ میں تمہارے لئے دُعا کروں گا۔ چنانچہ چند روز کے بعد جب غلام محمدؐ مشتاق احمد گورمانی کے ساتھ میرے والد کی عیادت کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

حالات میں مزید ابتری روپیہ پیسہ کی تنگی اور اخراجات کی ادائیگی کے لئے رقوُمات کی وصُولی کے لئے پیروی کرتے کرتے اور متعلقہ افسروں کی جلی کٹی باتیں سُنتے سُنتے میں آخر کار عاجز آگیا اور میں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ گذشتہ تجربہ کی بناء پر مجھے معلوم تھا کہ اُس کا کیا رَدِ عمل ہوگا۔ میں نے ایک خط اُسی وقت کے وزیر مالیات چوہدری محمد علی[1] کو اور دوسرا چودھری ظفر اللہ خان[2]

[1] ضمیمہ ۸ [2] ضمیمہ ۷

وزیر خارجہ کو لکھا۔ ان خطوط میں اپنی دُشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ چونکہ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں طے شدہ طریق کار اور انتظام پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ اور یہ صورت حال میرے فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ بن رہی ہے اسلئے میری امانت مجھے واپس لوٹا دی جائے تاکہ میں اپنی ذمہ داریوں کو یکسوئی کے ساتھ پُورا کر سکوں۔ چودھری محمد علی نے اس خط پر بہت بُرا منایا اور دو ٹوک الفاظ میں مجھے جتلا دیا کہ وہ آئندہ حیدرآباد کے کسی معاملے سے واسطہ نہیں رکھیں گے۔ مگر میرے مطالبے پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا حالانکہ وزیر مالیات ہونے کی وجہ سے وہ براہ راست میری امانت کے ذمہ دار تھے۔ چودھری ظفر اللہ خان کا ردِ عمل ذرا مختلف تھا اُن کا کہنا تھا کہ اُنہیں میری دُشواریوں کا احساس ہے مگر غلام محمدؐ کے رجحان کے خلاف وُہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اسطرح وُزرائے کرام کے نام میری عرضداشتیں ایک سعی لاحاصل ثابت ہوئیں۔ دو چار دن کے بعد گورنر جنرل ہوس سے میری طلبی ہوئی اُس دن غلام محمدؐ مجھ سے معمول سے بھی زیادہ دُرشتی اور رکھائی سے پیش آئے۔ جس لہجہ اور انداز میں مجھ سے انہوں نے گفتگو کی اُس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میری حیثیت ایک مُجرم کی ہے جو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا اپنے خلاف فرد جرم سُن رہا ہے اُس تلخ گفتگو کا لُب لباب یہ تھا کہ میں نے یہ خطوط لکھ کر وزرائے کرام کی توہین کی ہے۔ میں ان خطوط کی نقول اپنے ساتھ لے گیا تھا (ضمیمہ جات ۷ اور ۸) میں نے اُنہیں پیش کرتے ہوئے عرض کیا "آپ خود" انہیں ملاحظہ فرما لیجئے میں نے تو بہت مودبانہ انداز میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، انہوں نے جھنجلا کر فرمایا" رہنے دو یہ کاغذات اپنے پاس"۔ میں نے عرض کیا" میں نے ایک سیدھی سی بات کہی تھی کہ یا تو میرے اخراجات کی ادائیگی کے لئے بروقت اور مناسب انتظام کیا جائے یا میری امانت لوٹا دی جائے" یہ سُن کر وہ بیحد چراغ پا ہوئے اور فرمایا "تم کونسی امانت کا بار بار ذکر کر رہے ہو۔ ہمارے پاس تمہاری کوئی امانت نہیں ہے"۔ یہ سُنکر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ کیا وہ بڑی رقم جو میں نے آدھی رات کو بینک سے نکلوا کر بڑے اصرار سے حکومت کی تحویل

میں دی تھی جس کی وجہ سے میرے رفقا کار اور ساتھی مجھ سے بدظن ہو گئے ہیں کیا یہ محض ایک خواب تھا۔ کیا یہ سب میں عالم بیداری میں سُن رہا ہوں۔ میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جب انہوں نے دوسری بار یہ بات دہرائی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عرض کیا۔ "جناب والا میرے پاس اس رقم کی رسید موجود ہے"۔ انہوں نے پلٹ کر بڑے طیش کے عالم میں مجھ سے پوچھا "کہاں ہے وہ رسید؟" میں نے بصد احترام جواب دیا "جناب والا وہ بڑی احتیاط سے مُلک سے باہر ایک محفوظ جگہ رکھی ہوئی ہے اگر ضرورت پڑی تو پیش کر دوں گا یہ سن کر وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بولتے رہے اور خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ وہ غالباً سمجھتے ہوں گے کہ میں گھٹنے ٹیک کر اپنی ندامت کا اظہار کروں گا۔ میں ایک کمزور اور گنہگار انسان ہوں۔ یہ عین ممکن تھا کہ میں اپنے ضمیر سے سمجھوتہ کر کے جھک پڑتا اپنی ملازمت کے طویل دور میں اس سے پہلے بھی ایک دوبار اسی قسم کی آزمائش میں سے گذر چکا تھا اپنے موقف میں قائم رہنے سے عارضی طور پر مجھے ذہنی کوفت اور ہراسانی تو ہوئی مگر الحمد اللہ یہی استقامت میرے لئے باعث برکت ثابت ہوئی میں نے سوچا کہ اسوقت جو کچھ میرے دل میں ہے اگر میں نے اُس کا اظہار نہیں کیا، تو پھر مجھے کبھی کہنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ میں نے عرض کیا "بالفرض اگر یہ بات مان لی جائے کہ میں نے کوئی رقم امانت کے طور پر حکومت کی تحویل میں نہیں رکھائی۔ تو پھر جناب والا ۱۷ ستمبر ۴۸ ۱۹ء سے آج تک حیدرآباد ایجنسی کے اخراجات کہاں سے ادا ہوئے۔ قاسم رضوی کے قانونی دفاع کے لئے رقم کہاں سے آئی۔ اقوام متحدہ میں حیدرآباد کے کیس کی پیروی کیسے ممکن ہوئی اور سب سے غور طلب بات یہ ہے کہ ایک کروڑ ۳۵ لاکھ کی رقم سے حیدرآباد ٹرسٹ کون سے دوسرے وسائل سے قائم ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان سب اخراجات کی ادائیگی حکومت پاکستان کے خزانے سے نہیں ہوئی"۔ اس کا وہ کیا جواب دیتے۔ بہت بھناتے ہوئے انہوں نے کہا "تم ٹرسٹ کا ذکر نہ کرو۔ میں اس موضوع پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بہتر ہے۔ کہ تم ریلوے میں چلے جاؤ۔ تم کو ٹرانسپورٹ کا تجربہ

Received from Mr. Mushtaq Ahmad Khan four boxes containing 1,99,50,000 (Rupees One crore Ninety-nine lakhs fifty thousand only) as per details given below:

Box No.	Pieces.	Denomination	Value Rs	
1	80,000	Rs 100	80,00,000.	On indemnity bond
2	50,000	Rs 100	50,00,000.	
3	10,000	Rs 100	10,00,000.	Rs 60,00,000.
	39,500	Rs 100	39,50,000.	
4	50,000	Rs 100	50,00,000.	Rs 89,50,000.

FOR STATE BANK OF PAKISTAN.

(S. L. HAIDER)
Manager.

State Bank of Pakistan,
Karachi
Dated the 17th Sept. 1948.

Countersigned.
2nd Secretary

تحویل میں دی ہوئی رقم کی رسید

ہے یوں بھی ایجنسی میں کوئی کام نہیں ہے" یہ سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ ٹرسٹ کے ذکر کی ممانعت سے بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ اب مزید ثبوت کی ضرورت نہیں تھی کہ ٹرسٹ کا قیام اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل جو میرے لیے سوہان روح بن گئے تھے انہی بزرگوار کے مرہون منت ہیں۔ رہی یہ بات کہ ایجنسی میں اب کوئی کام نہیں ہے اول تو یہ صحیح نہیں تھا۔ حیدرآبادی مہاجرین کے مسائل۔ اندرونی۔ بیرونی۔ سیاسی اور غیر سیاسی معاملات میں رابطہ کا کام اسی نوعیت کے اور بہت سے کام تھے مگر ایجنسی کے ہر کام کو اس رسمی انداز میں جانچنا مسئلہ کی اصل حقیقت سے گریز کرنا ہے۔ اس کے کام کا تعین مسلوں اور کاغذات کی رسمی گنتی سے نہیں ہوسکتا وہ ہمارے آزادی کے موقف کا یادگار نشاں ہے اُس کے بند ہونے سے حیدرآباد کا پرچم سرنگوں ہوجائے گا۔ میں نے گذارش کی کہ اگر حکومت کا یہی فیصلہ ہے کہ ایجنسی کو بند کردیا جائے تو ظاہر ہے میں اسے کیسے روک سکتا ہوں مگر انصاف کا تقاضا ہے کہ اس فیصلہ کی مجھے تحریری اطلاع دی جائے تاکہ اُس کے بند کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہ پڑے۔ انہوں نے "میں جو کہتا ہوں" کہہ کر گفتگو ختم کردی۔

نظام کا ایک خفیہ مشن | ایجنسی کو بند کرنے کی دھمکی سے میں ایک شدید اُلجھن میں پڑ گیا۔ ۱۹۵۱ء سے مختلف ذرائع سے نظام مجھے اپنے پیغامات بھجواتے تھے ۳ - ۱۹۵۲ء میں تو اُنکے خطوط اور پیغامات کا تانتا بندھ گیا ان پیغامات سے جہاں میرے موقف کی پُرزور تائید ہوتی تھی وہاں وہ ایک خُفیہ مشن کی تکمیل کے بارے میں ہدایات کے حامل بھی تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے مجھ سے اور میرے بھائی خان بہادر اشفاق احمد سابق چیف سیکرٹری سے رابطہ پیدا کیا۔ یہ مشن کیا تھا۔ اس بارے میں انہوں نے نہ مجھے اعتماد میں لیا اور نہ میرے بھائی کو۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ اُسکی انتہائی خُفیہ اور رازدارانہ نوعیت کے پیش نظر وہ بالمشافہ ہی بتائی جا سکتی تھی جس کا ہمیں موقعہ حاصل نہیں تھا۔ ہر پیغام میں نظام اس مشن کی اہمیت پر زور دیتے تھے اور اُسکی تکمیل کے لئے چند غیر معروف لوگوں کو (اُنکے اصل ناموں کا آخری وقت تک کوئی پتہ نہیں چلا) میرے ذریعہ سے کچھ ادائیگیاں کرنا چاہتے تھے ایک دو ادائیگیاں تو

کسی نہ کسی طرح میں نے کردیں۔ لیکن اُسکے بعد روپیہ پیسہ پر بندش عائد ہوجانے کی وجہ سے ممکن نہیں رہا خود ایجنسی کو چلانا میرے لیے دُشوار ہوگیا۔ یہ ادائیگیاں کہاں سے کرتا۔ اب جبکہ ایجنسی کو بند کرنے کا فیصلہ سُنادیا گیا تھا میرے لئے اس بارے میں کوئی پیش رفت ممکن نہ تھی۔ نظام کے پُراثر اور جذباتی انداز میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ کر مجھے اپنی بے بسی پر رونا آتا تھا میں سوچتا تھا کہ ایک شخص جس کا میں دو پُشتوں سے نمکخوار ہوں وہ ایک کام کے لئے مجھے کہہ رہا ہے اور میں تعمیل حکم سے معذور ہوں چنانچہ میں نے اُنہیں ساری صورت حال لکھ بھیجی اور ملک غلام محمد کے فیصلہ سے اُنہیں آگاہ کردیا۔ چند خطوط جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ضمیمہ جات (۱۴ سے ۱۹) میں ملاحظہ فرمایئے۔ ان سے واضح ہوجائے گا کہ نظام کو اپنے خفیہ مشن کی تکمیل میں اس غیر متوقع رُکاوٹ کا کتنا رنج تھا۔ ایجنسی کے بند کرنے کے فیصلے پر وہ حیران تھے کہ پاکستان نے اچانک اپنا موقف کیوں بدل لیا ہے۔ اگر اُن سے میری بالمشافہ گفتگو کا کوئی امکان ہوتا تو میں بصد احترام عرض کرتا۔ کہ یہ سب میری حماقت کا نتیجہ ہے۔ یہ اُسی دو کروڑ کی رقم کا چکر ہے جسے اللہ جانتا ہے کہ میں نے نیک نیتی اور وطن سے وفاداری کے جذبہ کے تحت محفوظ کرایا تھا وہی اب میرے لئے پھانسی کا پھندا بن گیا ہے اسی منحوس رقم نے ایجنسی کو بند کرایا۔ حیدرآباد کے پرچم کو سرنگوں کیا۔ ہماری صفوں میں انتشار پیدا کیا اور ہمیں رُسوائی سے دوچار کیا اور اب جو ایک خفیہ مشن کی تکمیل کے لئے اسمیں سے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ تو وہ ہاتھ نہیں آتی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان خطوط میں نظام نے جن الفاظ میں اس ناچیز کا اور اُسکے خاندان کا ذکر کیا ہے۔ وہ ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کے اس دور میں میرے لیے بیحد باعث تسکین تھا۔ مجھے یہ تو اطمینان تھا کہ اور لوگ جو چاہے میرے خلاف بُہتان طرازی کریں۔ جس شخص کی میں اسناد لیکر آیا تھا اور جس کا وہ روپیہ تھا اُس کا الحمدللہ مجھے اعتماد حاصل ہے۔

ملک غلام محمدؒ سے میری آخری ملاقات | چند روز کے بعد گورنر جنرل ہوس سے میری

طلبی ہوئی۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہُوا۔ غلام محمد نے بغیر کسی تمہید کے کہا کہ انہوں نے میرے لئے ریلوے میں ملازمت کا بندوبست کر دیا ہے بہتر ہے کہ میں لاہور چلا جاؤں حیدرآباد میں میں نے شہر بدر ہونے کی اصلاح کی تھی۔ میرے مقدر میں کراچی بدر ہونا لکھا تھا۔ اُنکے چہرے پر خفگی کے آثار دیکھ کر میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا حکومت پاکستان نے حیدرآباد ایجنسی کو بند کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور کیا پاکستان نے حیدرآباد پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کو تسلیم کر لیا ہے ۱۹۴۹ء میں تو پاکستان نے خود حیدرآباد کے مقدمے کو اقوام متحدہ میں اٹھایا تھا اُس کا جواب اُنہوں نے بڑے تلخ لہجہ میں یہ دیا کہ اُنہوں نے ایک بار مجھ سے کہہ دیا ہے کہ یہ اُنکا فیصلہ ہے پھر بار بار پوچھنے کا کیا مطلب؟ میں حیران تھا کہ میں تو ایک ایسی مملکت سے آیا تھا جہاں کا حکمران مطلق العنان سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہاں بھی میں نے ایسی مطلق العنانی نہیں دیکھی۔ میں سوچتا تھا کہ کیا یہ جمہوریت کا نیا انداز ہے۔ ورنہ ایک جمہوری نظام میں دستوری صدر مملکت کو یہ اختیار کیسے حاصل ہو گیا کہ بین الاقوامی سطح پر ایک زیر نزاع مسئلے میں جسے اُسکے وزیر خارجہ نے خود بھی ایک بار اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا تھا وہ یوں ایک ایسا فیصلہ صادر کر دے کہ متعلقہ وزارت کو اُس کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔ میں اپنے موقف کی حمایت میں نظام کے چند ایسے خطوط لے گیا تھا جس میں نظام نے حیدرآباد کی املاک کے بارے میں مجھے مکمل اختیارات[1] دے دیئے تھے اور ایجنسی کے بند ہونے کے فیصلے پر اظہار تشویش[2] کیا تھا۔ میں اس خوش فہمی میں تھا کہ ان خطوط کو دیکھ کر اُنکا رُویہ کچھ نرم پڑ جائے گا۔ مگر وہ اور زیادہ مشتعل ہو گئے اُن خطوط کے اصلی ہونے کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ وہ مجھے کیسے اور کس طرح وصول ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ اُسی طرح وصول ہوتے ہیں جس طرح کہ ماضی میں ہوتے رہے ہیں جس کا اُنکو بخوبی علم ہے۔ جہاں تک اُنکے اصلی ہونے کا تعلق ہے میں

۱-۲ ضمیمہ جات ۱۵-۱۷

یہی عرض کر سکتا ہوں کہ اس قسم کا شبہ میری دیانت اور ایمانداری پر الزام دھرنے کے مترادف ہے جس کا میں مستحق نہیں ہوں نظام کے خطوط پر اُنکی ذاتی مہر ہے۔ چونکہ وہ خود حیدرآباد کی وزارت مالیات کے سربراہ رہ چکے ہیں اُن سے زیادہ نظام کی ذاتی مہر سے کون واقف ہو گا۔ یہ سُنکر وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہوئے اور غصہ میں کانپتے ہوئے کمرے سے باہر برآمدے میں چلے گئے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آیا تھا کہ ہمارے مابین اس تلخ گفتگو سے اگر اُس بیمار آدمی کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا حشر ہو گا۔ چند لمحات کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئے اور کہا کہ "بالفرض اگر یہ نظام ہی کے خطوط ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نظام کی حیثیت ہی کیا ہے ہم اُنہیں تسلیم نہیں کرتے"۔ اُنکے غصہ سے تمتماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر میں نے چند لمحات خاموشی اختیار کی۔ پھر اس خیال سے کہ اگر یہ بات میں نے اس وقت نہ کہی تو پھر اُسے کہنے کا کبھی موقع نہیں ملے گا میں نے عرض کیا "جناب والا یہ وہی نظام ہیں جنہوں نے پاکستان کے آڑے وقت میں ایک بڑا خطرہ مول لیکر اُسکی فراخدلی سے مدد کی تھی۔ اُنہی کے دیئے ہوئے خریطہ کو اپریل ۱۹۴۸ء سے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء تک اور پھر اُسکے بعد اب تک حکومت پاکستان تسلیم کرتی رہی ہے۔ انہوں نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک دم اپنا جواب داغ دیا "وہ غدار ہے"۔ یہ مجھ بدنصیب کا مقدر تھا کہ جس سربراہ مملکت کے خریطے کا میں حامل تھا جسکے نام پر حیدرآبادی سفارت خانہ قائم تھا اُسکے متعلق میزبان حکومت کے سربراہ کی زبان سے غداری کا الزام سُنوں اور جواب نہ دے سکوں۔ اور وہ الزام بھی ایسے شخص کی زبان سے ہو۔ جو اسوقت بھی اُسکی حکومت کا وظیفہ خوار تھا اب جو میں غلام محمد کے بارے میں یہ الفاظ پڑھتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں کہ میں ہی عقل و فہم سے عاری ہو گیا ہوں

"---- Nevertheless he had a soft corner for Hayderabad and despite some differences cherished a sense of personal devotion to his ruler" T

۱ لائق علی ٹریجڈی آف حیدرآباد

Tragedy of Hyderabad

عقیدت مندی کی یہ کونسی قسم ہے جس میں غداری جیسا سنگین الزام دینا بھی جائز سمجھا جائے۔

اللہ ۔ رسولؐ کا نام بیچ میں نہ لاؤ

اسی لمحہ مجھے یہ خیال آیا کہ میں انہیں نظام کے خفیہ مشن کے بارے میں بتاؤں۔ زبان پر بات آرہی تھی کہ میں نے بروقت محسوس کیا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ نظام نے سخت تاکید کی تھی کہ اس مشن کے بارے میں کسی کو کسی حالت میں نہ بتایا جائے اب جبکہ وہ نظام پر غداری کا الزام لگا چکے ہیں تو انہیں اُنکے کسی خفیہ مشن میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنا فیصلہ تو بدلیں گے نہیں مگر وہ اور اُنکے ہم خیال لوگ خفیہ مشن کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش میں میری جان زیرِ نخ میں کردیں گے اسلیئے ناچار خاموش رہا۔ جب ذرا غصہ پر قابو پا لیا، تو انہوں نے فرمایا کہ وہ بہرحال حیدر آباد ایجنسی کو بند کر رہے ہیں میرے لئے ریلوے میں ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے بہتر ہے کہ میں لاہور چلا جاؤں۔ زبردستی ملازمت اختیار کرنے اور کراچی کو چھوڑ کر لاہور جانے پر ایسے شدومد سے اصرار میرے لیے ناقابلِ فہم تھا اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کراچی میں میری موجودگی کیوں قابلِ اعتراض اور ناپسندیدہ بن گئی ہے میں نے اپنے جذبات اور انکی تلخ باتوں کو نظر انداز کر کے اور اپنی بات کو آگے بڑھانے کے لئے پوچھا کہ جب تک حیدرآباد کا مقدمہ اقوامِ متحدہ کے ایجنڈے پر ہے اور زیرِ تصفیہ ہے۔ حیدرآباد ایجنسی کو کیسے بند کیا جا سکتا ہے ایک طرف تو آپ حیدرآباد پر بھارت کے قبضے کو تسلیم نہ کریں دوسری طرف حیدرآباد کے سفارت خانے کو بلا جواز بند کر دیں۔ اسمیں تو پالیسی میں تضاد نظر آتا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی یاد دلایا۔ کہ لیاقت علی خان نے اُنکی موجودگی میں مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ حیدرآباد کے مقدمہ کے فیصلے تک حیدر آباد ایجنسی قائم رہے گی۔ یہ سُن کر وہ طیش میں آگئے۔ اور کہا کہ "وہ لیاقت علی خان کی یقین دہانیوں کے پابند نہیں ہیں بہرحال اب حالات بدل گئے ہیں اب تمہارا لاہور چلے جانا ہی بہتر ہے۔" میں حیران تھا کہ کیا مہذب حکومتوں میں یہی ہوتا ہے کہ اُنکے وزیرِ اعظم کی بات کو یوں رد کر دیا جائے یہ صرف حالات کے بدلنے کی بات نہیں تھی اخلاقی قدریں بدل گئی تھیں نظریں بدل گئی تھیں۔ میں نے پھر ذرا سی جسارت سے کام لیکر انہیں وہ میٹنگ یاد دلائی جسمیں کیبنٹ کی ایک ذیلی کمیٹی جس کے وہ بھی ایک رکن تھے مجھے یہی یقین دہانی کرائی تھی۔[1] اُنکے غصے کا پارہ پھر چڑھ گیا اور فرمایا "اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو میں ایجنسی کے اخراجات کی ادائیگی کی ممانعت کر دوں گا۔" یہ سُنکر مجھ پر ایک سکتہ طاری ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر انہوں نے اپنی دھمکی پر عمل کیا تو پھر میں کیا کروں گا۔ سٹاف کی تنخواہیں کہاں سے ادا ہوں گی اگر بالفرض میں سٹاف کے بغیر تن تنہا اپنے موقف پر ڈٹ جاؤں تو روپیہ پیسہ کے بغیر یہ کام کتنے دن چل سکتا ہے اور پھر گورنر جنرل کے فیصلے کے بعد اگر حکومت میری اسناد کو بھی مسترد کر دے تو میں کیا کروں گا۔ میں پریشانی اور حیرانی کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا تو انہوں نے کہا "بہتر ہے۔ تم لاہور چلے جاؤ۔ تمہارے لئے وہاں ریلوے میں انتظام ہو گیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ جو عہدہ تمہارے لئے زیرِ غور ہے تم اُس سے بہت سینئر عہدے پر کام کرتے رہے ہو۔ مگر ہم اس سے زیادہ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتے"۔ میری کیفیت اس وقت ایک ایسے شخص کی تھی جو اپنا سب کچھ کھو کر مستقبل میں پیش آنے والی محرومیوں اور خطرات کے احساس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں عرض کیا "میں نے نہ تو کسی ملازمت کی درخواست کی ہے اور نہ ایسے کس وقت اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا "اچھا تو پھر تم کیا کرو گے؟" میں نے جواب دیا "جناب والا اللہ رازق بھی ہے اور مسبب الاسباب بھی وہ انشاء اللہ رزق بھی دے گا اور اُس کے لئے اسباب بھی پیدا کر دے گا۔" اس جواب پر اُنہوں نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا "تم بات بات میں اللہ اور رسولؐ کو بیچ میں کیوں لاتے ہو۔" اُسی سکتے کے عالم میں میرے منہ سے یہ بات نکل گئی "اگر اللہ اور رسولؐ کا نام مملکتِ اسلامیہ پاکستان میں نہ لیا جائے تو پھر کہاں لیا جائے اور پھر جناب جب دنیا کے سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں تو کمزور اور بے بس انسان اپنے پیدا کرنے والے کی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔" اسپر انہوں نے بڑے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

1 ضمیمہ ۴

"اچھا میں بحث نہیں کرتا۔ تم جا سکتے ہو" ملک غلام محمد سے میری یہ آخری ملاقات تھی پھر میں کبھی اُنکے پاس نہیں گیا۔ لاہور آنے کے بعد ایک دو بار انہوں نے بُلوا بھیجا۔ میں نے معذرت کر دی۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

گورنر جنرل سے اس گفتگو کے بعد میرے لئے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ میں کراچی سے رُخصت ہونے کی تیاری کروں۔ میں نے دفتر کے عملے کو اکٹھا کر کے اپنی داستانِ غم سُنائی اور تفصیل سے بتایا کہ کن حالات میں انتہائی بدرجہ مجبوری ایجنسی کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اس موقعہ پر جو میں نے تقریر کی اُس کا مندرجہ ذیل اقتباس میرے جذبات کی عکاسی کرتا ہے" —— میں نے پانچ چھ برس بڑے شوق اور چاؤ سے پاکستان کی آزاد فضا میں مظلوم حیدر آباد کی آزادی کا علم بلند کیا۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔ کہ اُس نے اِس ناچیز کو یہ عزت بخشی کہ یہ پرچم میرے ہاتھ سے بلند ہو۔ الحمد اللہ یہ کئی سال تک مملکت پاکستان کی فضا میں لہراتا رہا اور زبان حال سے آزاد قوموں سے انصاف طلب کرتا رہا۔ یہ بڑا دُشوار کام تھا اس جدوجہد میں کس حد تک کامیابی ہوئی اس بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب نہیں۔ اس کا جانچنا مؤرخ کا کام ہے۔ جس شوق سے میں نے اس علم آزادی کو لہرایا تھا وائے قسمت اتنا ہی یہ امر میرے لیے سُوہان رُوح ہے کہ وہ علم میرے ہاتھ سے سرنگوں ہو رہا ہے۔ یہ میری زندگی کا انتہائی المناک حادثہ ہے۔ لیکن الحمد اللہ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اللہ کے فضل و کرم اور بے پایاں احسان سے اس ناچیز نے اپنا وہ عہد پورا کر لیا جو اُسنے سقوط حیدر آباد کے وقت اپنے خالق سے کہا تھا کہ جب تک حالات اجازت دیں گے میں آزادی کے اس جھنڈے کو بلند رکھوں گا اس عرصے میں میں نے اپنی حد تک حیدر آباد کے موقف کو زندہ رکھنے اور اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے جواب میں مجھے ہر قسم کے بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بننا پڑا اور میرے ساتھ کسی نے تعاون نہیں کیا۔ میرے ساتھیو میں آپکا ممنون ہوں کہ آپنے اپنی حد تک میرا ہاتھ بٹایا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے

...... یہ دنیا ایک سٹیج ہے ہر شخص اس سٹیج پر آکر اپنا پارٹ ادا کر کے چلا جاتا ہے میں نے حیدر آباد کے معاملہ میں جو بھی بُرا بھلا پارٹ ادا کیا اب آپکے اور مورخ کی نظروں کے سامنے ہوگا۔ اب میرا پارٹ ختم ہو رہا ہے۔ آپ کی آزادی کا یہ نشان جو ۷-۸ سو برس سے لہرا رہا تھا اب سرنگوں ہو رہا ہے میری بھی زندگی کا یہ نشان میرا ہم سفر اور ہم نشین ہوگا۔ میں اُسے ایک شیشے کے خلاف میں تمثیت کر رکھونگا۔ اور اُسپر یہ لیبل لگا دوں گا۔ کہ یہ اُس بدقسمت ملک کا پرچم ہے جسکے باسی خود اُسے لہرانا نہیں چاہتے یہ اُس بدبخت ملک کا نشان ہے جس سے وہاں پُشتوں سے رہنے والے بھی کوئی نسبت رکھنا نہیں چاہتے ...."

حیدر آباد ایجنسی کو بند کرنے کے فیصلے سے وزارت خارجہ کی لاعلمی

ایجنسی کے بند ہونے کی خبر کئی دنوں سے اخباروں میں گشت لگا رہی تھی۔ شاید اس خبر کو دیکھ کر وزارت خارجہ جسے بظاہر اُسوقت تک اس المناک ڈرامے کا علم نہیں تھا کے ایک ڈپٹی سیکرٹری نے میری رہائش گاہ پر آکر پوچھا" سُنا ہے کہ آپ کراچی سے جا رہے ہیں کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ آپ استعفٰے دے رہے ہیں؟" میں نے جواب دیا" آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کو میرے استعفٰے کا کیسے خیال آیا۔ اگر بالفرض کمزوری کے کسی لمحے میں ایسا خیال بھی کروں تو آپ ہی بتایئے میں اُسے کس کو پیش کروں۔ میں حکومت پاکستان کا ملازم ہوں نہ اُسکا تنخواہ یافتہ اور جس نے مجھے خریطہ دے کر یہاں بھیجا تھا اس تک میری آواز پہنچ سکتی ہے نہ تحریر۔ پھر استعفٰے کا کیا سوال!! اسپر ڈپٹی سکرٹری نے پوچھا" پھر آپ کیوں جا رہے ہیں اگر جانا ہی ہے تو وزارت خارجہ کو اسکی تحریری اطلاع دے دیجئے۔" میں نے جواب دیا" تحریری اطلاع میں اُسوقت دیتا اگر میں اپنی مرضی اور خوشی سے جاتا۔ مجھے تو زبردستی ایجنسی کو چھوڑنے کے لئے ہی نہیں بلکہ کراچی شہر سے بھی رخصت کیا جا رہا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں کیوں جا رہا ہوں اس بارے میں آپکے وزیر خارجہ یا گورنر جنرل ہی بتا سکتے ہیں جو کچھ مینے آپ سے کہا ہے۔ آپ اپنی وزارت کی اطلاع کے لئے نوٹ کر لیجئے۔ اس کے دو تین دن بعد میں بچشم پُرنم حیدر آباد کے پرچم کو سرنگوں کر کے لاہور کیلئے روانہ ہوگیا

ایک ناپسندیدہ شخصیت کی رخصتی روانگی سے پہلے جہاں چند بزرگوں نے مجھ سے اظہار ہمدردی کیا وہاں بہت سے حضرات جنہیں میری ذات سے بظاہر اس لئے کد تھی کہ میں سقوط حیدرآباد کے بعد اُس کے سفارتی عہدے پر کیوں فائز ہوں۔ حسد اور کینہ پروری کی مشترکہ یلغار سے میں اُن کے ذہنوں میں "فس کم جہاں پاک" کی تعریف میں آتا تھا بہت سے ایسے لوگ تھے جو بلا سوچے سمجھے مجھے غدار بنا بیٹھے اور مجھ پر لعن طعن کی کہ میں کیوں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کسی بندہ خدا نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ میری داستان غم سنے اور ایجنسی کے بند ہونے کی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اسی سوچ و فکر کے ایک بزرگ نے انتہائی تلخ لہجے میں مجھے "غدار" کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اُنکا حاصل کلام یہ تھا کہ اگر میں ایجنسی کو چھوڑ کر غداری پر تلا ہوا ہوں تو میں اُس کا چارج اُن بزرگوار کو دیتا جاؤں!! گویا سفارتی مشن بھی ایک قسم کی ریوڑیاں تھیں جنہیں میں اپنی مرضی سے خواہشمند بزرگوں میں بانٹتا پھروں۔ نام نہاد آندھرا پبلک کے پنگل۔ ایس۔ ریڈی بھی اس موقعہ پر اچانک گمنامی کے پردے سے نکل آئے اور میرے اقدام کی مذمت کرتے ہوئے حیدرآباد کے پرچم کا مطالبہ کیا۔ روانگی کے وقت جس بے رخی اور سرد مہری کا مجھ سے اظہار ہوا۔ اُس کا مجھے بہت دُکھ ہُوا۔ کراچی میں حیدرآبادیوں کی کثیر آبادی تھی جن میں سے بیشتر کی میں نے حتےٰ الامکان خدمت کی کوشش کی تھی لیکن اس موقعہ پر چند عزیز رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کے کوئی مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے بھی نہیں آیا۔ البتہ ایجنسی کا چارج لینے والے بزرگ مجھ سے سٹیشن پر یہ پُوچھنے آئے تھے کہ اُنہیں چارج دینے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا!!

سفر کے دوران کاغذات کی چوری اصفی پرچم کو سرنگوں کرنے کی رسوائی برداشت کرکے جب میں کراچی سے رخصت ہُوا تو دورانِ سفر میرے ساتھ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ میں نے چند ضروری کاغذات بکس میں بند کرکے سٹیشن پر بھجوا دیئے تھے گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بکس کھُلا ہے۔ پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ بکس کے کاغذات کو اُلٹ پلٹ

کیا گیا ہے اور چند کاغذات غائب ہیں۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ زیادہ اہم کاغذات بریف کیس میں تھے جو میرے ہاتھ میں تھا۔ اسلئے وہ محفوظ رہے۔ میں نے لاہور پہنچتے ہی اس واقعہ کی اطلاع وزارت خارجہ کو بھیجدی۔ کچھ عرصہ یہ کیس زیر تفتیش رہا۔ کھوج نہ ملنے پر ختم ہوگیا جس افسردہ حال میں کراچی سے روانہ ہُوا تھا مجھے اس واقعہ سے بہت دُکھ ہُوا بند بکس کا کھُل کر کاغذات کا اس طرح غائب ہو جانا عام نوعیت کی چوری نہیں تھی اس میں بھارت اور اُس گٹھ جوڑ رکھنے والے سازشی عناصر ضرور ملوث ہوں گے اُن کی نیت کیا تھی اور میرے کاغذات میں سے وہ کیا چیز چاہتے تھے اللہ ہی بہتر جانتا ہے میں تو قیاس آرائی ہی کر سکتا ہوں۔

حصّہ سوم

آٹھواں باب

یہ معمّہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

حیدر آباد ایجنسی کا معمّہ میں کراچی سے جس طرح اور جن حالات میں خارج البلد ہوا اُس کا تفصیلی ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے اُس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ میرے لئے ایک معمّہ بن گیا جو اتنی مدّت گذرنے کے بعد بھی حل نہیں ہوا۔ کراچی سے روانہ ہونے سے کچھ عرصہ قبل میں نے وزارت خارجہ کو تحریری اطلاع دی تھی کہ بعض انضباطی وجوہ کی بناپر میں نے اپنے سیکرٹری کو اُسکے عہدے سے سبکدوش کردیا ہے اسلئے آئندہ اُسکا حیدر آباد ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن لاہور پہنچتے ہی مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ جس سفارت خانے کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر بند کردیا جائے گا۔ وہ نہ صرف قائم ہے بلکہ اُسے زندہ رکھنے کے لئے ایک ایسے شخص کو اپنا لیا گیا ہے جسے میں ملازمت سے سبکدوش کرچکا تھا اور وزارت خارجہ کو اُسکی باضابطہ اطلاع دے چکا تھا ایسے شخص کو ایجنسی کو چارج دلانا ایک ناقابل فہم بات تھی اس سارے ڈرامے کا مقصد بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی طرح موقعہ سے ہٹ جاؤں۔ میں نے اسپر اُس وقت کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان سے ایک خط میں شدید احتجاج کیا۔ مجھے یہ افسوس اور رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وزارت خارجہ نے اس معاملے میں چُپ سادھ لی اور میرے احتجاج پر وضاحت تو درکنار میرے خط کی رسید تک نہ بھیجی اور یہ "انتظام" اسی طرح چلتا رہا ستم ظریفی یہ ہے کہ

کراچی سے میرے اخراج سے ۱۴ برس تک غیر ملکی سفرا کی فہرست میں میرا نام بحیثیت ایجنٹ جنرل شامل ہوتا رہا البتہ میرے نام کے نیچے ایک نشان لگا کر یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ میں اپنے مستقر سے باہر گیا ہوا ہوں سفارتی تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ ایک سفارتی نمائندہ مسلسل ۱۴ برس تک اپنے مستقر سے غیر حاضر ہو (سفارتی فہرست میں اندراج صفحہ پر دیکھئے) ۱۹۶۷ء میں نظام کے انتقال کے بعد یہ تکلف بھی ختم ہوگیا۔ ملک غلام محمد کے بعد اُنکے جانشینوں نے بھی میرے بار بار کے احتجاج۔ اپیلوں اور مرافعوں پر نہ صرف توجہ نہیں دی۔ بلکہ میری تحریروں کو اُس حُسن سلوک کا بھی مستحق نہیں سمجھا جو صاحبان اقتدار کو خطاب کرنے والوں کو رسید کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ البتہ وزارت مالیات کے دانشور وقتاً فوقتاً میرے حسابات کے بارے میں بغیر کسی قانونی اور اخلاقی جواز کے سوال جواب کرتے رہے!!

شیخ منظور قادر کا ایک اہم مکتوب سربراہان مملکت کے علاوہ میں نے ہر دور کے وزرائے خارجہ کو بھی اس افسوسناک صورت حال کی طرف توجہ دلائی اُن میں سے ایوب خاں کے دور میں شیخ منظور قادر کے سوا کسی نے جواب نہیں دیا میں اُس زمانے میں کسی ملازمت سے منسلک نہیں تھا اور روزگار کے لئے پریشان تھا۔ گذشتہ تلخ تجربہ کی بنا پر مجھے کسی بہتری کی صورت کا یقین نہیں تھا۔ مگر میں نے شیخ صاحب جیسے ممتاز ماہر قانون کو جو میرے معاملات سے ذاتی طور پر بھی واقف تھے اس صورت حال سے مطلع کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے اُنہیں سارے حالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ مجھے نامعلوم وجوہ سے ایجنسی سے بے تعلق کردیا گیا ہے۔ اس لئے یا تو اُس فیصلے پر نظر ثانی کر کے اُس میں پھر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ یا اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہے۔ تو مجھے کوئی موزوں ملازمت دلائی جائے۔ کیونکہ حیدر آباد میں اپنا سب کھو دینے، اپنے واجبات سے محروم ہونے اور اپنی تحویل میں سارا روپیہ حکومت پاکستان کے حوالے کرنے کے بعد جسم اور روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے کسی روزگار کی ضرورت ہے اُنکے جواب کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی

HYDERABAD

Office of the Agent General for Hyderabad

*Mr. Mushtaq Ahmad Khan, Agent General. — April, 1948.
*Mrs. Mushtaq Ahmad Khan.

Mr. Mohammed Abdul Qayyoum Amin Khan, First Secretary and Incharge of the Agency. — B-87-A, North Nazimabad, Karachi-33. Tele: 70011/367. — Nov. 18, 1953.
Mrs. Amin Khan.

*Not at Station.

GPPK—1741/25-20/L (66) Frgn. Affrs.—19-1-67—1,150.

FA&CR 17-1-67.
1,150

Amendment should be reported to the Ministry of Foreign Affairs, Karachi by the 10th of the months of March, June, September and December.

LIST OF THE DIPLOMATIC CORPS AND CONSULAR, TRADE & OTHER FOREIGN REPRESENTATIVES

MINISTRY OF FOREIGN AFFAIRS

KARACHI — January, 1967.

Price: Rs. 2

سفرا کی فہرست میں میرا نام جنوری ۱۹۶۷ء

انہوں نے فرمایا۔ کہ وزارت خارجہ کے ریکارڈ کے مطابق میں ایک غیر ملکی حکومت کا نمائندہ ہوں اسلئے مجھے ملازمت دیئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے۔ کہ میں اُس وقت تک ۵ برس تک حکومت پاکستان کی ملازمت کر چکا تھا اور ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمدؔ نے بنفسِ نفیس مجھے ملازمت کی پیشکش کی تھی لیکن جب میں نے اپنی سفارتی پوزیشن کا سوال اُٹھایا تو میرے لئے ملازمت کا حصول خارج از امکان بتایا گیا۔ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ اگر میری سفارتی حیثیت قائم ہے تو اُسکے سنبھالنے میں میرے لئے کیوں رکاوٹ ہے جب میں نے وضاحت طلب کی تو خاموشی اختیار کر لی گئی مطلب یہ نہ تو میں اپنا سفارتی عہدہ سنبھالوں اور نہ کوئی ملازمت کر سکوں ؎

گھُٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیّاد کی ہے

آپ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں کوئی چھ سات برس کی بات ہے کہ حیدر آباد کی ایک جائیداد کے ضمن میں مجھے عدالت میں طلب کیا گیا وہاں وکیل سرکار نے یہ بیان دیا کہ کہ نومبر ۵۳ء کے بعد میری کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ جب میں نے منظور قادر کا خط پیش کیا اور وزارت خارجہ کی طرف سے شائع کردہ سُفرا کی فہرستیں پیش کیں جن میں ۱۹۶۷ء تک میرا نام شائع ہوتا رہا۔ تو وکیل صاحب ٹال گئے۔ حقیقت سے گریز کی اگر ایسی صورت اختیار کی جائے تو بندۂ لاچار کیا کر سکتا ہے۔ میں ہکّا بکّا ہو کر واپس آگیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس برِ اہ مملکت نے مجھے اپنی اسناد دے کر بھیجا تھا وہ مسلسل اور بار بار مجھے حکم دے رہا ہے کہ میں اپنے موقف پر ڈٹا رہوں اور حیدر آباد ایجنسی کو قائم رکھوں مگر ہمارے اکابر میری سفارتی پوزیشن کو "چیلنج" کرنے میں مصروف رہے اور میرے برخواست شدہ سکریٹری کی بیساکھی کے سہارے مجھے کراچی بدر کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور یہ ناچیز بڑے چاؤ سے قائم کئے ہوئے سفارت خانے کی لاش کو اپنے کندھوں پر لاد کر بار بار اور ہر دور کے وزراء خارجہ سے اپیلیں

کرتا رہا۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا ؎

یہ معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

آزادی کی جنگ لڑنے کے دعوے صدر اعظم کے آخری پیغام میں آزادی کی جنگ کو جاری رکھنے پر زور دیا گیا تھا۔ اگر اس دعوے میں خلوص اور استقامت تھی تو پھر کچھ پیش رفت ہونی چاہیئے تھی۔ مگر اس کے بعد جو واقعات پیش آئے۔ اُس میں یہ مقصد سوچ و فکر سے دور اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس وقت یہ کہا گیا کہ چونکہ حیدر آباد کا روپیہ ہماری تحویل میں نہیں اور حالات بھی سازگار نہیں اسلئے آزادی کی تحریک کو زندہ رکھنے کے بارے میں کوئی اقدام نہیں ہو سکتا۔ میری نظر میں یہ دلیل بہت پھسپھسی ہے اصل بات اپنے ایمان کی پختگی ہے اگر یہ ہے اور ارادے میں استقامت اور نیت میں خلوص ہے۔ تو پھر ؎

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لیکن اگر جذبہ کمزور ہو تو پھر وسائل کی تلاش ہوتی ہے۔ حالات کی سازگار ہونے کا انتظار ہوتا ہے اور اس انتظار میں اپنے سب بلند آہنگ دعوے نظروں سے اوجھل اور ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حیدر آباد کا روپیہ تحویل میں آگیا اور وسائل مہیا ہو گئے۔ تو پھر تحریکِ آزادی کے سب دعوے کیوں بھلا دیئے گئے کوئی صاحب دانش مجھے یہ سمجھا دے کہ کیا جنگِ آزادی کی واحد صورت یہی رہ گئی تھی کہ جو پرچم اس آزادی کا آخری نشان تھا اُسے اُسی آزادی کے نام پر سرنگوں کر دیا جائے۔

میر عثمان علی خان محسنِ قوم یا "غدار"؟ تقسیم ہند کے وقت میر عثمان علی خان قوم کے محبوب تھے اور کیوں نہ ہوتے اسلامی دنیا کے ہر گوشے میں مصیبت اور ضرورت کے وقت انہی کی طرف نظر اُٹھتی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا شاید ہی ایسا کوئی ادارہ ہو جو ان کی معارف پروری سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔ مغلیہ جاہ و جلال کی عظیم تاریخی یادگاریں۔ کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھیں اگر لاہور کی بادشاہی مسجد اور دہلی کی جامعہ مسجد بننے اور سجنے والوں

کو حال دل سُنا سکتیں تو وہ بتاتیں کہ اُنکی مرمت اور تزئین میں کس بندۂ خدا نے دلچسپی لی۔ جامعہ اسلامیہ علیگڑھ کے بام و در اگر بول سکتے تو وہ بتاتے کہ اس قومی درسگاہ کی ہر موقع پر کس نے مدد کی۔ نظام میوزیم۔ آسمان منزل۔ عثمانیہ ہوسٹل اور دیگر بے شمار عمارتیں عثمان علی خان اور خانوادہ آصفیہ کی علم دوستی کی گواہی دیتی ہیں۔ "گیسوے اردو" کو جس شانے کی ضرورت تھی عثمان علی خان کی بالغ نظری نے جامعہ عثمانیہ کی شکل میں مہیا کر دیا اس طرح ملت اسلامیہ کو جو اپنی قومی زبان کے استعمال سے محروم ہو کر گونگی ہو چکی تھی اُسے اپنے اس تاریخی اقدام سے طاقت گویائی عطا کردی اور قومی زبان کو اُس کا جائز مقام دلا دیا۔ بہار کے فسادات اور پھر اُس کے بعد ۱۹۴۷ء کے قتل و غارت کے دور میں ہندوستان کے کونے کونے سے جب ہزاروں مسلمان حیدرآباد کی پناہ گاہ میں پہنچے تو عثمان علی خان نے نہ صرف اُنہیں نقل و حمل کی سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ اُنکی آبادکاری اور روزگار فراہم کرنے میں ہر ممکنہ کوشش کی۔ اگر قائداعظم اور اُنکے قریبی ساتھی زندہ ہوتے تو وہ تصدیق کرتے کہ عثمان علی خان نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لئے کتنی بار اور کس کس طرح گرانقدر مالی امداد مہیا کی۔ قوم پر انکے اتنے عظیم احسانات تھے کہ انکا نام مسلمانان ہند کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا چاہیئے تھا۔

مگر ادھر استبدادیت کے دیوتا نے مسلمانوں کے اقتدار اور وقار کا گلا گھونٹ دیا ادھر یہ ایک محسن قوم کہلایا جانے والا بدقسمت انسان یکایک "غدّار" بن گیا سقوط حیدرآباد کے بعد وہاں سے ان گنت دانشور آئے اور خود پاکستان میں بہت سے علمی تحقیقاتی ادارے قائم ہوئے ان میں کسی نے اُن کی "غدّاری" کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ دنیا کا تجربہ ہے۔ کہ پروپیگنڈا سفید کو سیاہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح یہ بلا ثبوت الزام بار بار دہرائے جانے سے من و عن تسلیم کر لیا گیا۔ حیدرآباد میں جو کچھ ہوا۔ اُس کی ذمہ داری کسی پر تو پڑنی تھی سارا الزام نظام پر ہی دھر دیا گیا اور وہ اس المناک "ڈرامے" کا واحد ناپسندیدہ کردار بن گیا۔ عثمان علی خان انسان تھے فرشتہ نہیں تھے اُن میں بھی بہت سی انسانی کمزوریاں تھیں جن سے کوئی گوشت و پوست سے بنا ہوا انسان

خالی نہیں ہوتا اور رہبر لوں بھی سات پشتوں کا فرمانروا فرشتہ نہیں ہو سکتا۔ عثمان علی خان کو اپنی کمزوریوں کا خود اعتراف تھا چنانچہ اپنے ایک شعر میں انہوں نے خود کہا تھا ؂

گو میں گنہگار تھا لیکن زہے نصیب ۔ رحمت نے ہر گناہ سے مجھے پاک کر دیا

پاکستان میں مجھے اُنکا نمائندہ ہونے کا شرف حاصل تھا مئی ۴۸ء میں ایک خفیہ ملاقات میں مجھے اُن سے بالمشافہ[1] گفتگو کا موقع ملا۔ اور مجھے اُنکے رجحانات کا علم ہوا میں بقائمی ہوش و حواس اُسے کیسے بھلا سکتا ہوں اور حیدرآباد کے المیے کے بعد وہ برابر مجھے ہدایت[2] دیتے رہے کہ جیسے بھی ہو اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ ایسی ہدایت دینے والا آخر کس منطق سے "غدّار" کہا جا سکتا ہے۔ اس پروپیگنڈے کا اثر ملک میں اتنا شدید تھا کہ وہ سینکڑوں ادارے تک اُسے بھول گئے جو کل تک اُنکی فیاضی اور معارف پروری کے گُن گاتے تھے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ امر تو یہ ہے کہ اُنکی رحلت کے موقعہ پر حکومت وقت کو بھی تعزیت کے دو چار رسمی فقرے کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ کیا اس برتاؤ کا وہ شخص مستحق تھا جس نے پاکستان کے آڑے وقت میں اُس کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے اپنا کیسۂ زر خالی کر دیا۔ اس جرأتمندانہ اقدام کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حیدرآباد مٹ گیا تاکہ پاکستان زندہ رہے۔

کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں سڑکوں پر غیر معروف شعرا اور دوسرے درجے کے سیاست دانوں کے نام کندہ ہیں۔ کہیں آجکل کے محسن کا نام بھی نظر آتا ہے۔ امت مسلمہ کے اس محسن کے اس سے بہتر اور زیادہ سنجیدہ اعتراف کا مستحق تھا۔ مگر افسوس اسکے نام کو سڑکوں پر کندہ کرنے کے لئے بھی موزوں نہیں سمجھا گیا۔ دنیا کا عام دستور ہے کہ مرنے والے اُنکے کردار کے روشن پہلوؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ کمزوریاں اور لغزشیں منصف حقیقی کو سونپ دی جاتی ہیں جو جزا اور سزا کا مالک ہے لیکن یہ عثمان علی خان کی بدنصیبی ہے کہ حیدرآباد کے سقوط کے بعد اُنکی لغزشوں اور کمزوریوں کی بے سروپا داستانوں پر ہی زورِ قلم اور زورِ خطابت صرف کیا

---

[1] حصہ دوم۔ ساتواں باب [2] ضمیمہ جات۔ ۱۳ سے ۱۶

جاتا ہے اور ملت کے لئے اُنکے عظیم احسانات تعصبات کے مذموم پراپیگنڈے کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں گُم ہوگئے ہیں ؟

میرے واجبات میری امانت کو حکومت کی تحویل میں دیتے وقت یہ بات طے ہوگئی تھی کہ میرے اور میرے عملے کے واجبات کا حق دوسری سب ادائیگیوں پر مقدم ہوگا مجھے خدشہ تھا کہ موقع پر سے ہٹائے جانے کے بعد یہ سمجھوتہ بھی بے توجہی اور لاپرواہی کا شکار ہو جائے گا۔ میں نے وزارت خارجہ کو اس بارے میں کئی بار توجہ دلائی۔ مگر وہاں سے کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ تھوڑے عرصے بعد خطوں کا جواب آنا بھی بند ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک شخص جس کا نام ابھی تک سفارتی فہرست میں شامل ہے کیونکہ ایسے رویّہ کا مستحق ہو سکتا ہے اور اس قسم کی بے اعتنائی سفارتی آداب کی کونسی شق کے تحت آتی ہے۔ اُس کے بعد میں نے اُس وقت کے صدر جنرل اسکندر مرزا سے جن سے حیدرآباد کے سقوط سے پہلے میرے بڑے گہرے مراسم تھے اور جو غلام محمد کے دور میں مجھ سے جو برتاؤ ہو رہا تھا اُس پر ہمدردی کا اظہار بھی کیا کرتے تھے رجوع کیا۔ اُنکا ردّ عمل بہت دلچسپ تھا۔ فرمایا "تم کو چاہیئے تھا کہ رقومات کو حکومت کی تحویل میں دینے سے قبل اپنے واجبات اُس میں سے نکال لیتے" میں نے عرض کیا "جناب یہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ روپیہ میری ذاتی ملکیت نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے اُسے اپنے ذاتی حساب میں اُسے جمع نہیں کیا۔ وہ میرے پاس محض ایک امانت تھی۔ امانت کا جو مفہوم میرے ذھن میں ہے اُس میں مجھے یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ میں اپنے واجبات کا تعیّن خود ہی کروں اور خود ہی امانت کی رقم میں سے اپنے اندازے کے مطابق وضع کروں اب جو صورت حال پیش آگئی ہے اُس میں شاید مجھے امانت کے اس مفہوم کے بارے میں اپنے ذہن اور ضمیر سے سمجھوتہ کرنا پڑے مگر یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ اس قسم کی جیتا مجھ پر پھر پڑے" میرے اس استدلال میں جو طنز پنہاں تھا وہ انہیں پسند نہیں آیا اور مجھے یہ کہہ کر رخصت کر دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اس بارے میں مدد نہیں کر سکتے"۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت

نہیں کی کہ اگر وہ صدر حکومت ہونے کے بعد بھی میری مدد نہیں کر سکتے تو پھر کون کر سکتا ہے اس برتاؤ کے بعد میں نے دوبارہ جنرل اسکندر مرزا سے رجوع نہیں کیا۔

اس زمانے میں شدید مالی مشکلات سے دوچار تھا جسکی وجہ سے میں خود پریشان تھا میری اہلیہ کو اس کا شدید احساس تھا اُس نے ایک بار اپنے کراچی کے قیام کے دوران میرے بھائی کے واسطے سے جو جنرل صاحب کے کبھی برج پارٹنر رہ چکے تھے ملاقات کی اور اپنے انداز میں صورت حال کی وضاحت کی اُس دن جنرل صاحب کا موڈ ذرا خوشگوار تھا۔ انہوں نے وزیر مالیات کے نام ایک خط دیا۔ مجھے اس کا علم اُس وقت ہوا جب اُس خط کی بنا پر مجھے تھوڑی سی رقم مل گئی اس خط سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں کہ میرے واجبات کا تعین خود صدر مملکت نے کیا ہے دوسرے یہ کہ امانت میں رکھائی ہوئی رقم ختم نہیں ہوئی۔ اس کے ختم ہونے کی کہانی مجھے ٹلانے کے لئے گھڑی جاتی رہی ہے۔ ایوب خان کے دور میں، میں نے اس مسئلہ کو پھر اُٹھایا منظور قادر نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا مگر بتایا کہ وزیر مالیات نے انہیں اطلاع دی ہے کہ امانت کی رقم میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ اسلئے مجبوری ہے۔ اسپر میں نے حکومت پاکستان کا وہ مراسلہ دکھایا جس میں مجھے تحریری یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ حیدرآباد کے سامان کی قیمت پانچ سال کی مدت میں ایجنسی کو واپس کر دی جائے گی اور گذارش کی کہ اگر امانت کی رقم میں کچھ باقی نہیں ہے تو وہ مال کی اداشدنی رقم میں دی جائے میری اس گذارش کے چند روز کے بعد اُنہوں نے مجھے یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ اُنہیں بتایا گیا ہے۔ کہ اس قسم کے مال کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اسلیئے مجبوری ہے۔ اس کے بعد میں نے محمد شعیب وزیر مالیات سے رجوع کیا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ تحویل میں لئے ہوئے سامان کی کوئی فہرستیں اُنکے ریکارڈ میں نہیں ہیں اسلئے اس بارے میں کوئی پیش رفت ممکن نہیں۔ محمد شعیب صاحب کا حیدرآباد سقوط سے پہلے میرے معاملات سے براہِ راست تعلق تھا اور تحویل میں دیئے ہوئے سامان کا بیشتر حصہ اُنہی کے ذریعہ خریدا گیا تھا میں نے اُنہیں یہ بات یاد دلائی کہ یہ فہرستیں تو انہی کے پاس ہونی چاہئیں اگر

اگر فہرستوں کی موجودگی میری پیشکش سے مشروط تھی تو یہ نقطہ اُس وقت اٹھایا جانا چاہیئے تھا جب میری پیشکش زیرِ غور تھی اس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی گفتگو کے دوران میں نے حیدر آباد کی ایجنسی کے بارے میں توجہ دلائی اور جس طرح میرے برخواست شدہ سکرٹری کو اُس کا کرتا دھرتا بنا دیا گیا ہے اُس پر شدید احتجاج کیا اُنکا جواب سن کر میں سکتے میں آگیا فرمایا "تمہیں تو ملازمت ملی ہوئی ہے اس طرح اگر تمہارے سکرٹری کے روزگار کا بندوبست ہوگیا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" ایک اہم سیاسی مسئلہ کے بارے اُن کا یہ غیر سنجیدہ رویہ تھا اُسکے بعد مجھے اُسنے مزید کچھ کہنے کی کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔ کئی برس کے بعد مجھے پتہ چلا۔ جس کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ میرے عملے کے اُن لوگوں کو (اُنکے بیان کے مطابق) واجبات ادا کر دیئے گئے جنہوں نے مجھ سے بیوفائی کی۔ اور میں اور عملے کے دوسرے لوگ ابھی تک اپنے واجبات کی ادائیگی کے لیے انتظار کر رہے ہیں!! اپنے واجبات کے بارے میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی بیان کرتا چلوں میرے کراچی سے آنے کے چار پانچ برس بعد وزارت مالیات کے ایک بڑے افسر نے نیم سرکاری کے ذریعہ مجھے اطلاع دی کہ اگر میں اپنے واجبات کی تفصیلات پیش کروں تو وہ میرا کلیم بڑی خوشی سے بھارتی حکومت کو بھیجدیں گے۔ مجھے اس مراسلے پر بے اختیار ہنسی آئی لیکن اُس کے ساتھ لاعلمی اور لاپرواہی کے اس شاہکار کو پڑھ کر دُکھ بھی ہوا۔ ہنسی اسلئے کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ۲ کروڑ کی رقم سے انکاری ہونے کے بعد بھارتی حکومت میرے کسی کلیم کی پذیرائی کرے گی اور دُکھ اسلئے کہ میرے مخصوص حالات اور حکومت کے وعدوں کا لحاظ کئے بغیر میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے اس پیشکش کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اگر سب حالات کو جانتے ہوئے حکومت میرے کلیم کو عام دعویداروں کی سطح ہی پر غور کر سکتی ہے تو میرے دعوے کو ہمیشہ کیلئے داخل دفتر کر دیا جائے اسکے بعد آج تک میں نے اس بارے میں پھر کچھ نہیں سُنا غالباً ضابطہ کی کارروائی کے بعد میری مثل داخل دفتر ہو گئی ہے!!

من نہ کردم شُما حذر بکنید

حصۂ سوم

آخری باب

گذشتہ صفحات میں آپ اُن واقعات کی داستان پڑھ چکے ہیں جو حیدر آباد کے المیئے پر منتج ہوئے آپ کو اُن عوامل اور مُحرکات کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا جو اُسے زوال کے راستے پر لے گئے۔ یہ ایک عبرت ناک کہانی ہے۔ دکن میں مسلمانوں کا اقتدار مختلف شاہی خاندانوں کے نام سے ۷-۸ سو برس تک قائم رہا۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ حکمرانوں کی نااہلی۔ بداندیش مُشیروں کی غلط روی۔ خُوشامدی درباریوں کی چاپلوسی اور حقائق پوشی اور بیرونی طاقتوں کی چالبازیوں سے یہ اقتدار آہستہ آہستہ سمٹ رہا تھا اور اُس کا دائرہ کار تنگ ہوتا جا رہا تھا یعنی وہ چراغ جس کی روشنی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا کرتی تھی اب ٹمٹما رہا تھا مگر ابھی بجھا نہیں تھا ۱۹۴۷ء میں یہ اقتدار ایک بڑے وسیع خطہ ارضی پر اب بھی باقی تھا اگر ہوشمندی اور حقیقت پسندی سے کام لیا جاتا تو اسی خاک سے چنگاری پیدا ہو سکتی تھی۔ مگر وائے افسوس کہ اقتدار کی بنیادیں اتنی کمزور پڑ چکی تھیں۔ کہ وہ ایک ہلکے سے دھکے سے دھڑام سے گر پڑی اور صدیوں کا اقتدار چشم زدن میں ایسا غائب ہُوا جیسے کہ وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ یہ ہماری غلطیاں تھیں جو ہمیں لے ڈُوبیں۔ یہ مکافات عمل تھا جس سے حقائق کی روشنی میں انکار ممکن نہیں۔ ہماری ملّی تاریخ میں یہ پہلا موقع نہیں کہ صدیوں کا اقتدار آناً فاناً ملیامیٹ ہو جائے۔ وراثتِ ارضی کسی قوم کی اجارہ داری نہیں جب وہ باری تعالٰے کے احکام کی خلاف ورزی پر اُتر آتی ہے تو وہ رحمتِ الٰہی کی مستحق نہیں رہتی اور وراثت ارضی سے محروم کر دی جاتی ہے۔ اُندلس میں ہمارا

اقتدار اسی طرح ایسا ختم ہُوا۔ کہ وہاں کئی صدیاں حکومت کرنے بعد ایک مسلمان نظر نہیں آتا اور ہماری عبادت گاہیں ؏

مسجدیں مرثیہ خوان ہیں کہ نمازی نہ رہے

کے مصداق زبان حال سے ہمارے زوال کی داستان بیان کرتی ہیں۔ اُسی قانونِ فطرت کے عین مطابق حیدر آباد ہماری ملّی تاریخ کا دوسرا غرناطہ بن گیا۔ اُس کی دلخراش کہانی جہاں اُس کے باسیوں کو خُون کے آنسو رُلاتی ہے وہاں مملکتِ خُدا داد پاکستان کے لئے بھی بڑی عبرت کی حامل ہے۔ حیدر آباد کے باسیوں نے بہت سی فاش غلطیاں کیں اور اُن کا خمیازہ بھگت رہے ہیں آپ ہماری غلطیوں کو نظر میں رکھئے اور اُن سے احتراز کیجئے۔ آیئے حیدر آباد میں ہونے والے واقعات کی روشنی میں اُن غلطیوں کا کھوج لگائیں جنہوں نے ہمیں یہ روز بد دکھایا۔

۲۔ سب سے پہلے ہماری نظر حیدر آباد کے مُعاشرے میں اسراف۔ ناعاقبت اندیشی تن آسانی۔ ہوش سے بیزارگی اور جوش کی فراوانی پر پڑتی ہے جو اُسے بربادی کے گڑھے تک لے گئے۔ اگر ہم اپنے وطن عزیز کے معاشی۔ معاشرتی اور اخلاقی حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں تو چشم بینا کو اُس میں بھی اسی نوع کی خرابیوں کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ یہاں اُمرائے قدیم کے دربار تو نہیں سجتے نہ اُس قسم کے بگڑے ہوئے نواب ملتے ہیں جو اچھے دنوں کی یادوں کو دل میں بسائے ہوئے دُنیا کی تلخ حقیقتوں سے دُور ایک خیالی دُنیا میں بستے تھے۔ مگر یہاں کے بڑے زمینداروں صنعت کاروں اور ہمہ قسم کے "نودولتیوں" کا طمطراق۔ جھوُٹی شان۔ نام ونمود۔ اطوار اور رجحان فکر وہی ہے۔ اور "اب تو آرام سے گذرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خُدا جانے" والا سوچنے کا انداز ہے۔ ناعاقبت اندیشی کا غلبہ حیدر آباد سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ ہر دولت مند چاہے وہ زمیندار ہو۔ صنعت کار یا سیاست دان وطنِ عزیز کے مفاد سے بے نیاز ہو کر اپنے حال میں مگن ہے۔ اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہے۔ اُسے نہ زمانہ حال کا کچھ ہوش ہے اور نہ مستقبل کی

فکر ہے۔ اِس طبقے میں نئی نسل جس طرح پروان چڑھ رہی ہے اُس سے اہل نظر و فکر اور سنجیدہ محبِّ وطن لوگوں کے دلوں میں بجا طور پر خدشات پیدا ہو رہے ہیں۔ ماں باپ میں سے کسی کو بھی اولاد کو تربیت دینے کی فرصت نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بچّوں کو جنم دینے کے بعد اب اُن کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی۔ پیدا ہوتے ہی بچّے ماں کی گود سے محروم ہو جاتے ہیں ڈبوں کے دوُدھ سے وہ پلتے اور بڑھتے ہیں اور ہوش سنبھالتے ہی مشنری اداروں کے سپُرد کر دیئے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے مُعاشرے سے بالکل کٹ جاتے ہیں اور اپنی زبان۔ لباس۔ روایات۔ رہن سہن کے طریقوں۔ ادب و آداب اور مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ماں باپ اپنی ناعاقبت اندیشی اور بھولے پن سے یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے بچّے بڑی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ پاکستان اُن کے لئے ایک اجنبی ملک بن جاتا ہے۔ اُن کا قبلہ ہی کہیں اور ہوتا ہے۔ ایسی نسل سے یہ آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ایک نظریاتی مملکت کی پاسبانی کا حق ادا کر سکے گی یا اُس سے کوئی جذباتی لگاؤ ہو سکے گا۔ اِسلامی نظام کے دعویدار بزرگ اگر نئی نسل کی تعلیم کی طرف بھی ذرا سنجیدگی سے تھوڑی سی توجّہ دیں تو اُن کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ میں بتا چکا ہوں کہ حیدر آباد کے مُعاشرے میں بعض بڑی کمزوریاں تھیں۔ مگر وہاں کا طریقۂ تعلیم نوجوانوں کو الحاد اور بے راہ روی کی راہیں نہیں سمجھاتا تھا اور بچّوں میں گھر کی تربیت اور ماحول سے مذہب سے یک گونہ لگاؤ تھا۔ بدقسمتی سے یہاں یہ صورت نہیں۔ یہاں ہم گھریلو تربیت کے فقدان اور غلط تعلیم سے خوُد اپنے بچّوں کو مذہب اور مُعاشرے کے خلاف بغاوت پر اُکسا رہے ہیں۔ یہ نہ بھولئے کہ دو متوازی اور کئی اعتبار سے متضاد نظریات کے حامل نظام ہائے تعلیم پاکستان کو دو معاشرتی طبقوں میں بانٹ دیں گے جو ایک نئے طبقاتی انتشار کو جنم دے گا اِس لئے اگر ہم نظریہ پاکستان کے بارے میں مخلص ہیں تو ہمیں طریقۂ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اور حکومتی مشینری کے کل پُرزوں کو اسلامی خراد پر ڈھالنا ہوگا اُس کے بغیر اِسلامی نظام کو رائج کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ

تعبیر نہیں ہوگا۔

۳۔ حیدرآباد کے رؤساء اور اُمراء دولت کے نشے میں مدہوش تھے اور اُس کی نمود اور نمائش کا اُنہیں دیوانگی کی حد تک شوق بھی تھا لیکن اُن میں اتنی بے لگام ہوس نہیں تھی جو ہمارے پاکستانی اُمراء اور دولتمندوں کی زندگی میں سرایت کر گئی ہے جب کسی قوم کے ذہن پر دولت جنون کی حد تک غلبہ حاصل کرلے تو وہ معاشرہ اور اُس سے تعلق رکھنے والے لوگ بکاؤ مال بن جاتے ہیں۔ ہر چیز کے دام لگ جاتے ہیں۔ حب الوطنی ختم ہو جاتی ہے اور اخلاقی اقدار اور قومی روایات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اخلاقی تنزل کی یہ کیفیت اُس معاشرے کو زوال اور بربادی کے راستے پر لے جاتی ہے اللہ ہماری قوم کو اس سے محفوظ رکھے۔

۴۔ حیدرآباد کے المیئے میں میری نظر میں فرزند زمین کا وہ تصوّر بھی تھا جسے "ملکی غیر ملکی" کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ ایک طرف آپ ایک اسلامی حکومت ہونے کا دعویٰ کریں۔ دوسری طرف مفاد پرستوں کی شہ پر مسلمان آبادی کے تناسب میں اضافے کو ہر حیلے اور بہانے سے روکیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کیسے چل سکتی تھیں۔ چنانچہ جمہوریت کے دور میں ہم خود ہی اپنے دھوکے میں مات کھا گئے۔ پاکستان میں ۳۷ برس کے قیام کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ جس علاقائی عصبیت کے مجہول تصوّر کا ہم حیدرآباد میں شکار تھے وہ پاکستان میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہر شعبہ زندگی میں ہر مرحلہ اور ہر قدم پر صوبہ واریت ہم پر مسلط ہے ہم پاکستانی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے علاقے کی نسبت سے اپنا تشخص کراتے ہیں ایک شخص نے کہاں جنم لیا اور کس طرح کس علاقے سے اُس کا تعلق پیدا ہوگیا وہ ایک اتفاقی حادثہ ہے اس میں اُس کی پسند ناپسند کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایک شخص کتنا صاحب علم و فضل ہے۔ کتنا صاحب کردار ہے۔ کتنا محبِ وطن ہے بلکہ یہ کہ وہ کس علاقے کا باسی ہے ماضی میں بڑی بڑی سلطنتوں کو انہی علاقائی عصبیتوں نے تہس نہس کر دیا۔

علامہ اقبال نے اسی صورت حال کو دیکھ کر کیا پتہ کی بات کہی ہے ؎

مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیراہن اُس کا ہے مذہب کا کفن ہے

وطنیت کا یہ تصور اگر صحیح ہوتا تو ہمارے آقا اور مولا مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کیوں فرماتے۔ دور کیوں جائیے ۱۹۴۷ء میں ہم ان علاقوں کو چھوڑ کر کیوں آتے جہاں ہمارے آباؤ اجداد ابدی نیند سو رہے ہیں۔ جہاں ہماری نال گڑی ہے جن سے ہماری زندگی کی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ پھر یہ تصور اگر حقیقت پر مبنی ہوتا تو ۳۰ لاکھ افغان اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں کیوں پناہ لیتے اور فلسطینی مسلمان اپنی جنم بھومی سے علیحدگی اختیار کر کے دردر کی خاک کیوں چھانتے۔ اب جب میں اس مملکت میں جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی اِس عصبیت کو پروان چڑھتے دیکھتا ہوں تو یقین مانئے رونے کو جی چاہتا ہے اور بے اختیار دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھ جاتے ہیں کہ اے خالق ہر دوسرا ہم توحید پرستوں کو اس بُت کی پوجا سے محفوظ رکھ اور علامہ اقبال کے الفاظ زبان پر آجاتے ہیں ع

اے مصطفوی خاک میں اِس بُت کو مٹا دے

۵۔ حیدرآباد میں ہندو مسلمان اختلافات تو تھے جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشمکش جاری رہتی تھی لیکن مسلمان ایک جسدِ واحد تھے۔ اگر اُن میں کوئی اختلافات تھے بھی تو وہ سیاست میں رقابت کی وجہ سے تھے نہ کہ فقہی اور اُسی نوع کے دوسرے تنازعوں کی وجہ سے ہمارے پاکستانی معاشرے میں علاقائی عصبیتوں کے علاوہ اور بہت سے جاہلانہ تعصبات انتشار پھیلا رہے ہیں یہ ہیں فقہی تنازعے۔ برادریوں کی چپقلش اور لسانی اختلافات۔ اس قسم کی غیر اسلامی عصبیتوں کو ہوا دینے والے بزرگوں کو شاید اس کے سوا دوسرا کوئی کام ہی نہیں وہ اپنی تمام تر

توانائیوں اور صلاحیتوں کو قوم میں فکری انتشار پھیلانے میں صرف کر رہے ہیں۔
اگر وُہ اپنے فالتو لمحات میں سے تھوڑا سا وقت قوم میں یکجہتی پیدا کرنے میں اور وطن
عزیز میں استحکام کے لئے صرف کریں ...... تو یہ مملکت امن و آشتی کی جنت بن جائیگی
مسلمان ایک قوم ہیں اور یہ خطہ زمین ہمیں باری تعالیٰ نے رمضان المبارک کی ستائیسویں شب
کے مُبارک وقت میں عطا کیا تھا۔ فروعی اختلافات کی وجہ سے قوم کو ٹکڑیوں میں نہیں
بانٹا جاسکتا۔ ہمارے دشمن تو دل سے چاہتے ہیں کہ ہم ٹکڑیوں بٹ جائیں تاکہ وُہ
ایک ایک کر کے ہمیں آسانی سے ہڑپ کرلیں۔ اتحاد میں قوت ہوتی ہے۔ انتشار زدہ
قوم نہ اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرسکتی ہے اور نہ جغرافیائی سرحدوں کی باری
تعالےٰ کا ارشاد ہے "کہ اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑو" جاہلی عصبیتوں کی تاروں
پر ناچنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔

۶۔ حیدرآباد کے المیے میں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ جو قوم محبِ وطن افراد اور وطن
فروشوں میں تمیز نہیں کرسکتی مردم شناسی کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے اور اپنے
مستقبل کو مفاد پرستوں کے سپرد کر دیتی ہے وہ کبھی نہ کبھی دھوکا کھا کر برباد ہوجاتی
ہے۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی سلطنتوں کو آخر کس نے تباہ کیا۔ گھر کے بھیدیوں
نے ہی تو انہیں روزِ بد دکھایا۔ قرطبہ اور غرناطہ کی مملکتوں کو کن عناصر نے اپنے مفاد
کی خاطر بیچ ڈالا۔ مملکت خداداد پاکستان کو کس نے دولخت کر دیا۔ کیا ان المناک
تاریخی حادثات میں ہمیں عبرت کے سبق نہیں ملتے ؟ قوم کا نظریہ حیات اُس کا انمول
سرمایہ ہوتا ہے اُس میں کسی صورت میں کوئی سمجھوتہ یا سودے بازی نہیں ہونی چاہیئے
اگر کوئی قوم کسی سیاسی یا اکابر کی ذاتی مصلحتوں کے تحت ایسا کرتی ہے تو وہ ایک
بے پیندے کے لوٹے کی طرح لڑھکتی ہی رہے گی۔ اللہ ہمیں اچھے اور بُرے، کھرے
اور کھوٹے میں تمیز کرنے کی توفیق دے اور ماضی کے المیوں اور حادثات سے عبرت
حاصل کرنے کی سمجھ دے۔ اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہمیں اپنی سوچ
وفکر اور منصوبوں میں زندگی کی حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ہم اپنے وطن

اور معاشرے کے لئے بہتر سے بہتر سہولتوں کی خواہش رکھنے اور اُن کے حصول کی
کوشش کرنے کا حق رکھتے ہیں مگر ایسی خواہش اور ایسی کوشش کرتے وقت اپنے
قومی وسائل اور ذہنی صلاحیتوں میں خامی سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ جہاں آپ
نے اپنی خواہشوں کو بے لگام ہونے دیا حالات قابو سے باہر ہوجائیں گے اور لینے
کے دینے پڑجائیں گے زمین پر قدم جمانے سے پہلے خلا میں جانے کی کوشش نہ کیجئے
اللہ ہمیں حقیقت شناسی کی صلاحیت سے نوازے۔

۷۔ حیدرآباد کے معاشرے میں رشوت، بیروی اور ہمہ قسم کی دوسری بدعنوانیاں
جاری اور ساری تھیں اور ان سب اخلاقی کمزوریوں نے اُس کی بربادی میں حصّہ لیا۔
اس لئے ہم جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے پاکستانی معاشرے میں جس قسم کی گھناؤنی
بدعنوانیاں پیدا ہوگئی ہیں اُن کا حیدرآباد میں اُس گئی گذری حالت میں تصوّر بھی نہیں
کیا جاسکتا تھا تو ذھن کو ایک شدید دھچکا لگتا ہے اس صورت کے لئے دوسرے
عوامل کے علاوہ بڑی حد تک انتظامیہ ذمہ دار ہے۔ جو ضرورت مندوں کی بیچارگی
سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتی ہے اور اپنے مفاد میں ملک کی ترقی میں روڑے
اٹکاتی ہے۔ ہمہ قسم کی عصبیتوں کو ہوا دیتی ہے اور اِس طرح ملک کے استحکام میں
رخنہ اندازی کرتی ہے انتظامیہ کا یہی کردار ہم نے حیدرآباد میں دیکھا تھا یہی ہم
یہاں دیکھ رہے ہیں انتظامیہ ہی سے متعلق حضرات اپنے مفاد کی خاطر بونوں کو قدآدم
شخصیتیں بنا کر پیش کرتے ہیں اور سیاست دانوں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتے
ہیں۔ وطن کے مفاد کا تقاضا ہے کہ اس صورتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے
ہمارے ہاں سول سروس اکیڈمیاں ہیں اور انتظامیہ کے لئے تربیتی کالج بھی۔
اگر ان اداروں کے نصاب میں حُبّ الوطنی کے درس کو بھی شامل کر دیا جائے تو
مُلک کا بھلا ہوگا۔

۸۔ آخر میں یہ عرض کر دوں کہ یہ سب میں بھرے دل اور نمناک آنکھوں سے
لکھ رہا ہوں ہم نے بہت دُکھ اٹھائے ہیں اور یہ زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے

میں اِن سب کو کیسے بھلا دوں میری باتوں سے اگر کوئی چیز طبعِ نازک پر گراں گزرے تو سمجھ لیجئے۔ کہ سیلاب سے بچ کر نکلنے والے کے ذہن پر اُن ناگفتہ حادثات اور واقعات کے اثر زائل نہیں ہوئے۔ وہ قابلِ رحم ہے۔ مواخذہ کا مستحق نہیں اللہ ہمیں بصیرت اور حب الوطنی کے جذبے سے نوازے۔

وَمَا عَلَینَا اِلَّا البَلاغ

ضمیمہ (۱)

حیدر آبادی وفد کی قائدِ اعظم سے ملاقات کی مکمل روداد مورخہ ۴ اگست ۱۹۴۷ء

Ashok House,
New Delhi.

4th Aug., 1947

NOTE OF INTERVIEW WITH MR. M. A. JINNAH

The Prime Minister, the Constitutional Affairs Member and the Local Government Member interviewed Mr. Jinnah on the afternoon of 4th August, the subject of interview being the note sent by His Exalted Highness to Mr. Jinnah on 29th July. In the course of a separate interview Sir Walter Monchton had the same day with Mr. Jinnah, Mr. Jinnah was apprised of the discussion the previous night with the Viceroy.

Mr. Jinnah said that the Viceroy and the Congress were following a policy totally contrary to the declared policy of H.M.G. H.M.G. had definitely offered the two alternatives of accession or political relations, and had also said that time would be given and that the choice would be free and voluntary. If H.M.G. had a shred of conscience, they would put a stop to the threats which were now being given both by the Viceroy and the Congress. It was highly probable that at least the Conservative party would rebel.

have no right to coerce me and I have the right to make a free choice".

He said that after all there was some such thing as standing for one's own right, despite every threat or provocation. If it comes to the worst, one should die fighting rather than yield on a point of fundamental principle. Mr. Jinnah gave the illustrations of what he called the greatest martyrdom in history, the example of Imam Husain standing for what was right and giving his life for it. All the sanctions in the world then existing were applied against him and his followers but they withstood them and suffered wholesale butchery. It was a moral triumph and they gave their lives for it. That should be the attitude which the Nizam and his advisers and the people should adopt. If it came to the worst, rather than to yield to coersion or to surrender what was right, he shouldb e prepared to abdicate and go in last resort and show to the world that he had fought uncomprisingly for right as against might. Mr. Jinnah said that, in our own times, England had done the same against the heaviest odds. Her people had fought till the end and had reversed the position, by perseverence and conviction, from defeat to victory.

This immoral aspect of threats and coersion

What had been said by the Viceroy about Berar was tentamount to daylight dacoity. It amounted to holding a Pistol at a person and making him sign the Instrument of Accession. H.M.G. had admitted the Legal and Constitutional claim of The Nizam over Berar; the Nizam had all the right on his side and what was being now threatened was the exercise of might. If, even the little that was necessary to continue the Nizam's legal title to Berar was not done it would not be much of a loss but the World would know the standard of morality which governed the conscience and acts of the Congress party. Mr. Jinnah said that he could not believe that this would be supported by sense of Honour and the conscience of the British people.

Mr. Jinnah said that he thought if H.E.H. and his advisers had really made up their minds against accession they should stick to it, firmly and loyally. He did not believe that threats of economic sanction would be carried out but even if they were, His Exalted Highness' line should be as follows :-

"You may do what you like and you may threaten me as you like but I shall never agree to sign any instrument of Accession or join the Union unless my conscience says that I should do so. You

to how far Pakistan would be able to assist Hyderabad economically for politically or with troops or arms and equipment and the like, Mr. Jinnah said that it was not possible for him at present to give any specific undertaking but that, generally speaking, he was confident that he and Pakistan would come to the help to Hyderabad in every way possible. There should be no doubt on that point. He said that even Countries with long established Governments could not give specific undertakings of the nature desired except by reference to the situation as it developed. The United States could not give any such undertaking when it was first approached by the United Kingdom for help during the last war, but the United States gradually began helping on different fronts until they ultimately came into the War itself. England was very nearly beaten when, to her good fortune Hitler diverted himself from England and attacked Russia, thus bringing the latter into a natural alliance with England and saving England from the concentrated attack which might otherwise have centered upon her. Then, America which had till then kept out of the War except by the way of moral and material help, entered the struggle as a result of the Japanese attack on her. These were providential developments without which all the odds were against England. They brought about Allied Victory. If

on the part of the Viceroy and the Congress, despite the declared policy of H.M.G. to the contrary, should be broadcast to world and be supported by propaganda so as to convince the man in the street of the wrongness of their position and the rectitude of Hyderabad's stand for her rights. But any such declaration or announcements should contain a firm indication of absolute willingness to enter into standstill arrangements which are necessary for the advantage of both and to avoid a breakdown of the administrative machinery or the prevalence of chaos. It must be stated that Hyderabad desires to help India and herself in producing the conditions necessary for stability. If, by the time of such announcement, the Congress persists in refusing to negotiate Stand-still agreement, the entire responsibility of the consequence will rest with them. The above declaration may mention the fact that while accession was never understood to be a condition for the conclusion of Stand-still agreements and had in fact nothing to do with them, even such agreements had been refused because the State had declined to accede and had chosen the other alternative offered to the State both by His Majesty's Government and by the Political parties through their acceptance of Plan of June 3.

As regards His Exalted Highness question as

Constitutional Affairs Member was requested to prepare a record of the interview.

The above notes are correct of the interview and represent my views and I hope that H.E.H. will be firm and accept them and act accordingly and I most fervently pray to God that he would help us all as our cause is righteous.

Sd/ M. A. Jinnah,
4th August, 1947,
New Delhi.

Hyderabad was short of petrol or kerosene, it would not matter if, on the other hand Hyderabad had abundance of firmness, preserverence and courage. The Russians were threatened by a blockade against them but they won the war. If Hyderabad was similarly threatened there would be other ways to fight, not necessarily with guns if there were no guns, and not necessarily with mechanised transport if there was no petrol.

The Prime Minister thanked Mr. Jinnah for the interview and for the elucidation of his views on the different points raised by His Exalted Highness; he also said that H.E.H. would expect a written reply as he had made that request in his letter to Mr. Jinnah. Mr. Jinnah said that with all the volume of work thrust upon him and the short time left between now and the establishment of Pakistan, it would be most difficult for him to write a detailed letter answering each of the points raised by His Exalted Highness. He said, however, that the best way would be to have a record prepared of the interview. The record could then be hsown to Mr. Jinnah the same night at 9.30 and, if he had any modifications to make he would make them after which he could sign the record and give it back for submission to His Exalted Highness. The Prime Minister agreed with this suggestion and the

حیدرآباد کے قائدین کے نام مولینا مودودی کا مکتوب مورخہ ۲۵ر دسمبر ۴۷ء

اس پر فرداً فرداً میرے ساتھ بحث شروع کردیں اس قسم کی بحثوں کے لئے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ میں ان کا کوئی فائدہ دیکھتا ہوں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اگر آپ مسلم لیگ یا اتحادالمسلمین کو برحق سمجھتے اور انہی طریقہ پر چلنے میں فلاح دیکھتے ہیں تو جائیے انہی کے ساتھ کام کیجئے میں ان کو اصولاً غلطی پر سمجھتا ہوں اور نہ مجھے ان کے طریقہ پر کام کرنے میں کوئی فلاح نظر نہیں آتی اس لئے جو راستہ میں نے کتاب الٰہیہ اور سُنّت رسُولُ اللہؐ سے صحیح پایا ہے اسی پر چلنا چاہتا ہوں میں اپنے دلائل لکھ کر شائع کرچکا ہوں انھیں دیکھ کر جس کا قلب مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے ٹھیک ہے اور جس طریقہ پر میں کام کرنا چاہتا ہوں وہ درست ہے وہ میرے ساتھ آئیں اور جس کا قلب مطمئن نہ ہو وہ مجھ سے بحث کرکے اپنا اور میرا وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کام میں اپنی قوتیں صرف کرے جس کے صحیح ہونے پر اس کا قلب مطمئن ہے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

اسد علی جوہر
نظام آباد

(۳۱)

مورخہ ۲۵ر دسمبر ۴۷ء

محترمی و مکرمی السلام علیکم

حیدرآباد کے قائدین کے لئے ایک ہمدردانہ مشورہ

حیدر آباد کے مسلمانوں سے دینی اخوت کی بناء پر میرا جو تعلق ہے۔
اگرچہ اس کا بھی یہہ تقاضہ ہے کہ میں اس نازک موقعہ پر انکو ایک خیرخواہانہ
مشورہ دوں۔ لیکن اس کے علاوہ حیدر آباد سے اس بناء پر میرا ایک ذاتی
تعلق بھی ہے کہ اورنگ آباد میرا پیدائشی وطن ہے اور میری زندگی کا
نصف سے زائد حصہ حیدر آباد ہی میں بسر ہوا ہے۔ اس دوہرے
قلبی تعلق کی وجہ سے میں اس تمام تشویش اور فکرمندی میں بعد مقام کے
باوجود حیدر آباد کے مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوں۔ جس میں وہ
موجودہ سیاسی صورت حال کی وجہ سے اپنے آپ کو مبتلا پا رہے ہیں۔
یہی چیز مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ میں بلا طلب اپنا مشورہ ان حضرات کی
خدمت میں پیش کروں جو اس وقت مسلمانان حیدر آباد کی
رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری
ان گذارشات پر وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ اور سرسری طور پر
انہیں نظر انداز نہ کر دیں گے تاہم وہ اگر ایسا کریں تو میں اپنی اخلاقی
ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاؤں گا اور میرا ضمیر مطمئن رہے گا کہ
اپنے بھائیوں کا جو حق مجھ پر عائد ہوتا تھا۔ اسے ادا کرنے کی میں نے
کوشش کر دی۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے ابھی ابھی اپنا جو انجام دیکھا ہے
اور دیکھ رہے ہیں وہ دراصل خمیازہ ہے ان کوتاہیوں کا جو پچھلی
صدیوں میں ہمارے حکمران ہمارے امراء ہمارے مذہبی پیشواؤں کا
ایک بڑا گروہ اور باستثناء چند ہمارے عام اہل ملت اپنے اس فرض کی
ادائیگی میں برتتے رہے ہیں۔ جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے
ان پر عائد ہوتا تھا۔ اگر وہ اسلام کی صحیح نمائندگی کرتے۔ اگر وہ اپنے
اخلاق اور معاملات اور اپنی سیرتوں میں اسلام کا صحیح نمونہ پیش کرتے
اگر وہ اپنی سیاست اور حکمرانی میں عدل و انصاف پر قائم رہتے۔
اور اپنی طاقتوں کو اسلام کی سچائی پھیلانے میں صرف کرتے تو

آج دہلی اور مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب سے مسلمان اس طرح
بیک بینی و دوگوش نہ نکال دئے جاتے جیسے اس وقت نکالے
گئے ہیں۔ اور یوپی۔ بہار اور وسط ہند میں ان کے سر پر اس طرح
تباہی منڈلا رہی نہ ہوتی جیسی آج منڈلا رہی ہے۔ یہہ وہ علاقے ہیں
جہاں سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا اقتدار رہا ہے۔ جہاں
مسلمانوں کی بڑی بڑی عظیم الشان جاگیریں حیدر آباد کی پائیگاہوں
سے کئی گنی زیادہ بڑی جاگیریں قائم رہی ہیں۔ اور جہاں مسلمانوں کی
تہذیب اور ان کے علوم و فنون کے عظیم الشان مرکز موجود رہے
ہیں۔ لیکن عیاشی دنیا میں انہماک۔ فوجی طاقت اور سیاسی
اقتدار پر انحصار۔ اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل اور انفرادی
سیرتوں اور اجتماعی طرز عمل میں اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا
یہہ نتیجہ ہوا کہ ان علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی۔ مسلمان ان کے
درمیان آٹے میں نمک کے برابر رہے اور دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے
معاشی اور سیاسی دباؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفاء
کرتے رہے۔ پھر جب سیاسی اقتدار ان سے چھنا اور ایک غیر ملکی قوم
ان پر مسلط ہوئی تب بھی انھوں نے اور ان کے رہنماؤں نے ان اسباب کو
سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ جن کی بناء پر وہ حاکم سے محکوم بنکر رہ گئے تھے۔
بلکہ انھوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے بل پر جینے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی
مطالبے اور دعوے ہمسایہ اکثریت کے مقابلے میں اس تیسری طاقت سے
جس کے اقتدار کو بہرحال عارضی ہی ہونا تھا۔ منواتے رہے۔

اس تمام مدت میں زندگی کی جو مہلت مسلمانوں کو ملی تھی اس میں
اپنی اخلاقی اصلاح کرنے اور اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے
بجائے مسلمان محض معاشی اور سیاسی فائدوں کے لئے غیر مسلم اکثریت کے
ساتھ کشمکش کرکے بظاہر یہہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان
کر رہے ہیں۔ لیکن دراصل وہ اپنی قبر کھود رہے تھے اور آخرکار آج

ہماری بدقسمت آنکھوں نے دیکھ لیا کہ بہت سے تو اس قبر میں دفن ہو گئے ہیں اور بہت سے زندہ درگور ہیں۔

یہہ جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آیا ہے میں چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کے مسلمان اس سے سبق لیں اور جو تھوڑی سی مہلت ان کو سنبھلنے کے لئے ملی ہے اس سے فائدہ اُٹھائیں۔

حیدرآباد کے مسلمانون کی پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ یہاں بھی صدیوں کی حکومت کے باوجود باشندون کی عظیم اکثریت غیر مسلم ہے اور مسلمان (۱۵) فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اور معاشی کشمکش سے دبی قومی منافرت پیدا ہو چکی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہو چکی تھی اور اس انتہائی تلخی کی حد تک پہنچتی جا رہی ہے جو دہلی اور پنجاب میں پائی جاتی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہہ ہے کہ یہاں مسلمان ریاست قائم ہے اور ریاست کے نظم و نسق پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن یہہ فرق جو ابتک حیدرآباد کے مسلمانوں کے بچے رہنے کا موجب بنا ہوا ہے کچھ ایسا زیادہ پائیدار اور مستحکم فرق نہیں کہ حیدرآباد کے مسلمان اس کے بھروسہ پر زیادہ مدت تک جی سکتے ہوں۔

انڈین یونین کی ہندو اکثریت جو سابق انگریزی طاقت کی وارث ہوئی ہے حیدرآباد کے چاروں طرف محیط ہے۔ حیدرآباد اس کے محاصرہ میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کسی طرف سے وہ مدد نہیں پا سکتا۔ ریاست کی (۸۵) فیصدی آبادی غیر مسلم ہے اور وہ مسلمان ریاست کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ موجودہ جمہوریت کے دور میں ۱۵ فیصدی مسلمانوں کا یہہ دعویٰ کہ حکمرانی ان کے ہاتھ میں رہے یا وہ کم از کم آدھے اقتدار کے شریک ہوں کسی طرح نہیں چل سکتا۔ یہہ بھی ممکن ہے کہ غیر مسلموں کے کسی معتد بہ عنصر کو

مسلمان اپنے ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکیں۔ یا کم از کم پچاس فیصدی رائے حاصل کر سکیں گے۔ اس صورت حال میں اگر مسلمان اپنے اقتدار کو اور ان تمام امتیازی حقوق اور اختیارات اور فوائد و منافع کو برقرار رکھنا چاہیں جو انہیں اب تک حاصل رہے ہیں تو اس کے لئے انہیں لڑنا پڑے گا۔ لڑائی محض ریاست کی غیر مسلم اکثریت سے نہیں ہوگی بلکہ آخر کار انڈین یونین کی فوجی طاقت سے ہوگی جس کی پشت پر پورے ہندوستان کی ہندو قوم کی متفقہ طاقت ہوگی۔ مجھے امید نہیں کہ اس لڑائی میں ریاست کی طاقت حیدرآبادی مسلمانوں کا ساتھ دے۔ رئیس کی فطرت یہہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے مفاد اور اپنے خانوادہ کے مفاد کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے سے اس کو بھی نواب جوناگڑھ کا سا انجام دیکھنا پڑے گا تو بعید نہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنا معاملہ طے کر لے اور اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دے۔ حیدرآباد کی فوج۔ پولیس۔ عدالتوں اور (Administe nation) پر بھی آپ یہہ بھروسہ نہیں کر سکتے کہ وہ اس لڑائی میں کچھ بہت زیادہ آپ کے کام آسکیں گے۔ اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی خالص مسلمان عناصر پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ سب میں اچھا خاصہ غیر مسلم عنصر موجود ہے۔ لہذا اگر خدانخواستہ لڑائی پیش آگئی تو شاید حیدرآباد کے مسلمانوں کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا جو مشرقی پنجاب کے مسلمانون کا ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں کم از کم اتنا فائدہ تو تھا کہ پاکستان کی سرحدیں قریب تھیں۔ اور پاکستان کی فوج ان کو نکال بحفاظت لانے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن اگر خدانخواستہ حیدرآباد کے مسلمانوں پر ایک طرف خود گھر کی اکثریت۔ اور دوسری طرف گرد و نواح کے علاقون کے مسلح ہندو جتھے اور تیسری طرف

انڈین یونین کی فوجیں ٹوٹ پڑیں اور خود ریاست کے نظم و نسق نے
ان کا ساتھ نہ دیا تو ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ نہ کہیں سے
وہ مدد پا سکیں گے۔ اور نہ وہ کہیں جا سکیں گے۔

اس بناء پر میرا یہہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اس فرق کو جو
سردست آپ کی حالت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت
میں پایا جاتا ہے کوئی بہت بڑا پائیدار قابل اعتماد فرق نہ سمجھیں
اور چند مہینوں کی مہلت کو جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گئی ہے ضائع
کرنے کے بجائے ایسا لائحہ عمل بنانے میں صرف کریں جس سے مسلمانان
حیدرآباد کی نہ صرف یہہ کہ جان مال اور آبرو بچ جائے بلکہ ان کو ایک بہتر
اور زیادہ شاندار مستقبل تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اصل چیز جو مسلمانوں کے لئے
ذریعہ تحفظ ہی نہیں بلکہ ذریعہ ترقی اور وسیلہ سربلندی ہو سکتی ہے
وہ تو یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں۔ اس کے صحیح نمائندے بنیں۔
اس کی دعوت اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے اور بحیثیت
ایک قوم کے امر بالمعروف اور ناہی عن المنکر بنکر کھڑے ہوں
یہی چیز ان کے لئے زندگی اور عزت کی زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے۔
لیکن ان خطوط پر اپنی قوم کو تیار کرنے کے لئے بہرحال ہمیں کچھ وقت
درکار ہے اور یہاں حال یہہ ہے کہ طوفان سر پر آچکا ہے۔ اس لئے
یہہ ناگزیر ہے کہ ہم کوئی ایسی تدبیر سوچیں جس سے یہہ طوفان ٹل سکے۔
اور ہمیں اتنا وقت مل جائے کہ ہم مسلمانوں کی عام اخلاقی اصلاح
کرسکیں اور دعوت اسلامی کے کام کو منظم طریقہ سے آگے چلا سکیں۔

میں اس مسئلہ پر بہت غور کرتا رہا ہوں کہ ایسی تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔
اور آخر کار میں جن نتائج پر پہونچا ہوں ان کو ذیل میں نمبروار بیان
کرتا ہوں۔

۱۔ ہندوستان اور حیدرآباد کی سیاسی صورت حال کو
دیکھتے ہوئے یہہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا کہ آپ انڈین یونین میں
حیدرآباد کے داخلہ کو اور حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کے
قیام کو روک سکیں۔ یہہ چیز بہرحال ہو کر رہے گی۔ آپ کے روکے
نہ رک سکے گی اور روکنے کی کوشش کا حال اس کے سوائے کچھ
نہ ہوگا کہ ریاست اور مسلمان دونوں تباہ ہو جائیں یا صرف مسلمان
تباہ ہوں۔ اور ریاست مسلمانوں کی بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ کو
بچالے۔ اس صورت حال میں عقلمندی یہہ ہے کہ مزاحمت کرنے کے
بجائے آپ ایسی بنیادوں پر مفاہمت کرنے کی کوشش کریں
جن سے انڈین یونین کی شرکت اور ذمہ دار حکومت کا قیام
نہ صرف یہہ کہ مسلمانوں کے لئے کم سے کم مضر ہو سکے بلکہ اس کے برعکس
مسلمانوں کو ایسے مواقع حاصل ہو جائیں جن سے وہ مذکورہ بالا مقصد
کے لئے اپنی عملی تعمیر زیادہ اچھی طرح کرسکیں۔

۲۔ مزاحمت اور کشمکش کرنے کے بجائے اگر اس وقت
حیدرآبادی مسلمانوں کی قومی تنظیم یعنی انجمن اتحاد المسلمین یہہ بات پیش کرے
وہ چند شرائط کے ساتھ انڈین یونین کے داخلہ اور مکمل ذمہ دار حکومت
کے قیام پر بخوشی راضی ہے تو مجھے امید ہے کہ اس مرحلہ پر اسٹیٹ
کانگریس اور انڈین یونین دونوں ہماری شرائط ماننے پر راضی
ہو سکیں گی۔

۳۔ میرے نزدیک جو شرائط اس غرض کے لئے مفید
ہو سکتی ہیں اور جن پر انڈین یونین اور اسٹیٹ کانگریس کو بآسانی راضی
کیا جاسکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

الف:۔ ریاست کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کو یہہ حق دیا
جائے کہ ان کے تہذیبی اور مذہبی معاملات کے لئے ان کا اپنا الگ

ایک organisation ہو جسے مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد کرنے اور خرچ کرنے کے لئے اور مذہبی اوقاف کا انتظام کرنے اور ان کی آمدنی کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرنے کے لئے نیز مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے معاملات نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ پر جاری کرنے کے لئے ضروری قانونی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں (ایسے ہی اختیارات اگر دوسرے غیر مسلم گروہ بھی حاصل کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں)

ب۔ مسلمانوں کے اس حق کو بھی دستور میں محفوظ کرایا جائے کہ وہ اپنے خرچ پر اپنی الگ مذہبی درسگاہیں قائم کر سکیں اور اس طرح سرکاری تعلیم گاہوں میں مسلمان بچوں کے لئے اپنے خرچ پر لازمی مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں (یعنی مسلمان بچوں کے لئے سرکاری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم (compulsory) ہوگی اور اس کا خرچ مسلمانوں کا مندرجہ بالا (organisation) برداشت کریگا۔

ج۔ ریاست کے لئے جو اسمبلی یا پارلیمنٹ بنے اس میں طریق انتخاب مخلوط تو ضرور ہو لیکن لازماً کوئی ایسا طریق انتخاب اختیار کیا جائے جس سے آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے۔ مثلاً (PROPORTIONAL REPRESENTATION) تناسب نمائندگی کا وہ طریقہ جس میں ملک کو یک نشستی حلقہائے انتخاب میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ پورا ملک ایک حلقہ انتخاب ہوتا ہے اور رائیں منفرد نمائندوں کے حق میں نہیں بلکہ پارٹیوں کے حق میں ڈالی جاتی ہیں۔

د۔ دستور کی ترمیم پر ایسی پابندی عائد کی جائے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے وہ حقوق جو انہیں پہلے دستور میں دے گئے ہوں بعد کی کسی ترمیم میں بآسانی سلب نہ کئے جا سکیں۔ مثلاً دستور کی ترمیم کے لئے استصواب رائے عامہ ضروری قرار دیا جائے اور

کم از کم (۸۰) فیصدی یا (۸۵) فیصدی ووٹوں کے بغیر کوئی ترمیم پاس نہ ہو سکے۔

ھ۔ اس بات کی ضمانت دیجائے کہ سرکاری محکموں میں اور ان کے کسی شعبے میں بھی مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے تناسب سے بہر حال گھٹنے نہ پائے گا اور کسی شعبے میں ان کے خلاف کوئی امتیازی پابندی عائد کی جائے گی۔

و۔ از روئے دستور تبدیل مذہب پر کوئی پابندی عاید نہ ہو سکے گی۔

ان شرائط کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ریاست میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو اور نظام صرف ایک دستوری فرمانروا کی حیثیت سے رہیں۔ نظام کے لئے دستوری فرمانروا سے بڑھ کر کسی پوزیشن کا مطالبہ پر مسلمانوں کو اصرار نہ کرنا چاہیئے ورنہ وہ سمجھ لیں کہ یہ چیز ایک خاندان کے مفاد پر ایک پوری قوم کے مفاد کو قربان کرنے کے ہم معنی ہوگی جس کا خمیازہ آگے چلکر مسلمانوں کو بہت برا دیکھنا ہوگا۔

۴۔ مذکورۂ بالا شرائط کے مطابق مسلمانوں کو اپنا جو قومی (organisation) قائم کرنے کا حق حاصل ہو اس سے انہیں پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ زکوٰۃ اور اوقاف کی آمدنی اتنی کافی ہوگی کہ اس سے ایک عظیم الشان بیت المال قائم ہو سکے گا۔ مسلمانوں کی تعلیم اخلاقی اصلاح۔ معاشی خوشحالی اور صنعتی ترقی کے لئے بہت سے کام کئے جا سکیں گے۔ ان کو سودی قرض سے نجات دلائی جا سکے گی۔ اور ایسے ادارے قائم کئے جا سکیں گے۔ جو دعوت دینی کے لئے مسلمانوں مسلمان نوجوانوں کو تیار کریں۔ ملکی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ اور تفاسیر شائع کریں اور اسلامی لٹریچر کی وسیع پیمانے پر اشاعت کریں۔ ان ذرائع سے یہ ممکن ہوگا کہ ہم تدریج مسلمانوں کی طاقت حیدر آباد میں بڑھا سکیں اور اپنی سوسائٹی کو زیادہ سے

زیادہ صالح بناکر غیر مسلم عناصر کو اپنے اندر جذب کر سکیں۔

۵۔ ان تحفظات کے ساتھ جو ذمہ دار حکومت قائم ہو اس میں مسلمان اپنا اثر اس طرح بڑھا سکتے ہیں کہ ان کی سیاسی پارٹی یعنی انجمن اتحاد المسلمین کوئی ایسا پروگرام پیش کرے جسے لیکر وہ صرف مسلمانوں ہی کے سامنے نہ جائے بلکہ غیر مسلم ووٹروں کے سامنے بھی جاسکے۔ اور ان کی زیادہ سے زیادہ رائیں حاصل کر سکے۔ مثال کے طور پر اس کے پروگرام میں (DEPRESSED CLASSES) کے لئے کوئی ایسی کشش ہونی چاہئے کہ اپنے ووٹ اونچی ذات کے ہندوؤں کی کوئی سیاسی پارٹی نہ حاصل کر سکے بلکہ وہ مسلم پارٹی کو حاصل ہو۔ آج اگر آپ سیاسی جوڑ توڑ کر کے پست اقوام کو ہندوؤں سے توڑنے کی کوشش کریں گے تو آپ کچھ فائدہ نہ حاصل کر سکیں گے اور یہ چیز ہندوؤں میں آپ کے خلاف اور زیادہ ضد پیدا کر دے گی۔ لیکن کل نئے دستور کے مطابق اگر انتخابات میں آپ ایسا پروگرام لائے جو پست اقوام کی اکثریت کو آپ کے ساتھ ہم آواز بنا دے تو آپ اسمبلی میں اکثریت حاصل کر سکیں گے، اور رہنمائی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ بہرحال اس نقشہ پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ مسلمان نئے حالات کے مطابق اپنے اندر سے ایک بہتر اور زیادہ بیدار مغز سیاسی لیڈرشپ پیدا کریں۔ جو تنگ نظری کے ساتھ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی حفاظت پر مصر نہ ہو بلکہ بڑے پیمانہ پر عدل و انصاف کے مقام سے اور عامۃ الناس کی حقیقی ترقی و فلاح کے کاموں سے مسلمانوں کے اصلی مفاد کی خدمت کر سکے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

بقلم محمد یونس

نواب چھتاری کے نام قاسم رضوی کا مکتوب مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء (ضمیمہ ۳)

Darus Salam,
Hyderabad.
28-8-1947.

My dear Nawab Saheb,

I am writing this in continuation of my conversation yesterday. I am glad the misunderstanding is now removed. So long as the basis of negotiations and future relations with the new Government of India remains a treaty and not accession in any form I am sure that the Muslim Community of Hyderabad will give Your Excellency and Sir Walter Moncton, the Constitutional advise and the Negotiating Committee which I expect will be formed including people commanding public confidence, every moral support and the Majlis Ittihad-ul-Muslimin shall duly give public expression to thie feelings.

I have convened a meeting of the Majlis Amela this evening and will place the matter before them and shall communicate their resolution in this regard to you and release it to the Press.

I remain.

Yours sincerely
Sd/- Q.Rizvi
President
Ittihadul Muslimin

Nawab Ahmad Said Khan of Chhatari,
H.E. The Prime Minister,
Hyderabad.

protection to the Agent-General in the event of extradiction or legal proceedings being launched against him. He said that although he had no doubt that the Pakistan Government would give the Agent-General their full support (should the circumstances make this necessary), a definite indication of the attitude of the Pakistan Government would be a source of great relief and would allay any anxiety that may be felt. The Hon'ble Sir Mohammad Zafarullah Khan said that so far as he could see, there was no question of an extradition and felt sure that the Government would do their best to help the Agent-General if court proceedings were instituted against him. The Hon'ble Mr. Ghulam Mohammad expressed his agreement with this view. Both the Hon'ble ministers said that no anxiety need be entertained on this account and stated that if the attitude of the Pakistan Government was to be placed on record they would raise the matter with the Hon'ble Prime Minister. Nawab Moin Nawaz Jung said that he would appreciate if this could be done.

It was also agreed that the Agent-General should continue to function in the normal manner as long as the Hyderabad case was sub-judice in the U.N.O.

(ضمیمہ ۳)

ایجنٹ جنرل کی پوزیشن کے بارے میں ایک سرکاری فیصلہ مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء

TOP SECRET.

Minutes of a meeting held on Saturday the 12th February, 1949.

A meeting was held on Saturday the 12th February at Sir Zafarullah Khan's house to discuss some important points relating to Hyderabad affairs. The following were present :-

The Hon'ble Sir Mohammad Zafarullah Khan.
The Hon'ble Mr. Ghulam Mohammad.
Nawab Moin Nawaz Jung.
Mr. Mushtaq Ahmed Khan, Agent-General for Hyderabad.

The points raised in the agenda circulated by the Agent-General were discussed seriatim.

(1) Position of the Agent-General: It was agreed that the Agent-General should continue to maintain his present attitude vis-a-vis the new regime in Hyderabad. This being so, the question of rendering accounts to any representative of the regime did not arise. Nawab Moin Nawaz Jung enquired as to what extent the Pakistan Government could afford

contrary to Government's own advice in the matter (repeatedly expressed to me by Hon'ble Mr. Ghulam Mohammad and other Ministers) all that I can say is that it is grossly unfair to me. Apart from this unfairness to a person, who is still the legal representative of the State and who deposited this amount with the Government in good faith, for the advancement of a cause, which he is pledged to uphold, I consider there is no justification for the Government to agree to any such proposal without my consent. To pass on these funds now to an extraneous body is therefore neither fair to me nor to the cause for which I saved the money from the Indian hands. I would mention further that the disclosure of these funds will definitely embarrass us, and also the Government of Pakistan at a later stage. This will be taken as an admission and no doubt the Government of India will lay claim to it in due course. In that event these funds will not be different in any way from the London funds, which the Government of Pakistan consider are in dispute and can not be used.

(2) The Hyderabad Government's instructions

(ضمیمہ ۵)

محمد اکرام اللہ سیکرٹری وزارتِ خارجہ کے نام خط مورخہ ۱۹ر جولائی ۵۰ء

(APPENDIX A)

19-7-50

My dear Ikramullah,

Regarding the proposal for formation of a Trust with the Hyderabad funds in Pakistan, which I understood from you was under consideration, I would like to say that as personally mentioned I am wholly opposed to the contemplated step. I write to confirm this. My reasons for disagreement with the proposal are :-

(1) The Hyderabad Funds have been kept as a closely guarded secret. This, you will remember, was the Government advice to me and I was asked not to admit under any circumstances that there are any funds in Pakistan. This advice was influenced by the consideration that the discussion might cause embarrassment at a later stage. In order to keep this secret, I faced abuse and columny from my countrymen and was subjected, as you are aware, to a flood of propaganda of a most virulent type. I, however, faced it without a demur. If after two years the disclosure of the existence of Hyderabad funds is to be made over my head and

forfeit sympathy and support in the quarters from which they have been receiving it. I want Hyderabadis to create a place for themselves as good and loyal Pakistanis and not on 'Hyderabadism'. I believe that in this alone lies their future welfare. The formation of the Trust, therefore, will permanently damage their interest and as their representative I feel it my duty to sound a note of warning about this.

I have off and on put forward these reasons and urged on Mr. liak Ali not to pursue this course, but he appears to have made up his mind. Under the circumstances, I am writing to you to bring my views to the notice of the Government, which is the custodian of the funds. If inspite of all this the Government allow the proposal to take effect I would like it to be clearly understood that I shall not accept any legal or moral responsibility for the results of a step with which I am in profound disagreement and which I fear will spell the doom of the Hyderabadis.

With kind regards,

Yours sincerely,

Sd/-

to me were to keep these funds under my control. I did not do so for the reason that in my view custody of these funds should rest with the Protecting Government i.e. the Govt. of Pakistan. Another reason for my doing so was to ensure that the matter is kept above Board and no single Hyderabadi or Hyderabadis should have an uncontrolled right of spending it. The contemplated step will remove the Govt: control and leave the entire funds in the hands of two or three people. There will be rivalry between the influential Hyderabadis for a share in the control of the Trust funds resulting in the break of a united fund and create serious rivalries and promote jealousies.

(3) Every Hyderabadi will demand a share in the Trust money just because it is declared as Hyderabad money. Whether the case is deserving or not will not have any importance. The result will be that anybody having a foul tongue or a facile pen w'll get away with it whereas the deserving cases will not derive any benefit.

(4) The function of a Trust formed formally for the sole benefit of Hyderabadis will confirm the general impression that Hyderabadis are parochially minded and will not be to their interest in the long run. They will, I believe,

and possibly compensation to Agency staff. I enquired whether any thing was to be paid in future out of the funds so retained for purposes other than those indicated by him. He answered in the negative as all future payments were to be made out of the funds placed at the disposal of the Trust. The following day Mr. Ikramullah asked me for an indication of Agency requirements and on the basis of the information given, the amount to be retained in Government custody was decided on. On this occasion Mr. Ikramullah also confirmed that no further sums were to be paid out. A month ago, the Sanctioning Committee authorised payments of some Sterling and Indian rupees in connection with the Court Cases. On receipt of this sanction, I saw Mr. Ikramullah and asked for clarification of the understanding. He said that it was also his recollection that nothing further was to be paid out and advised me to see Mr. Abdul Qadir about it. I did so - Mr. Abdul Qadir said that he could not say anything off hand, but added that there would be no difficulty in effecting an adjustment if the payment was not made in accordance with Government instructions. The payment was accordingly made. I then wrote to Mr. Ikramullah and requested him to kindly clarify the Government instructions for my future guidance. I have not yet received any claification in that regard. I shall be much obliged if you will kindly

خط بنام ملک غلام محمد مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۵۱ء (ضمیمہ ۶)

(APPENDIX I) SECRET

1, Begum Road,
Lahore.

D/ 21.2.1951.

My dear Ghulam Mohd. Sahib,

I trust that you have received, as desired, a copy of my last communication to you about Hyderabad pensions. As explained in that note the figure given is merely an estimate. I have, as per Mir Laik Ali's request, been sending particulars of pensions which are registered with me. I have not got copies of all the statements sent but I have asked my Secretary, Mr. Abdul Qayyum Khan, to prepare them afresh and send them on to you. I trust that you have received them. I came away to Lahore on medical advice and hope to be away for a few days.

As regards the other matter, which you mentioned to me on Monday evening, I think to enable correct appreciation it would be desirable to place all the facts relating to the procedure for future payments before you for your information. A day before the Trust was registered, Mr. Mohd. Ali sent for me and told me that the Government had agreed to the formation of the Trust, but would retain sufficient funds to cover the Agency establishment expenses and to meet other commitments entered into in my capacity as Agent General

چوہدری سر ظفراللہ خان کے نام خط مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۲ء ضمیمہ (ج)

(APPENDIX C)

Karachi
28-1-52.

My dear Sir Zafarullah,

I have been representing for simetime for the transfer of Hyderabad Funds to me. Nothing was so far been decided on my representations. I am therefore making a formal request through you for the transfer of these funds to me. I attach a note giving a brief history of these funds, which were held in my name and were voluntarily of my own free will entrusted to the Government of Pakistan for safe custody after the fall of Hyderabad. I have been drawing my requirements for the maintenance of the Agency and meeting my other commitments out of these funds. I had assumed that being the custodian of these funds, I would have a right to be consulted in regard to any disbursement made out of these funds, and also that disbursements, if any, would be authorised at my request. I also assumed that in regard to Agency requirements I would be the best judge of them.

The events of the last 2 years or more obtain this clarification for me. If it is the intention that payments for purposes other than those for which a portion of the funds were retained with the Government are to be made in future, I would request that a substantial sum be earmarked and placed at my disposal to meet establishment expenses of the Agency and other commitments incidental thereto. I would also add that the Government is committed to the payment of reasonable compensation to me and the Agency staff. Unless a substantial amount is so earmarked it would introduce an element of grave uncertainty in the affairs of the Agency which I submit will not be fair to us. I have always loyally carried out the policy of the Government both in letter and spirit and have throughout acted in strict accordance of instructions received from them. I am confident that you also know me well enough to trust me with funds, I have had my accounts voluntarily audited in the past - the last time a few months ago - and would be prepared, even without being asked, to followthe same course in future.

چوہدری محمد علی صاحب کے نام خط مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۵۳ء (ضمیمہ ۸)

My dear Mohammad Ali Sahib, 26-8-52.

I addressed you a letter recently requesting transfer of funds to me. I have not so far received any reply from you. I however received a telephone message from Mr. Zahid Hussain yesterday in that connection. He asked me to have my Accounts audited by Mr. Ghulam Abbas and file the audit certificate from him with the Bank. I am quite unable to understand this and I must confess that it has deeply hurt me. The position as I understand is that the funds in question were deposited by me with the Government in trust of my own free will and (I was not asked by the Govt: to do so and actually this step was taken by me contrary to the instructions of the lawful Govt. of Hyderabad) for the promotion of the Hyderabad cause, which I am under a pledge of loyalty to uphold. I am only asking for funds out of this amount to do my duty as usualand am not asking for a grant from the Government funds for private purposes. I have been having my accounts audited off and on of my own free will to satisfy my own conscience. If this is now to be imposed on me, I am afraid it will not be possible for me to accept the position. I say this in all humility. In any case, there can be no question of my being required to file audit certificates with the Bank, which after all is only a custodian of the funds have somewhat upset these assumptions. The formation of the Hyderabad Trust out of these funds against my advice and in the face of protests from me is a case in point. Since the formation of the Trust further disbursements have been made out of these funds without consulting me and may be so made in future. This is inspite of the clear understanding that no further payments would be made out of the funds earmarked for the Agency. Against this the claims of my staff and myself for payment of our dues, which have been repeatedly urged for the last 4 years have not received consideration. In view of these considerations, I request that the balance of the funds held in Trust by the Government be kindly transferred to me.

If I could have a few moments at your convenience, I would like to show you some papers in support of my request.

Yours sincerely,

The Hon'ble Sir Mohammad Zafarullah Khan,
Minister of Foreign Affairs & C'wealth Relations.

understanding. For the rest I look to the future with a clear conscience and with implicit faith in the عالم الغیب God Almighty, who knows the innermost recesses of man's mind and his motives and pray to Him that He may give me strength and courage to discharge my responsibilities with honour and self-respect as long as it isHis will that it should be so.

With deep respects and personal regards,

entrusted by me. If after the lapse of 4½ years the State Bank feels that the procedure now indicated is necessary, it strengthen my claim which I have been putting forward in my letters to you for transfer of the entire amount to me. The money in trust may be returned to me in discharge of the trust. What I am now required to do shows distrust of my motives and suspician of my integrity. If this also represents the Government's view of my character and integrity, all that I can say is that it is most unfortunate. I value my self-respect more than anything else and even in my present fallen state and in my days of adversity I am prepared to stake all in vindication of my honour and self-respect. I have been performing my duties and discharging my responsibilities as best as I could under extremely difficult conditions and in doing so, I donot think it fair that I should be subjected to strain and stress of this kind and my job is made more difficult than ever. On the 31st of this month, my staff and I will be without our salaries for two months. I shall be grateful if arrangements can be made to pay them. Furthermore, at the time of the fall of Hyderabad I was given solemn undertaking that I and my staff will be paid our legitimate dues. I do not know whether it is proper for me to press for paument of our dues at a time when my motives appear to be suspect, but if consideration can be given to this claim, it will be fulfilment of a long-standing

4.5.49

برادر عزیز۔

السلام علیکم

اللہ آپ سب کو بخیریت اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

نبی خان صاحب کا ایک خط ملفوف ہے۔ ان کو دے دیجئے۔

اور اسی خصوص میں آپ بھی کوشش کیجئے یعنی سمندر پار لیجانے

کی کوئی تکلیف نہ ہو اس کا خاص لحاظ اور نگہداشت کیجئے۔

اور نبی خان صاحب کی اس طرف خاص طور پر توجہ کیجئے۔

وہاں کے حالات اور عام حالات سے جہاں تک ممکن ہو مطلع

کرتے رہئے کیونکہ یہ بڑی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

عزیزم محمود علی کی کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے تو اچھا ہے۔

اللہ آپ سب کا حافظ و ناصر ہے اور مستقیم اور بلند عزم رکھے۔

آپ کا دعاگو

برادر عزیز

---

۲۹ ذوالقعدہ

برادر عزیز۔ السلام علیکم۔ اللہ آپ سب کو

اپنے حفظ و امان میں رکھے اور عزیزم کو کامل صحت و استقلال عطا فرمائے۔

ہم سب یہاں بخیر ہیں۔ اللہ سے انجام بخیر کی دعا ہے اور دعا کرتے ہیں۔

اپنی خیریت اور دوسروں کی اس سے مطلع کرتے رہنا۔ تمام احباب

کو سلام۔ عزیز اکبر صاحب کے لیے دعا خیر کرتا ہوں۔ عزیزہ احمد صاحب

سے بھی ملتے رہنا اور ان کی جو مدد ہو سکے کرتے رہنا تو باعث تشکر ہوگا۔

عزیزم اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ سب کو صحت و عافیت رکھے اور

آپ کی حق طلبی۔ ارادہ مستقل بنا رکھے اور فتح و نصرت عطا فرمائے۔ فی امان اللہ

دعاگو

بھائی

6.10.49

لائق علی سے مراسلت ۲۶ر جنوری ۱۹۵۲ء سے ۱۱ر فروری ۱۹۵۲ء تک

Hyderabad House,
9 Clifton,
Karachi.

4th February 1952.

My dear Liak Ali Sahib,

I am obliged to you for your letter dated the 26th January 1952. As desired I am having the formalities relating to Pensioner's claims completed and I am forwarding the data to Nawab Moin.Nawaz Jung.

I must frankly confess that your letter and the sentiments expressed therein were the first streak of light in an atmosphere clouded with distrust and suspicion, in which I have been trying to find my way during the last 2 years. The fateful day of the fall of Hyderabad is a distant cry but your letter of the 26th January 1952 took my mind back to 17th September 1948 and reminded me of the kind, almost touching word of appreciation, which you were good enough to send me in your last message.

"-------- Do not be disheartened. You did a good job. God will reward you in the other world ------"

Brother Azeez ji.

Just a line to say how much you are in my thoughts and how I pray Allah to give you strength and courage to serve all those in misery and to reward you both in this world & the next. I believe in

حسبنا الله نعم الوكيل نعم المولى و نعم النصير

May be some day soon when I can personally thank you and express my feelings for all the courage and character you have shown.

Allah is مع الصابرين

Love to Wali Khan and his boys.

Allah Hafiz wa Nasir.

3.1.50.

Affectionately.

Brother.

ضمیمہ ۱۰

Hyderabad

Imdadi Trust

26th January 1952.

My dear Mushtaq Ahmad Khan,

Please refer to your letter AG/60/8/52 dated 24th January 1952. I can assure you that the Trustees have their fullest appreciation of the work that is being done b- you in scrutinizing the applications and compilation of the claims of the Pensioners. There has not been the slightest notion on the part of any one to underrate your contribution and I am only sorry that you feel that way. Actually as you probably know, I wanted this matter to be dealt with mainly by your office and payments made by you - but since I am told you did not like doing so, I agreed to take on the responsibility over to the Trust.

It is perhaps section C of the resolution, which has caused misunderstanding. The procedure followed in the Trust is that for any payments to be made, two at last of the trustees have to attest and authorise it and that responsibility has been put on Mr. Ikramullah and Moin Nawaz Jung. This is fairly a normal procedure and is no way intended to be any reflection on the nature of your scrutiny or the least disregard to your position.

Let me tell you very plainly that not only in this but in every respect you are regarded and looked upon as a colleague and I honestly fail to see why you should view things differently. False concepts, if any, should have disappeared on the day of the fall of Hyderabad - much less there is any justification after all these years of adversity.

If you could have the pensions claims scrutinised and formalities completed and send them on Moin Nawaz Jung, it would be matter of great help and I can assure you it would be greatly appreciated. I also sincerely hope that after all this lapse of time you will not allow any petty considerations to disturb your mind.

With kind regards,

Yours Sincerely,

M. Liak Ali.

میں نے جنوری ۱۹۵۲ء میں شکایت کی تھی کہ حیدرآباد کی پنشنوں کے ضمن میں ٹرسٹیوں کی بعض تحریرات سے ایسا معلوم ہوتاہے کہ انہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ اسکے جواب میں میر لائق علی نے مجھے مندرجہ ذیل جواب بھیجا۔ ضمیمہ (۱۰)

notions about my self before or after the fall of Hyderabad. I look up and have always looked upon my assignment as a call of duty, which I am trying to perform under difficult conditions to the best of my lights. It is the will of God, which He in His wisdom has pleased on this humble servant.

I would be presumptuous for me to claim infallibility for my views, opinions or even the method of approach, but I think I am entitled to claim good intentions and sincerity. Honest difference of opinions therefore should not be interpreted as entertaining "false concepts". My attitude to life is too humble for that and I fear my maker too much to ever lose my balance of mind. In carrying out the Divine will and in the performance of my duty, I have not looked for any reward as the performance of one's duty is the best reward and the real reward, as you yourself rightly put it, must come in the other world.

3. It is indeed comforting to hear that I am still looked upon as a colleague. The history of the last 2 years had almost made me feel something diffident on that point. Let me remind you of a few incidents, which made me feel otherwise. I am reffering to them not by the way of complaint or fault finding or with any other base motive, but because without reffering to them, my feelings in the matter would not be fully understood :-

Again a few months after the fall in a letter sent to me you expressed yourself "

" برادر عزیز۔ خدا آپکو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور عزم کامل اور استقلال عطا فرمائے!

And yet again a month or two before you arrived in Pakistan :-

" Brother Azeez,

Just a lime to say how much you are in my thoughts and how I pray Allah to give you strength and courage and to reward you both in this world and the other. I believe in " حسبی اللہ نعم الوکیل نعم المولے ونعم النصیر " May be some day, somewhere I can personally thank you and express my feelings for all the courage and character you have shown. Allah is مسبب الاسباب "

2. Need I say that I have always treasured these unsolicited spontaneous expressions of appreciation and the later dust of Controversy has not dimmed my recollection of them. My reference to them is not with my vainglorious effort at self praise or self importance. That would be futile as I am conscious of my limitations too well for that. I refer to them as they tend to confirm that as late as the time of your arrival in Pakistan i.e. 18 months after the fall of Hyderabad. I did not at least in your eyes suffer from any "false concepts". I did not entertain any exaggerated

dropped from discussions and later from the Trust altogether. This was hardly fair to a colleague. I would here like to make it clear that my reference to it does not in the least mean that I was ever anxious or am anxious now to be on the Trust.

3. Later after the formation of the Trust on my offer of co-operation you asked me to carry on with the disbursements of financial aid to Hyderabadis as I had been doing in the past. This was recorded but two days later I was informed that the Trustees had decided to do it themselves. No word of apology or explanation came for this change. My offer of co-operation was merely by way of assistance coming from a colleague. I had no ulterior motive in doing so.
I do not consider it to say the least a very gracious way of dealing with a colleague.

4. I had throughout been associated with the Hyderabad Court cases before your arrival in Pakistan. Thereafter I was completely ignored, although in this matter there was not even the justification of a possible difference of opinion.

5. The same thing has happened in the pensions case. I had been pursuing it since September 1949. When the time of its fruition came and proposals were formulated and passed, I was not even shown

1. In July 1950, in a meeting at your residence you told me that you would challenge my position with the Government of Pakistan and also chided me with having wasted my time. This was indeed a most unkind cut. As I have stated above, I do not look for any worldly reward, but the charge of having wasted my time came as a rude shock as it somewhat ill-fitted with your own spontaneous expressions of appreciation to which I have refered in the last paragraph.

As for challenge to my position, it grieved me not for any personal reasons, but because the challenge came from one who administered to me the oath of loyalty to the cause and who in his last messages instructed me in the most moring terms "to keep the flag flying" and in his subsequent messages and letters prayed that God may grant me firm resolve and courage to do the right thing i.e. stand by the cause. I was never so hurt in life as I was on that day. It has left a deep wound, which time alone will heal. After I left you on that fateful day I had a good deal of heart-searching and resolved to stand by my oath with a stronger will and a resolute heart as long as it is His will ever remain my regret that in doing so, I have not received the support due to a colleague.

2. I was associated with the preliminary discussions about the formation of the Trust. Then I was

Firdous
Sind Guest House,
Karachi.

11th February 1952.

My dear Mushtaq Ahmad,

With a good deal of emotion, I have read your letter of the 4th February 1952. Need I tell you that everything which you have quoted in your letter from my past writings was very truly representative of my feelings.

On the other points which you have referred in the letter, it would not serve any practical purpose to comment upon. I am conscious of the fact that I have many shortcomings and may God forgive me for all sins of omission and commission. All that I may claim is that I try to the cost of my ability, to act without prejudice or malice.

As far as you are concerned, please be rest assured that I carry no ill-feeling whatsoever.

I do not on my part consider the cause quite lost yet. There may yet be light before our eyes. I believe "   ".

In the meantime if by a joint effort some relief is brought to those who are relatively

the courtesy of consultation at any stage- almost conveying the impression that I was not even remotely connected with it. That does not appear to be the right way to treat a colleague.

Such incidents could be multiplied, but it is neither my intention nor is it proper to do so. I am not referring to them, as I have said above, by way of complaint or with the object of scoring point or with any base motive, but merely to make my feelings properly and fully understood and also to show that it is not just "petty considerations, which are disturbing my mind". These are considerations, which any man with any grain of self-respect and honour can not afford to ignore without being untrue to himself. Let me say quite frankly that I am not a paragon of viture, nor do I say that I am always right in my opinion or approach. It would be the height of impudence if I claim any such thing, but it is not unreasonable to expect that I should not be looked upon as the sole villain of the piece in the whole tragic drama.

However despite all that has happened, I am truly grateful for your assurances that I am looked upon as a colleague and on my part let me assure you of my co-operation at all time.

With kind regards,

Yours sincerely,

Mushtaq Ahmad Khan

لائق علی کے نام خط مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء ضمیمہ (۱۱)

18th November 1953

My dear Liak Ali Sahib,

I am obliged to you for your letter. I am surprised to hear that you do not know about my departure from the scene of my activities. In doing so, as you must be doubtless aware, I am only carrying out instructions. I have carried out the responsibilities for five long years as best as I could. Thank God that although I am leaving with a heavy heart, my conscience is satisfied. It is a pity that in the discharge of my functions, I did not get the support of my colleagues.

Allow me to remind you that yourself threatened to challenge my position with the Government of Pakistan as far back as 1950. I am villain of the piece, inspite of the fact that I saved Hyderabad money and kept the flag of independent Hyderabad flying for five long years. I had hoped that as the time of my departure at least my colleagues will give me a pat on the back, but I have only received a parting kick in the shape of Nawab Moin Nawaz Jung's statement in which he has sought to place the responsibility on me. If this twist is given to a sad episode, I consider that this will be the grossest injustice to a colleague.

Yours sincerely,

Mushtaq Ahmad Khan.

in greater misery, I think the blessings of the Almighty will be with us.

Yours sincerely,

M. Liak Ali.

represents, also aims at conveying the impression that I voluntarily surrendered. The political assignment and by so doing have almost joined the company of those who played the traitor. I think you will agree that this is most unfair and cruel. No one knows better than you the circumstances in which I left Karachi. I do not deserve the blame which interested parties are now seeking to heap on me. I look to you for protection from this wholly undeserved columny. It is only fair that the Government should clarify the position. The intrested parties are taking advantage of my being in Government service to levy these cruel charges against me. They know that I cannot say anything in my defence. If this type of propaganda continues you will no doubt agree that I would be justified in seeking Government permission to state my side of the case. I should be grateful for your advice and support.

With kind regards,

Yours Sincerely

MUSHTAQ AHMED

To

Choudhri

Sir Muhammad Zafarullah Khan

Karachi

چوہدری ظفراللہ خان وزیر خارجہ کے نام احتجاجی خط مورخہ ۱ مئی ۱۹۵۴ء ضمیمہ

1, Mozang Road
Lahore.

1.5.54

My Dear Choudhry Sahib,

I am sorry that I missed you when you came for the Commonwealth Conference. I was away on tour.

I am sorry to bother you about my affairs, but as I have no one else to look for sympathy and support, I am taking the liberty of approaching you in that connection. I enclose herewith a cutting from a Karachi Newspaper, which speaks for itself. When I was asked to leave the understanding given to me that my office would stop functioning. It now appears that the office would continue to function. That seems hardly fair to me. I have ofcourse no wish to impose myself, if they have no confidence in me., But I fail to understand how another person could be brought in to function in a capacity which was personal to me and no one else could produce the necessary ceredentials for the purpose. I am bringing to your notice as I feel most aggreived about whole affair. Either the Agency was for political and other reasons or not. If it was, then there is little justification for pushing me out and installing another person in my place.

The type of Press propaganda, which the cutting

and reduce other staff. Make this arrangement under your own authority for which I authorise you. My mention should not be made as it will make my position very precarious, which you understand. Early arrangement must be made as work will start early next month. I have full confidence in you as my loyal subject and belonging to a loyal family.

I appreciated the stand you have taken about my state and hope you will continue your efforts. Whether the Asafia dynesty will live or become extinct will depend the result of your efforts. The services of my dynesty to the mankind in general and muslim cause and culture will I hope not be forgotten in my days of adversity.

After you have taken action Ashfaq Ahmed will let me know thourhg a source of which he knows.

Mook

HYDERABAD DECCAN

22nd May 1952

26th Shaban 1371 H

خصوصی مشن کے بارے میں نظام کا خط مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۵۲ء ضمیمہ (۱۳)

TOP SECRET

Mushtaq Ahmed(Hyderabad Agent in Karachi)

I have sent some instructions to Ashfaq Ahmed who was Secretary Babe-Hakumet, through a loyal friend. These will be explained to you by Ashfaq Ahmed which are secret. The nature of the duties that I want Ashfaq Ahmed to perform, are most important, and my, and their successful completion. The selection of Ashfaq Ahmed has been made, as he is my trustworthy and loyal subject, and I have full confidence in him. This whole affair must be kept a closely guarded secret and nobody must know about it.

As Ashfaq Ahmed will be required to make frequent trips to Europe, it is my wish, that he should be adequately paid, as there will be some risk attached also. He must therefore be attached to my Agency in Karachi in a position befitting the responsible and high position of trust he has held, and should receive the same emoluments that he was receiving here. Besides he should get house allowance and conveyance facilities; in other words just like an officer on deputation. His expenses whenever he has to go to Europe should also be met. This arrangement should continue atleast till the work is completed. This is essential and must be done, as it is vital, even if you have to curtail

ضمیمہ ۱۵

I appreciate the meritorious and loyal services rendered by Mr. Mushtaq Ahmed and other members of his family to my state. I particularly appreciate the stand taken up by him and the valuable services rendered in connection therewith to the cause of Hyderabad in his capacity as my Agent General in Pakistan. He has stood by me when others all round him had forsaken me. It is my desire that he should continue his efforts in all possible ways. In order to assisst him in the discharge of his mission, I authorise him to take over all Hyderabad assets, in whatever form or shape, under his personal control and utilise them to the best advantage at his sole discretion. I have full and implicit confidence in his sense of loyality, integrity and judgement and am confident that he will prove himself worthy of the trust reposed in him.

Moak

Hyderabad Deccan
23rd January 1953

ضمیمہ ح

اعلیٰ حضرت حضور نظام کا افتخار نامہ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۵۳

حضور نظام کا پیغام مورخہ ۴ راگست ۱۹۵۲ء ضمیمہ (۱۴)

<u>Strictly Confidential</u>

Mushtaq Ahmed (Hyderabad Agent in Karachi)

Ashfaq Ahmad will give you a gist of his talks with my agent, and how are things here. I have been very anxious since I heard of the view that is being taken about the Agency of Hyderabad in Karachi, which appears most in consistent with the stand taken so far. It will be difficult to justify this change. It will also mean the last nail in the coffin of what my dynasty and my state has stood for.

Ashfaq Ahmed's services will be required for a minimum of two years and the nature of the work entrusted to him makes it necessary that he should be my full time employee during this period, with which you will agree. He may be required for long periods in Europe, which he will explain. It is most important that arrangements for funds be made somehow. The position here makes it quite impossible at present to do something here. When it will be possible it will be done. You must therefore make arrangements in Karachi, even if means curtailing other Staff. If they finally decide to close your office then before it closes substantial staff must be placed at the disposal of Ashfaq Ahmed to enable him to carry on, for which you have my full authority.

I greatly appreciate all you are doing. With my Prime Minister and everybody turning against me for their own good, you and your family are the only ones to whom I can turn for help. The example of your loyalty will go down in the history of Hyderabad in big letters. To overcome the present problem, I, am prepared to send you such authority in writing as you may require, if the matter can be kept secret.

Hyderabad, Deccan
4th August 1952

rupees by the end of March or begining of April at the latest. He will give you details of the programme.

To meet these vital expenses, you have full authority from to dispose off any moveable or immoveable property that may be standing in the name of the Agency, or to devise such means as you may consider proper.

Mook

Hyderabad Deccan
25th January 1953

نظام کی جانب سے افتخار نامہ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۳ء ضمیمہ (۱۶)

Mushtaq Ahmed (Hyderabad Agent in Karachi)

I have had a report from Ashfaq Ahmed and have been very preturbed at the manner in which things have been taking shape. I have at your request sent you a letter of authority without any changes. I hope it will help you to fight for the retention of the Agency and also in other matters.

The work in hand at present is of vital importance to us all. It is with proceeds of these efforts, that I will be able to make a stand for the rights of the subjects of my state, from a far away land, I have very strong hopes of assistance from high international circles, if it can be made worth their while. You will therefore appreciate the importance of the whole affair. I am doing this for not myself, as I can not have long to live, but for the sons of the soil of my beloved state, for whom, I am prepared to sacrifice all I possess. The work must finish by the end of this year or early next year for the reason Ashfaq Ahmed will explain. We have to plan from now, for the final effort. Expenses will be quite heavy. I want you to arrange and place at the disposal of Ashfaq Ahmed between fifty and sixty thousand

ضمیمہ (۱۷)

نظام کا خط بنام اشفاق احمد سابق چیف سیکرٹری مورخہ ۱۶ ر جولائی ۵۲ء

Ashfaq Ahmed (Secretary Babe-Hakumet)

The bearer of this note will verbaly convey to you my full instructions, which must be complied to the letter.

You will appreciate the magnitude of the task involved, and absolute care and secrecy is therefore quite essential, as you will see. The future of my dynesty and my subjects and state fully depends on the successful completion of this very important matter.

I was pleased to learn of your immediate and unhesitating answer to my call, at a time when loyalty has completely disappeared, but I always had complete faith in your and the loyalty of your family to me and my state. It was very evident after the unfortunate happenings in Hyderabad, in the manner in which you served me, and the manner in which a member of your family is still serving me, though everybody has turned against me. I have already sent instructions, and want you to know that God willing you wil be suitably rewarded when everything is alright.

Hyderabad Deccan
16th July 1952

ضمیمہ (۱۸)

نظام کا خط بنام اشفاق احمد سابق چیف سیکرٹری مورخہ ۲۳ ر اپریل ۵۳ء

Ashfaq Ahmed (Secretary Babe-Hukumet)

I have read your repport and the enclosed note with much anxiety and concern. I am surprised and astonished at the attitude taken at Karachi. How can this change of policy be reconciled with the stand so far taken? What benefitdo they hope to get from closing the Agency- the only symbol left to represent the Asafia dynesty-from a muslim state? What my state and dynesty have done for the Muslim countries in the past is being so quickly and conveniently forgotten. It shows that Hyderabad has served their purpose. They have no justification in taking over funds belonging to Hyderabad from my accredited representative, which were only in trust with them. It is true that any one in adverse circumstances can not hope for any assistance from any side, but I had hoped Karachi would be an exception.

I deeply appreciate what you both have done, and need no assurance that you would continue to do soif circumstances permit.

The position with regard to the work in hand is very involved now. The opportunity was so good and the hopes held out were so encouraging. I have given instructions that the next shipment be postponed, as I do not wish anyone to handle it without your presence. My agents will get in

ضمیمہ ۱۹

وزیر خارجہ منظور قادر کا مکتوب مورخہ ۱۲/۱۷ دسمبر ۱۹۵۸ء

MINISTER FOR FOREIGN AFFAIRS
AND COMMONWEALTH RELATIONS
KARACHI.

No: D.6966-1(1)/58. 12th/17th December 1958.

My dear Mr.Mushtaq Ahmad,

I apologise for the delay in replying to your letter without date received by me on the 13th of November. I needed some information from the Ministry with regard to your case, which took some time and hence the delay.

I find that the Government of Pakistan still recognises you as the accredited representative of a foreign State. As such, your employment by the Government of Pakistan would be out of the question. If you happen to be in Karachi some time, please do let me know so that I may be able to explain to you certain matters which cannot be properly explained in a letter.

With kind regards and best wishes,

Yours sincerely,
Manzur Qadir
(Manzur Qadir)

Mushtaq Ahmad Khan, Esq.,
108-D Model Town,
LAHORE.

touch with you later to know when you can visit so that shipment can be sent to suit you. This will also depend on my being able to arrange for funds which in the present state of affairs seems very hopeless.

In the meantime he has asked for morefunds in connection with payment of fees and for other arrangements in which have to be carefully planned and much before time, so that there is no waiting at the right time. He needs 1350/-/- before 20th May. This is in addition to the amount you have already remitted to him. Please ask Mushtaq Ahmad to arrange for this amount at all costs. This shall be my last request for funds and I shall look to other resources for future, but it looks very hopeless. People like 'P' cannot understand my hopeless position as you can. I have noted your suggestion but that is not possible because I have given an undertaking you going against it may result in complicat ons and matter may become serious. 'H' will telephone you and I am sure I will not be disappointed. This will be further proof of your familys faithful and meritorious services to the cause of Hyderabad, and the Asafia Dynesty.

Moak

HYDERABAD DECCAN
23rd April 1953

sons of my status, it means that I should revert to my original status as the Agent General. You

will no doubt kindly appreciate that I must make a living and should not be penalised for the stand taken by me in the Hyderabad case and following the policy laid down by the Government of Pakistan. If the Government of Pakistan finally decide that I should not be employed by them, I would be prepared to revert to my status as Agent General after completion of the present term of my appointment provided of course the funds earmarked for it and the Hyderabad property in Pakistan is placed at my disposal for running the Agency.

In this connection I send herewith copy of a representation which I submitted to the President sometimes ago. I was in Karachi 10 days ago, but failed to get an appointment. I hope to pay another visit in a few days, I shall be grateful if I am given an opportunity to submit my case personally.

With kind regards,
Yours sincerely

(MUSHTAQ AHMED KHAN)

خط بنام وزیر خارجہ منظور قادر مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۸ء ضمیمہ (۲۰)

108-D Block
Model Town,
Lahore

26th December 1958.

My dear Manzoor Qadir Sahib,

I am very grateful to you for your kind letter D6966-1(1)/58 dated 17th December 1958 and the trouble you have so kindly taken in looking up my case. While I appreciate the assurance that the Government of Pakistan still recognise my status and position as the Agent General of Hyderabad, I find myself somewhat in a difficult position. In 1953, I was informed that the Agency was going to be closed and that my services in that connection would not be required. I had accordingly to find another job and the Government of Pakistan in the ministry of communications actually helped me in securing one. Soon after my departure, it was decided not only to retain the Agency, but also to appoint my Secretary as Incharge inspite of my informing the Ministry of Foreign Affairs that he should no longer be considered as being connected with the Agency. I have been employed by a Provincial Government with the concurrence of the Central Government for well over 5 years. If I am not eligible for appointment under the Central Government of Pakistan for rea-

ضمیمہ (۲۲)

اقوام متحدہ کی طرف سے حیدر آباد کیس کی وضاحت مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء

Dear Mr. Aziz,

I have been directed to acknowledge receipt of your letter dated 12 September 1979, addressed to the Under-Secretary-General for Special Political Affairs, in which you seek information on the Hyderabad question.

As you know, the case was discussed by the Security Council in Paris in 1948. After that debate the Council received further communications on this subject in October, November and December of that year, but the Council's discussion was not resumed until May 1949, when it heard statements on the question by the representatives of India and Pakistan. Since that date, no further develop-ents in the matter have taken place. However, the Hyderabad question is still a matter of which the Security Council remains seized.

I hope that this information will serve your purpose and I thank you for your interest in the

میرے نام قاسم رضوی کے خط کا عکس ضمیمہ ۲۱

عزیز منزل - ایلسن روڈ - کراچی

مشتاق بھیا - السلام علیکم - پہلے تار کا شکریہ

آپکو میں نے بذریعہ تار جو زحمت دی تھی اسکی خواہش ظاہر کی اسمیں میری خود غرضی اور بے غرضی دونوں مضمر تھیں - خود غرضی یوں کہ آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] - بے غرضی یوں کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] - [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] - [illegible] [illegible] [illegible] - بچوں کو دعا پیار - [illegible]

[illegible]

HOTEL PLAZA-ATHÉNÉE

PARIS

23-27, AVENUE MONTAIGNE

11th Dec 1948

My dear [illegible],

In continuation of my letter of yesterday would it be possible to obtain the [illegible] reaction with regard to a compromise on the same such basis as follows? —

Our agreement to withdraw the case from the Security Council and to hand over the funds in London (about £1,400,000) provided that the P.M. and other ministers [illegible] are released, all Muslim prisoners except those who may be charged with acts of violence are let off, and the restrictions on the disposal of properties

work of the United Nations.

Yours sincerely,

Sd/-

Director
Security Council and
Political Committee Div

اغلاط نامہ

ناظرین کرام مطالعہ کے دوران مندرجہ ذیل اغلاط درست فرمالیں جس کیلئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

صفحہ نمبر	سطر	غلط	درست
٣	٨	نقطہ "کی" زائد ہے	کی حذف کردیں۔
٤	٢	انگریزان	انگریزوں
٤	٧	عرض البلا	عرض البلد
		طول البلا	طول البلد
٤	١٣	اپنے آپ کی	اپنے آپ کو
٩	حاشیہ ع٢	حبیب اتھراوج	حبیب اللہ اوج
١٠	١	مدارس ہے	مدارس تھے۔
١٠	٢	مدارس کام	مدرس کام
١٢	٣	تلنگا	تلنگانہ
١٤	١٥	ٹیپون سلطان	ٹیپو سلطان
١٨	٣	اُن اور	اُن کے اور
١٩	٧	تین	تین برس
٢١	حاشیہ ع١		ہسٹاریکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی
٢٢	١٧	کے قبضے	کے قصبے
٢٣	١٣	پشتینی	قدیم
٢٣	١٩	ہوتی	بھی ہوتی
٢٣	١٥	شعر	حذف کردیا جائے۔
٢٩	حاشیہ ١٩	ین نواز جنگ	معین نواز جنگ
٣٠	٢٠	ڈھپلی	ڈپچلی
٣٠	٢٢	مشتری ہیپتال	مشنری ہسپتال
٣١	١٠	کی بربادی	کی بربادی میں
٣١	حاشیہ ع٢		یادداشت سابق چیف سیکرٹری خان بہادر اشفاق احمد جو اس وقت

are removed.

If you are aware of anything else which should be included in our demands that may be put in. It will, however, be of immense value to know your general reaction to the above tentative suggestion laying down our line of action for the future. It really means giving up the political fight against the State in return for the release of Pir & other high officials and otherwise minimising the persecution of the Muslims in the State.

With kind regards,

Yours sincerely,

[signature]

صفحہ نمبر	سطر	غلط	درست
٣٢	٨	ووستی	دوستی
٣٢	١٠	خود اسنے	خود اُنسے
٣٣	١٧	نظام متنبہ	نظام کو متنبہ
٤٠	١٣	مجوزہ کے بعد	اور حذف کیا جائے
٤٢	٤	اتحادالمسلمین کے آگے	پر مشتمل تھا بھیجا
٤٩٠	٦	خصوصیتوں کی	خصوصیتوں کو
٥٣	١٧	find کی بجائے	bind
٥٤	٧	one کی بجائے	out پڑھا جائے
٥٥	٨	اس کے بجائے	اُسے پڑھا جائے
٥٨	٣	حکومت سے کے آگے	اُنکے
٥٩	حاشیہ ١، ٢		Hyderabad Relations with Dominion of India
٦٠	نیچے کا حاشیہ	١ے، ٢ے، ٣ے	نیچے کی عبارت ملاحظہ کریں۔
٦٠			١ے سرکاری کاغذات بعنوان Transfer of Power
			٢ے Mission with Mountbatten
			٣ے چارلس سمتھ Fifty years with Mountbatten
٦٨ ع ١			Hayderabad's relations with Dominion of India Vol 1.
			Hayderabad's relations with Dominion of India Vol 1.
			The Integration of Indian States
٧١	١٣	صدر اعظم	صدر اعظم کو
〃	١٧	اخذ کرنے	اخذ کرنے کا
٧٧	١٥	ڈاکٹر مظفر حسین قریشی	ڈاکٹر مظفر الدین قریشی
٧٨	٨	صداقتنامے	صداقت نامے
٧٨	١٤	آئینوالی حکومت	حکومت حذف کر دیا جائے۔

صفحہ نمبر	سطر	غلط	درست
٨٠	١١	ناحاعد	ناساعد
٨١	٨	ہے کے بعد	یہ کا اضافہ
〃	١٣	کی حالتیں	حالت میں
٨٢	٤	نظام کی ایک	نظام کی پڑھا جائے
〃	٥ — ٨	الٹیم	الٹیمیٹم پڑھا جائے
〃	١٧	روررواد	روئداد
٨٥	١٧	کی	کے بجائے کے
٨٩	١٨	نمائندے کو کے آگے	So called Agent General
〃	١٧	علاقوں کے آگے	میں کا اضافہ کریں
٩١	حاشیہ ٣	مدیر ہیں	مدیر تھے
٩٢	١٢	پہنچاتا کے بجائے	پہنچاتا
٩٣	١١	جیسے ان نے	جیسے اُس نے
٩٣	٢٤	کرنے میں پڑے	کرنے میں بڑے
٩٥	٧	بیگم اور العیدروس	بیگم العیدروس
٩٧	١٨	ذاتی کے بجائے	سفارتی ذمہ داری
٩٨	١٩	گفتگوان	گفتگو اُن کے
١٠١	٦	سفارتی حکومت	سفارتی نمائندہ
١٠٧	٧	اہم جزو کے آگے	
			کے بجائے
		Overriding Legislation	COLLATERAL LETTER
١٠٩	١٢	سیاسی موقف کو	سیاسی موقف کی
	١٢	کر سکتا	طاقتور ٹرانسفیر حذف کر دیا جائے
١١١	٩	تعاون کی بجائے	تعارف پڑھا جائے
	١٤	متعادیں	متعادہیں
١١٥	١٠	ہوئے مہینے	ہوئے میںنے

صفحہ	سطر	غلط	درست
۱۱۸	۲۰	اڈے یا	اڈے پر
۱۲۰	۷	مہم چوسے	مہم جو سے
۱۲۴	۲	مفروضہ ہے	مفروضہ کہ
"	۱۶	خوشگوار ساتھ	خوشگوار کے ساتھ
۱۲۶	۳	پجو بھارتی	جو بھارتی
"	۵	تشہیری یما	تشہیری محاذ
۱۲۸	۸	تاثر نہیں	تاثر نہیں دیا
۱۳۴	۱۲ سرخی	بارگاہ مایونی میں پیشی	بارگاہ ہمایونی میں پیشی
۱۳۵	۲۰	صد افتخار ہے میں اپنے آپکی	صد افتخار ہے میں اپنے آپ کو
۱۳۵	۲۱	حنیف سا	خفیف سا
۱۳۷	۲۱	اس بات	اصل بات کہدوں مینے ٹالنے
۱۴۵	۱۱	قدموسی کا	قدمبوسی کا
"	۱۲	نبجے بنت	نبجے شبکو
۱۵۰	۱۸	دوران کی	دورانِ سفر کی
۱۵۶	۷	سرحدوں علاقوں	سرحدی علاقوں
	۲۰	وہ دھدی	دھندلی پڑگئی
۱۵۷	۱۴	الٹیم	کے بجائے الٹی میٹم
۱۶۱	۹	دہرایا رہا	دہرا رہا تھا
۱۶۹	۵	مطمن	کے بجائے مطمئن
۱۷۲	۱۷	چندوک	چند لمحات
۱۷۴	۲۳	جنہیں اپنے	انہیں اپنے
۱۷۶	۵	کا متمل	کا متحمل
۱۷۹	۹	جو بہی	کے بجائے جو بھی پڑھا جائے

صفحہ نمبر	سطر	غلط	درست
۱۸۴	۵	کرنے کے بعد	میں کا اضافہ کیا جائے
۱۸۸	۱	گفتگی کے	گفتگو کے
۱۹۰	آخری	دے سکتیں	دے سکیں
۱۹۶	۱۵	یاد لا	یاد دلایا
۱۹۸	آخری سطر	گجراتی چپل چیتل	گجراتی چیتل کا رخ
۲۰۱	۷	کو سرحدوی	کو سرحدی
	۷	معاہدے	معاہدے کے مطابق اسلحہ
۲۱۱	۱۲	اگر آخر کب تک	مگر آخر کب تک
۲۱۲	صفحہ کے	بالمقابل تصویر	ہتھیار ڈالنے کی رسوائی
۲۱۲	بالمقابل تصویر		جنرل چوہدری اپنے کورکمانڈر کے ساتھ
۲۱۳	۵	کر کے	کے بجائے کرلے
۲۱۴	۵	رہ گئے کے بعد	مرض الموت میں
۲۱۹	۱۴	سے عمر بھر	عمر بھر
۲۲۰	۵	سے	وجہ سے
	۱۸	قبضہ میں	قبضہ کرنے میں
۲۳۵	۱۳	کا سفر کی رپورٹ ہے	کا سفر کرکے رپورٹ دی ہے
۲۴۳	۸	طریقے مجھے	طریقے سے مجھے
۲۴۴	۹	کے بارے ایک	ضمناً ایک اعلامیے کے بارے میں
۲۴۶	۱	متوازی اداروں	متوازی اداروں کی
۲۴۹	آخری	اصحاب مقصدر	اصحاب مقتدر
۲۵۰	۴	آخر وقت	آخری وقت تک
۲۵۲	۷	میرے غیاب	میری غیر موجودگی
۲۵۳	۱۶	آزادی نشان	آزادی کا نشان
۲۶۸	۱۰	آنے سے	آنے سے پہلے
۲۷۴	۵	ناصر حسین	کے بجائے زاہد حسین

صفحہ نمبر	سطر	غلط	درست
۲۷۹	۳	اصلاح کی تھی	اصطلاح سنی تھی
۲۸۳	۲۰	یا گورنر منسٹرل ہی	یا گورنر جنرل ہی
۲۹۲	۷	جیسے بھی ہوا	جیسے بھی ہوا ہے

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

۱ لائق علی — Tragedy of Hyderabad

۲ بدر شکیب ۔ حیدر آباد کا عروج و زوال

۳ سر مرزا اسمٰعیل — My Public Life

۴ وی ۔ پی ۔ مینن — The Integration of Indian States

۵ علی یاور جنگ — Hyderabad in Retrospect

۶ کیمبل جانسن — Mission with Mountbatten

۷ ڈی ۔ ایف کراکا — Fabulous Moghul

۸ صدق جائسی — دربارِ دُربار

۹ واجد رضوی — حیاتِ مجاہدِ اعظم قاسم رضوی

۱۰ اشفاق احمد سابق چیف سکرٹری حیدر آباد — یادداشتیں

۱۱ لارڈ برکنہیڈ — Walter Monckton

۱۲ محمودہ بلگامی — The Razakar Movement in Hayderabad, Historical Research Institute , Punjab University

۱۳ نواب صدیق علی خان ۔ — بے تیغ کا سپاہی

۱۴ Freedom at Midnight- Larry Collins & Dominique Lapierre

۱۵ H.V. Hodson - The Great Divide

۱۶ Fifty Years With Mountbatten - Charles Smith

۱۷ Hyderabad Relations with Dominion of India, Vol: II

چودہری محمد علی Emergence of Pakistan

۱۸ کے۔ ایم۔ منشی The End of an Era

۱۹ غلام محمد۔ قائد ملت

۲۰ بہادر یار جنگ ۔ مکتوبات

۲۱ میجر جنرل چودہری Armoured Division in 'Operation Polo' خفیہ ڈائری کا پردہ

۲۲ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ مرقع آصفی

۲۳ سید ابوالاعلیٰ مودودی دکن کی سیاسی تاریخ

۲۴ سر محمد یامین خان نامۂ اعمال

۲۵ ہوش یار جنگ مشاہدات

۲۶ چودہری خلیق الزمان شاہراہ پاکستان

۲۷ نواب چھتاری یاد ایام جلد سوم

۲۸ Mountbatten - The Hero of our time - Richard Hough

۲۹ Hyderabad Pictorial, Volumes I & II

۳۰ The case of Hyderabad before the Security Council - Clyde Eagleton.

۳۱ مملکت آصفیہ حصہ اوّل و دوم

۳۲ The case of Hyderabad before the Security Council - Clyde Eagleton.

۳۳ Mountbatten - Hero of our time - Richard Hough

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی